خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماھنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
فروری 2023
قیمت 150 روپے
بانی
معراج رسول

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
یمنیٰ احمد
نائب مدیر
اطہر حسین

مارکیٹنگ منیجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269
محمد شہزاد خان
0333-2256789

جلد 52 • شمارہ 02 فروری 2023 • زر سالانہ 2000 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 150 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail: jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور 63-C فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
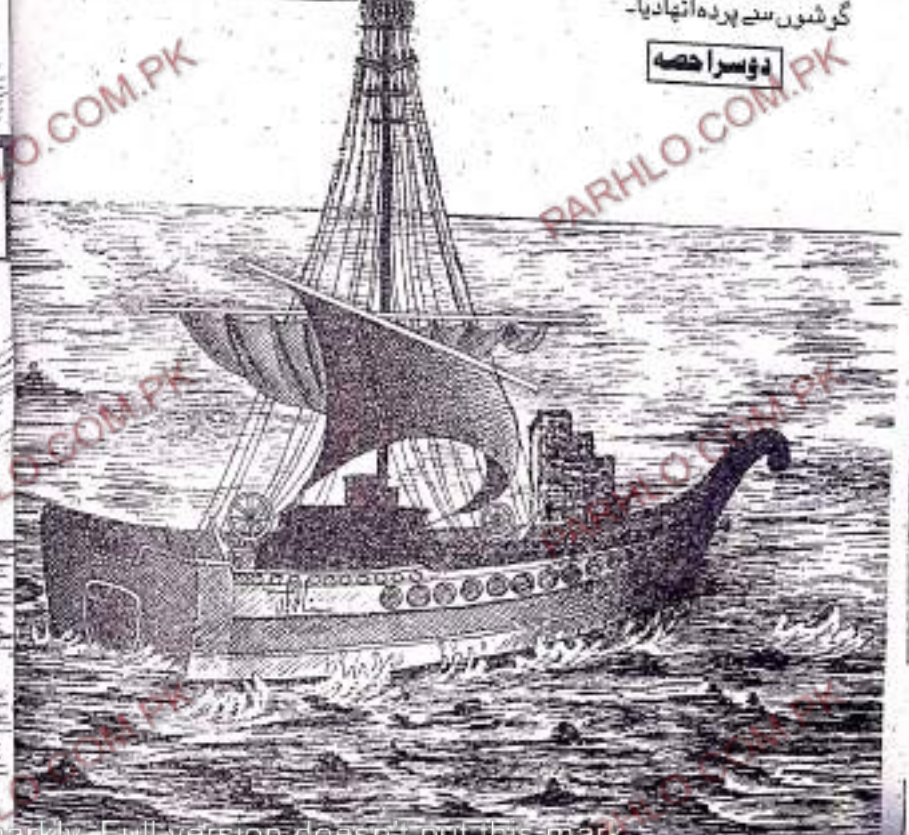
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

باغی

زویا صفوان

زمین پر زندگی گزرے یا پانی کی سطح پر... زندگی کے لیے جدوجہد تو کرنا ہی پڑتی ہے... اور جنگی حالات میں زندگی کی بقا ہی جہد مسلسل کی متقاضی ہوتی ہے... وہ بھی اسی کار مسلسل میں مصروف تھا کہ مخالف گروپ نے اس پر باغی کا ٹھپا چسپاں کردیا... مگر اس پر ظلم اور ظالموں سے نجات کا جنون سوار تھا پھر کیسے نہ حالات سے بغاوت کرتا... ماضی کے صفحات پر مختلف کرداروں کی معرکہ آرائی کا ایسا تسلسل جس نے کئی پوشیدہ گوشوں سے پردہ اٹھادیا۔

دوسرا حصہ

سلطان سلیمان کے محل میں خط و کتابت کا ایک انوکھا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ یہ باہمی سلسلہ بھی فریقین حتی الامکان ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھے ہوئے تھے۔
رستم کو صنعان پاشا کی طرف سے وہ خطوط موصول ہوئے تھے جو اسے جربہ کے چند معززین نے ارسال کیے تھے۔ ان خطوط میں جربہ میں صلیبی مجاہدین کی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر اور ان کے ممکنہ اثرات کا ذکر تھا۔
رستم نے اس واقعے کا ذکر کسی سے بھی نہ کیا۔ صنعان نے جب اس کی خاموشی محسوس کی تو چاروناچار سلطان کو براہ راست اپنا عریضہ لکھ بھیجا۔ اس کی تحریر میں واضح طور پر عیاں تھا کہ جربہ کا قلعہ مکمل ہو جانے کی صورت میں صلیبی جنگجوؤں کو طرابلس کا رخ کرنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔
سلطان کی پیشانی بے طرح شکن آلود ہو گئی۔ اس نے صنعان کے اس مراسلے کا رستم سے کوئی ذکر نہیں کیا اور درگوت کو واپس لانے کی حکمت عملی مرتب کرنے لگا۔ صنعان پاشا کو البتہ اس نے اپنا حوصلہ مجتمع رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے اسے جلد از جلد کمک بھیجنے کا وعدہ بھی کیا۔

☆☆☆

دوریا کی پریشانی میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ اپنی زندگی کے اس آخری پڑاؤ میں وہ کامیابیوں کے معاملے میں نہایت حریص ہو گیا تھا۔ اسے اپنے سبھی خوابوں کی تعبیر جلد از جلد درکار تھی۔
اب ستم ظریفی یہ بھی کہ کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے عجلت کا شکار دوریا، ڈیوک میڈینا کے تاخیری حربے خون کے گھونٹ کی طرح پینے پر مجبور تھا۔ ایک روز جھنجلاہٹ اور کوفت کے عالم میں وہ میڈینا سے دو بدو بات کرنے پر مجبور ہو گیا۔
"تمہیں کس چیز کی جلدی ہے آخر اندریا دوریا؟" میڈینا نے کہا۔
"تو تمہیں کیا بات ان تاخیری حربوں پر مجبور کر رہی ہے؟" دوریا نے اپنا غصہ ضبط کیا۔ "تم یہ بات کیوں نہیں سمجھ رہے ہو کہ جنوبی یورپ کے عیسائی اس وقت شدید مذہبی جوش و جنون میں مبتلا ہیں۔ اگر اس جنون کو اخراج کا موقع نہ ملا تو یہ جذبات سرد بھی پڑ سکتے ہیں۔"
"کیسے سرد پڑ سکتے ہیں بھئی؟ خوامخواہ وہم نہ پالو۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔
"وہم نہیں، حقائق سے آگاہ کر رہا ہوں۔ اس قلعے کی تعمیر اور جربہ کے مسلمانوں کی ذہنی یا مذہبی تسخیر اتنی اہم نہیں ہے۔ اس وقت طرابلس فتح کرنا زیادہ ضروری ہے۔ جنگی معاملات میں وقت کی قدر و قیمت کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایک لمحے کی تاخیر بھی نہایت مہلک ثابت ہوا کرتی ہے۔" دوریا جھنجلایا۔
"تم اپنے ذہنی افق کے مطابق ایسا سوچ رہے ہو۔ تمہارا اصل میدان بحر ہے۔ تمہیں انتظامی امور کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ میری کوششوں کا دائرہ کار تمہاری سوچ کی وسعت میں نہیں سما سکتا۔ جربہ کی تسخیر کو جسمانی طور پر مکمل ہونا ہی صرف کامیابی نہیں ہوتی۔ فتح کا اصل نشہ اور سرور تو اس وقت محسوس ہوتا ہے جب دشمن سے وہ نظریہ اور جذبہ ہی چھین لیا جائے جس کی بنیاد پر وہ جنگ و جدل پر آمادہ ہوا کرتا ہے۔ تم دیکھ لینا اندریا دوریا! وہ وقت دور نہیں ہے جب جربہ میں کوئی درگوت کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرے گا۔" میڈینا کے لہجے میں جذبات کی شدید آنچ تھی۔
دوریا بےبسی سے خاموش ہو گیا۔ وہ اپنا اصل مدعا سمجھا ہی نہیں پا رہا تھا۔ دوریا اس صورت حال پر شدید ناخوش تھا۔ برسوں سے دیکھے جانے والے خواب ایک خلش بنتے جا رہے تھے۔ ان خوابوں کی تکمیل اس وقت جن ہاتھوں میں تھی وہ اپنی ذہنی سطح کے مطابق فیصلے کرنے میں مگن تھے۔
بے حد سوچ بچار اور خلش سے مضطرب رہنے کے بعد دوریا نے اسپین میں فلپ کو آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے خط میں فلپ کو تمام تر صورت حال لکھ کر اس بات کی تجویز بھی دی کہ میڈینا کی یہ منصوبہ بندی سراسر وقت کا زیاں ہے۔ ایسی حکمت عملی طے کرنا حکومت کا کام ہوتا ہے۔ عسکری عہدیداران کو اپنے دائرہ کار سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔
خط کے اس متن نے فلپ کو سخت برافروختہ کر دیا۔ اسے بھی دوریا کی طرح اپنے خواب ملیامیٹ ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے میڈینا کی گوشمالی کے لیے ایک بھرپور خط لکھا اور اسے جنوبی یورپ کی کمان داری پر اپنی توجہ مرکوز رکھنے کی یاد دہانی کروائی۔
میڈینا، فلپ کے انداز و الفاظ پر کافی جز بز ہوا۔ وہ ان حکمرانوں کی ایسی عادتوں سے سخت عاجز تھا کہ وہ میدان جنگ کی نزاکتوں سے لاعلم ہونے کے باوجود اپنی رائے اور فیصلہ ٹھونسنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ تخت پر بیٹھے رہ کر حکم چلانے اور میدان جنگ میں اپنی جان جوکھم میں ڈالنا بالکل متضاد عمل اور دو انتہائی سمتیں تھیں۔ میڈینا کے لیے فلپ کے احکامات نظر انداز کرنا اس لیے بھی دشوار تھے کہ اب وہ فلپ کے بجائے اس کے چچا فرڈینینڈ کا ماتحت تھا۔

فرڈینینڈ کے علاوہ اب فلپ اسے یا پاپائے اعظم ہی کوئی حکم دے سکتا تھا۔ اس نے خط کا کوئی بھی جواب دینے کے بجائے جربہ میں بھیجے گئے اپنے خصوصی اہلکار کو طلب کر لیا جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے باہم میل جول کے معاملات پر نظر رکھنے کے لیے متعین تھا۔
اہلکار سخت مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ میڈینا کی چھٹی حس واضح عندیہ دینے لگی کہ اس کے پاس اچھی خبریں نہیں ہیں۔
"ہمارے عیسائی بھائیوں کو کس حد تک کامیابی ملی ہے؟ انہوں نے یقینی طور پر مسلمانوں کو ذہنی طور پر اپنا تابع کر لیا ہوگا۔" میڈینا نے اپنی کیفیات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔
"فی الحال تو وہ کسی اور ہی شے کے تابع ہو چکے ہیں۔" اہلکار نے تاسف سے جواب دیا۔
"کیا ہوا ہے انہیں؟ کھل کر مجھے بتاؤ۔" میڈینا نے سختی سے استفسار کیا۔
"ابھی اپنے عیسائی بھائیوں سے ہی مل کر آ رہا ہوں۔ آج کل انہیں مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر خربوزے کھانے اور افیون کے نشے میں جھومنے کے سوا کوئی اور کام نہیں ہے۔"
اہلکار کے اس انکشاف پر میڈینا غم و غصے سے ساکت ہو گیا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے دریافت کیا۔
"قلعے کی تعمیری صورت حال کیا ہے؟"
"وہاں بھی کام بالکل ٹھپ ہو چکا ہے۔ ویسے آپ چاہیں تو میرے ساتھ وہاں چل کر خود بھی معائنہ کر سکتے ہیں۔" اہلکار نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔
"میں ضرور وہاں جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے دیکھتے ہی ان سب کا نشہ ہرن ہو جائے گا۔" میڈینا نے دانت پیسے۔
"ایسا ہونا محال ہی دکھائی دیتا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی سے بس بھی نہ ہوں گے۔" اہلکار نے دبے لفظوں میں خدشہ ظاہر کیا۔
اہلکار کا یہ خدشہ بالکل درست ثابت ہوا۔ عیسائی آبادکاروں کو ان کی آمد سے رتی بھر بھی خوف یا کوئی تذبذب محسوس نہ ہوا تھا۔ اس صورت حال پر سخت طیش زدہ میڈینا نے اپنے مذہبی امور کے ماہرین کو قلعے میں طلب کر لیا۔ وہ سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔
"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ایسا تو کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔" وہ دھاڑ دینے کے قریب تھا۔
"ہمارے عیسائی بھائیوں سے ایسی توقع ہی نہ تھی۔ وہ تو بہت جوش و ولولے سے یہاں جمع ہوئے تھے۔" ایک ماہر نے اپنی پیشانی مسلی۔
"جی ہاں، بالکل ایسا ہی تھا۔ ہمارے عیسائی بھائی مسلمانوں کی مذہبی تسخیر کے لیے بہت پُرجوش تھے۔" دوسرے ماہر نے وثوق سے کہا۔
"تو پھر اس تبدیلی کی کیا وجہ ہے آخر؟" میڈینا جھنجلا گیا۔ "وہ سب اپنے فرائض ترک کیے افیون کے نشے میں کیوں غرق ہو چکے ہیں؟ انہیں خربوزوں اور افیون کی لت آخر لگی ہی کیوں؟"
اس نے ایک طائرانہ نگاہ ان سبھی ماہرین اور دیگر معتمدین پر ڈالی۔
"میں نے تو پہلے ہی متنبہ کیا تھا۔" دوریا کی عمر رسیدہ آواز ان سب کی سماعت میں پڑی۔ "میں نے کئی بار کہا تھا کہ یہ تاخیری حربے مذہبی جوش و ولولہ سرد کر دیں گے۔ جب اس وقت کسی نے میری ایک نہ سنی تو اب اس طرح واویلا کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ ہم اپنی غلطیوں کی ہی سزا بھگت رہے ہیں۔"
دوریا کے ان الفاظ نے میڈینا کے بدن کو بے طرح جھنجھوڑ دیا۔
"ہرگز نہیں، ایسا بالکل بھی نہیں ہوگا۔"
"ایسا ہی تو ہو رہا ہے پیارے ڈیوک میڈینا!" دوریا نے اطمینان سے طنز کیا۔ "تمہاری دور اندیشانہ حکمت عملیوں نے ان سب کو افیونی بنا دیا ہے۔ اب طرابلس کی تسخیر تو رہی ایک طرف، مجھے تو یہ لوگ جربہ سے بھی بے دخل ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔"
"ہمیں اپنی حکمت عملی فوری طور پر تبدیل کرنا ہوگی۔" میڈینا نے اس کا طنز بہ مشکل برداشت کرتے ہوئے وہاں موجود پادریوں کو مخاطب کیا۔
"ہم اس سلسلے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟" ایک پادری نے دریافت کیا۔
"تبلیغ کی ذمے داری آپ لوگ خود سنبھال لیں۔ جنوبی یورپ سے آئے ان عیسائیوں کو مقامی مسلمانوں سے دور ہی رکھنا بہتر ہے۔"
پادریوں نے اس کی بات پر بظاہر خاموشی سے سر تسلیم خم کر دیا تاہم دل میں شدید پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ مقامی مسلمانوں نے ان کے رنگ میں رنگنے کے بجائے الٹا انہی کو اپنے قالب میں ڈھال کر سبھی کے لیے شدید مشکلات

محسوس کر رہی ہیں۔ ان کے چہرے سرخ اور نظروں میں شدید غصہ تھا۔ جوزف البتہ سب سے مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں اور کوئی حکمت عملی طے کرلینے کا عزم جھلک رہا تھا۔

☆☆☆

صبح کی سنہری دھوپ بازار کی وسعت پر دھیرے دھیرے پھیلتی بے حد خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ اس دھوپ کی نرمی سکون بخش تھی۔ دونوں اطراف میں دکانوں پر سجے کھلونے، گاہکوں کی آمدورفت اور دکانداروں کی گفتگو نے ماحول میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کیا ہوا تھا۔ اس جزوی سکوت میں پہلا تلاطم اس لمحے پیدا ہوا جب شمالی سمت سے مخصوص سفید چغہ زیب تن کیے ایک پادری نمودار ہوا۔ وہ جوزف تھا جو اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس بازار میں آیا تھا۔ گاہکوں کی اکثریت اس سے شناسا تھی۔ وہ اسے تعظیم دینے لگے۔ جوزف بھی ان کی جانب بڑی بھری مسکراہٹ اچھال رہا تھا۔ اس نے چند ایک سے ابتدائی علیک سلیک کی اور اپنی گفتگو کا رخ حضرت محمد ﷺ اور حضرت عیسیٰ کے موازنے پر موڑ کر حضرت عیسیٰ کو زیادہ فضیلت کا مالک قرار دینا شروع کر دیا۔ گوشت اور سبزیاں خریدتے گاہکوں کی اکثریت ساکت کھڑی رہی۔ وہ خواہش کے باوجود اسے کوئی جواب نہیں دے پا رہے تھے۔

یہ صورت حال چند لمحوں کے لیے یونہی برقرار رہی۔ اسی اثنا میں کسی سمت سے ایک شخص برآمد ہوا۔ وہ اپنے حلیے اور چہرے بشرے سے دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا گرد آلود لباس اور ہر ایک انداز سے جھلکنے والی تھکاوٹ سے واضح ہو رہا تھا کہ وہ طویل مسافت طے کر کے آیا ہے۔ اس نے جوزف کی چند ایک باتیں سنیں تو ٹھٹک کر اس کے پاس چلا آیا۔ جوزف کا چہرہ جوشِ خطابت میں سرخ سے سرخ تر ہو رہا تھا۔

"جناب! میں اس بازار میں ابھی آیا ہوں۔ آپ کی اس شیریں اور دل آویز گفتگو کا پس منظر نہیں جانتا۔ کیا آپ اس ناچیز کے لیے اپنے الفاظ دوبارہ دہرانا پسند کریں گے؟" اس نے متانت سے جوزف کو مخاطب کیا۔

جوزف اس کی متانت سے بے حد متاثر ہوا اور اپنی گفتگو ایک بار پھر دہرانے لگا۔ سب حوالہ جات اور دلائل دینے کے بعد اس نے دیہاتی سے دریافت کیا۔

"اب بتاؤ، دونوں پیغمبروں میں عظیم کون ہے؟"

دیہاتی لمحہ بھر کے لیے مسکرایا اور اسی متانت سے گویا ہوا۔

"اس سے پہلے آپ میرے ایک سوال کا جواب دینا پسند کریں گے؟"

"ہاں بھئی، کیوں نہیں؟ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔ پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" جوزف نے فراخ دلی سے کہا۔

دیہاتی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور نرمی سے پوچھا۔

"کیا آپ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں؟"

جوزف لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور کہنے لگا۔

"ہاں، کرتا تو ہوں لیکن اس وقت بات یہ ہو رہی ہے کہ دونوں پیغمبروں میں سے افضل کون ہے؟"

"اس سوال کا جواب بھی میں اپنے محدود علم کی بنا پر دے رہا ہوں۔" دیہاتی نے بلا تامل کہا۔ "حضرت عیسیٰ ایک جلیل القدر پیغمبر اور روح اللہ ہیں لیکن اگر وہ کلی طور پر افضل ہوتے تو خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کیوں ٹھہرائے گئے؟ اگر آپ ہمیں یہ کہیں کہ سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکلا ہے تو ہم یہ بات تسلیم کرلیں گے لیکن کوئی یہ کہے کہ حضرت محمد ﷺ کی شان و عظمت کسی سے کم ہے تو... بخدا ایسا ہم کبھی بھی برداشت نہیں کریں گے۔ ہم اپنے نبی ﷺ کے خلاف ایک بھی لفظ نہیں سن سکتے ورنہ انجام کا ذمے دار ہم میں سے کسی کو نہ ٹھہرانا۔"

دیہاتی یہ بات کہہ کر اپنی خریداری میں مصروف ہو گیا۔ جوزف غصے سے پیچ و تاب کھانے لگا۔ اسے ہجوم میں موجود چند افراد کی نگاہوں سے جھلکنے والا تمسخر بھی طیش زدہ کر رہا تھا۔ وہ اسی کیفیت میں گرجا واپس گیا اور وہاں جا کے نئی صلیب کے سامنے کھڑا آنسو بہانے اور سسکیاں بھرنے لگا۔

"کیا ہوا ہے مقدس باپ؟ آپ اس طرح کیوں رو رہے ہیں؟" گرجا میں عبادت کے لیے آئے ایک شخص نے تڑپ کر دریافت کیا۔

"میری سماعت نے آج جو کچھ سنا ہے اس کے بعد مجھے شدت سے موت کی تمنا ہو رہی ہے۔ تم صرف ان آنسوؤں کی بات کر رہے ہو۔" اس کا لہجہ رندھا ہوا تھا۔

اسی اثنا میں وہاں چند مزید عیسائی بھی چلے آئے۔ جوزف کے آنسوؤں میں تیزی آ گئی۔ وہ اسی شکستہ انداز میں کہنے لگا۔

"آج بھرے بازار میں حضرت عیسیٰ کی توہین کی گئی ہے۔ ان کی شان اور عظمت پر سوال اٹھائے گئے ہیں۔"

"غلط ہے یہ سب، بہت غلط ہوا ہے۔" ایک شخص نے

فوراً بھڑک کر کہا۔

"یہ صرف غلط نہیں بلکہ گناہ ہے میرے بچو! عظیم ترین گناہ۔ آہ... ناقابلِ معافی گناہ۔" جوزف کے آنسو مزید شدت سے بہنے لگے۔

"ہم اپنے گناہ گاروں کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔" ایک عیسائی نے فوراً جوش سے جواب دیا۔

"یہی ہمارا اصل امتحان ہوگا میرے بچو! ان مسلمانوں کو تہس نہس کر دو۔ ان میں سے کوئی بھی سلامت نہیں رہنا چاہیے۔ انہوں نے ہمارے خداوند یسوع مسیح پر جو انگلی اٹھائی ہے، اس انگلی کا پورا ہاتھ ہی نہیں بلکہ جان ہی وجود سے نکال دو۔ اسی میں ہماری سلامتی اور نجات ہے۔"

جوزف کی ان باتوں نے وہاں موجود بھی عیسائیوں کے جذبات برانگیختہ کر دیے۔ وہ مشتعل ہو کر گرجا سے نکلے اور بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں وہاں فسادات برپا ہو گئے۔ گلی کوچے پہلے لہو رنگ ہوئے پھر وہاں جا بجا لاشیں دکھائی دینے لگیں۔

مسلمانوں نے بھی ان عیسائیوں کو اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تھا۔ رات تک صورت حال اس قدر ابتر ہو گئی کہ فسادات کا دائرہ کار وسیع تر ہو گیا۔ لاشیں اب گلی کوچوں میں ہی نہیں بلکہ مختلف بازاروں اور گھروں میں بھی ہر جگہ بکھری پڑی تھیں۔

اگلے دو روز میں تعفن پھیلنے کا آغاز ہوا تو میڈیئنا اور دیگر اہم عہدیداران تو تعمیر شدہ قلعے میں منتقل ہو گئے۔ مشکلات نے انہیں چاروں اطراف سے گھیر لیا تھا۔ لاشوں کا تعفن ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ شہر میں ایک نئی وبا پھوٹ پڑی۔ علاقے کے بلوں سے سیکڑوں چوہے برآمد ہونے لگے۔ کچھ ہی دنوں میں صورت حال اس قدر ہولناک ثابت ہوئی کہ پہلے تعفن نے چوہوں کو کسی نامعلوم مرض میں مبتلا کیا پھر ان کی موت واقع ہونے لگی۔ اس کے بعد اسی مرض نے علاقے کے رہائشیوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ اہل علاقہ واضح طور پر طاعون کا شکار ہونے لگے تھے۔ یہی کیا کم تھا کہ طوفان باد و باراں نے بھی بھرپور شدت سے حملہ کر دیا۔

میڈیئنا اس صورت حال پر بے حد بوکھلایا ہوا تھا تاہم اس کیفیت میں بھی اسے ایک اطمینان بہرحال ضرور میسر تھا کہ اس کا تعمیر شدہ قلعہ ہی انجام کار سب عہدیداران اور عیسائیوں کے لیے پناہ گاہ ثابت ہو رہا ہے۔

اسی دوران عسکری عہدیداران کا ایک خصوصی اجلاس طلب کیا گیا۔ ڈوریا حسبِ سابق اپنے شکوؤں کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"کاش، خداوند مجھے اتنی مہلت دے کہ میں اپنا دیرینہ خواب پایۂ تکمیل تک پہنچتا دیکھ سکوں۔"

"آپ کے خوابوں کی تعبیر دور یا مشکل نہیں ہے۔" جوانیکو کہنے لگا۔ "جس روز یہاں کچھ لوگوں میں سے سستی اور ترکوں کا بلاوجہ خود پر مسلط کیا گیا خوف ختم ہو گیا، ہم اور صرف ہم ہی غالب ہوں گے۔"

"تف ہے ہم لوگوں پر۔" ایک اور عہدیدار کہنے لگا۔ "ہم کیپارڈی اور دیگر ساتھیوں کی قسطنطنیہ میں رسوائی و خواری کا بدلہ بھی نہ لے سکے۔ ہم اتنے بے بس اور بزدل ہیں کہ صنعان پاشا یا اس کے ساتھیوں کو انہی کے سکوں میں جواب بھی نہیں دے سکتے۔"

"اگر تمہاری یہ خود ساختہ اشتعال ختم ہو گئی ہو تو میں ایک ضروری یاد دہانی کروا دوں؟" میڈیئنا نے [illegible] ضبط کی۔

"بحیرے سے متعلق ہونے کے باوجود تم سب یہ بات کیوں فراموش کر رہے ہو کہ اب ماہ دسمبر رواں ہے۔ اپریل تک سمندر طوفان کی زد میں ہی رہے گا۔ سلطان سلیمان یا درگوت یہاں کا رخ کرنے کی غلطی بھی نہیں کریں گے۔ اس حساب سے ہمارے پاس ساڑھے چار ماہ کا دورانیہ موجود ہے۔ ہم اس عرصے میں ترکوں پر آسانی قابض ہو سکتے ہیں۔"

"کاش، میں اپنی زندگی میں وہ وقت دیکھ سکوں۔ کاش! درگوت کو رہا کر دینے کی یہ غلطی میری زندگی میں ہی مجھے نجات دے جائے۔ کاش! میری جوانی ایک بار پھر لوٹ آئے اور میں کسی کا محتاج بنے رہنے کے بجائے ایسی مہمات خود ہی سر کیا کروں۔" ڈوریا شدید آزردہ تھا۔

"آپ اب بھی کسی کے محتاج نہیں ہیں۔" جوانے فوراً آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "آپ کا سہارا اور آپ کے ہر خواب کے حصول میں مددگار میں ہوں گا۔ ہم ترکوں کو چار چوٹ کی مار دیں گے۔ ہم ان سے اپنے ہر زخم کا بدلہ لیں گے۔"

بھتیجے کی اس بات پر ڈوریا کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔

☆☆☆

سلطان سلیمان کے دربار میں ایک نئی بحث اور سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ درگوت کو واپس لانے کے لیے بھیجا جانے والا اسعید تا حال نہیں لوٹا تھا۔ سلطان تک یہ خبریں بھی پہنچ چکی تھیں کہ وہ درگوت کے بحری بیڑے میں

شامل ہو گیا ہے۔"

کسی بھی احتمالی فیصلے تک پہنچنے سے قبل سلطان نے علوچی کو ... "کو درگوت کی تلاش کا ذمہ ایک اور امیر البحر ... علوچی کو یہ ذمے داری تفویض کرنے کا ایک سبب دیا۔ علوچی کو یہ ذمے داری تفویض کرنے کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ خیر الدین باربروسہ کے ساتھ کافی وقت گزار چکا تھا۔ اسے جہاز سازی کے معاملات میں بھی خاصی معلومات تھیں۔ سلطان نے پیالی پاشا سے مشاورت کے بعد علوچی کو یہ ذمے داری سونپی گئی۔

شاخ زریں سے رخصت ہو کر علوچی جہاز پر سوار ہونے کے بجائے فاتحہ خوانی کے لیے باربروسہ کے مزار پر چلا گیا۔ باربروسہ کی قبر کی دید اس کا دل عجیب طرح سے گداز کر گئی۔ باربروسہ برادران کی برسہا برس کی محنت اب تنکوں کی طرح بکھرتی دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ لمحے گریہ زاری میں بسر کرنے کے بعد جب وہ باہر نکلا تو پیالی پاشا کے ایک معتمد کو اپنا منتظر پایا۔ علوچی کے دل و دماغ میں ایک خلجان پیدا ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ پیالی پاشا نے یقیناً اس کے لیے کوئی خصوصی پیغام بھیجا ہے۔

علوچی کا یہ اندازہ بالکل درست تھا۔ پیالی پاشا نے اسے ملاقات کے لیے طلب کیا تھا۔

"امید ہے آپ کی توقعات پر پورا اتروں گا پاشا! آپ نے جس اعتماد سے سلطان کے سامنے میرا نام تجویز کیا ہے، میں اس کا بھرم قائم رکھوں گا۔" علوچی نے ابتدائی علیک سلیک کے بعد بلاتمہید کہا۔

"ایسا تو تم اس صورت میں کرو گے جب تمہیں ایسا کرنے دیا جائے گا۔"

پیالی پاشا کے یہ الفاظ علوچی کے لیے دھماکا ثابت ہوئے۔ وہ الجھن اور بے یقینی سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔" پیالی پاشا نے گہری سانس بھری۔ "میں تیرا خیرخواہ ہوں۔ تیری ہمت، لگن اور جدوجہد اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھی ہے اس لیے تجھے حقائق سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ تجھے شاید علم نہیں ہے کہ جہاز پر تیرے ساتھ روانہ ہونے والے افراد میں سے اکثریت رستم کے چمچوں کی ہے۔"

"نہیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" علوچی کو ایک جھٹکا لگا۔

"کیسے اور کیوں کا تو کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ ایسا ہو چکا ہے۔ رستم نے اپنے ان اہلکاروں کو ہدایات دے رکھی ہیں کہ درگوت کے مل جانے اور پھر تمہارے اصرار پر واپس آنے کی ہامی بھر لینے کی صورت میں جہاز پر ہی اس کا قصہ تمام کرنے کی کوشش کی جائے۔" اس نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔

"تو کیا وزیر رستم، درگوت کو قسطنطنیہ میں واپس دیکھنا ہی نہیں چاہتے؟" علوچی اب بھی اسی جھٹکے کے زیر اثر تھا۔

"رستم اور درگوت کی ناراضی اور چپقلش اب کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ رستم درگوت کو کسی بھی قیمت پر مات دینا چاہتا ہے۔" پیالی پاشا نے بتایا اور پھر متفکر لہجے میں کہنے لگا۔ "اگر رستم کے عزم پر عمل ہو جاتا ہے تو اس کے اثرات کا تم اندازہ لگا ہی سکتے ہو۔"

علوچی کا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔

"درگوت کو پہنچنے والے کسی بھی نقصان کی ذمے داری براہ راست مجھ پر عائد ہو گی۔ میں سلطان کی نظروں میں دائمی طور پر معتوب قرار دے دیا جاؤں گا۔" اس نے گہری سانس بھری۔

"ہاں، لیکن اس بات کا ایک حل میرے پاس موجود ہے۔" پیالی پاشا نے مزید رازدارانہ انداز اختیار کیا۔ "تم اگر ذرا سی ہمت کرو تو اپنے عملے میں تبدیلی پیدا کر سکتے ہو۔ ایسے افراد منتخب کرو جن پر تمہیں اعتماد ہو کہ وہ رستم سے کوئی سازباز نہیں کر سکیں گے۔"

"ایسا کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔" علوچی بے بسی سے بولا۔ "وہ عملہ رستم کا منتخب شدہ ہے اس میں کوئی بھی تبدیلی اسے برافروختہ نہ کر دے پھر میرے لیے بھی درگوت کی طرح کہیں کوئی جائے امان نہ ہو گی۔ او خدایا، یہ میں کس امتحان میں پڑ گیا ہوں۔"

"اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو جو دل چاہے کرتے پھرو۔ تمہیں متنبہ کرنا میرا فرض تھا سو میں نے پورا کر دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔" پیالی پاشا رکھائی سے بولا۔

علوچی اپنے دل و دماغ میں ہزار ہا خدشات لیے جہاز پر سوار ہو گیا۔ اگلے دو روز تک وہ اپنے ہمراہ افراد کے ذہن مختلف طریقوں سے ٹٹولتا رہا۔ ان میں سے اکثریت کا یہی خیال تھا کہ درگوت اتنی آسانی سے ان کے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ نہیں ہو گا۔ ایسی صورت میں جبری واپسی کا راستہ ہی واحد انتخاب تھا لیکن قباحت یہ بھی تو تھی کہ ایک بھرپور بحری بیڑے کا مالک درگوت اتنی آسانی سے ہتھیار کیونکر ڈالتا؟

علوچی کے چند ساتھیوں نے درگوت کی ممکنہ بغاوت اور ردعمل کے جواب میں اسے ہلاک کرنے کی تجویز دی۔ کئی ایک کا خیال تھا کہ سلطان کے پاس واپسی کی صورت

میں بھی اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہ تھی۔ کچھ اہلکاروں نے علوچی کے موقف کی بڑھ چڑھ کر حمایت کی۔

علوچی نے ہر ایک کے ردعمل کو اپنے ذہن میں نقش کر لیا۔ وہ سب ہی سے ہر ممکنہ طور پر محتاط رہنا چاہتا تھا۔ علوچی کی ذہانت کو بہت بڑے بڑے امتحان کا سامنا تھا کہ وہ درگوت کے کسی بھی ساحل پر ممکنہ قیام کا اندازہ لگا سکے۔ اس کے ذہن میں فوری طور پر اطالیہ، حلب، صیدا، مصر، عکا اور غزہ نامی علاقوں کے نام تھے۔ دھیرے دھیرے حالات واضح ہوتے گئے۔ اطالیہ پہنچنے سے قبل ہی ماہی گیروں کے کسی چھوٹے سے جہاز کے ذریعے علم ہوا کہ درگوت اطالیہ میں موجود نہیں ہے۔ حلب سے بھی انکار میں ہی جواب آیا پھر اطلاع ملی کہ اسے کریٹ کے کسی ساحل پر دیکھا گیا ہے۔

کریٹ پہنچنے کے بعد مزید یہ اطلاعات موصول ہوئیں کہ قسطنطنیہ سے سعید نامی ایک شخص اسے واپس لے جانے کے لیے آیا تھا۔ اس کے بعد درگوت کو شمالی یونانی جزائر کی جانب پیش قدمی کرتے بھی دیکھا گیا ہے۔ علوچی سخت مخمصے میں مبتلا ہو گیا۔ شمالی یونانی جزائر کو کھنگالنا آسان کام ہرگز نہیں تھا۔

کچھ ہی روز بعد اسے ایک اور اطلاع ملی کہ درگوت سالونیکا کی جانب گامزن ہے۔ یہ خبر کسی جھٹکے سے کم نہ تھی۔ سالونیکا، سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا اور علوچی کے ذہن میں روز اول سے یہی بات نقش تھی کہ درگوت ایسے کسی جزیرے کا رخ نہیں کرے گا۔ اس ذہنی کشمکش کے علاوہ جسمانی بے آرامی بھی شدید تر تھی۔ سمندری موجوں کے تھپیڑے اور تند و تیز ہوا اس کی سکت کی برداشت کرنا کوئی آسان کام ہرگز نہیں تھا۔ اس کا جہاز کئی بار بھنور کا شکار بننے سے بال بال بچا۔ خلاصی اور ملاح بھی شدید تھکاوٹ کا شکار ہو چکے تھے۔

سالونیکا پہنچ کر بھی یہ کوفت اور آزمائشیں یونہی برقرار رہیں۔ اس نے مقامی افراد سے ذاتی طور پر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"پتا نہیں آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ مجھے یہاں کسی کی آمد کا کچھ بھی علم نہیں ہے۔"

کئی ایک افراد کا یہ جواب علوچی کے لیے حسب توقع تھا۔

"درگوت اور رستم کے اختلافات شاخ زریں میں سلجھا لیے جاتے تو شاید یہ نوبت ہی نہ آتی۔" ایک اور شخص نے تنک کر جواب دیا۔

"درگوت اس معاملے میں بے قصور ہے۔ اس کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے۔" علوچی نے اپنے مقابل کو ٹٹولنے کی غرض سے کہا۔

"یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سچ ہے اور کون غلط۔" ایک اور شخص نے گرہ لگائی۔

"دیکھو میرے عزیز! ہم لوگ یہاں درگوت کی بھلائی کے لیے ہی آئے ہیں۔ اگر وہ ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائے تو سلطان اس کی غلطیاں درگزر کر دیں گے۔" اس نے متانت سے سمجھانا چاہا۔

"درگوت نے کوئی غلطی کی ہی نہیں تو درگزر کیسا؟ رستم جیسے شخص کو برداشت کرنا کسی بھی خوددار شخص کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔" اسے کسی جانب سے ایک اور دبی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

علوچی پل بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ بات تو بالکل درست ہی تھی۔

"درگوت کو آخری بار ایشیائے کوچک کی جانب جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔" ایک اور شخص نے دبے لفظوں میں ہی بتایا۔

"ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟" علوچی نے حیرت سے کہا۔ اس کی حیرت بالکل بجا تھی۔ شاخ زریں کے مطلوب ترین شخص کا قسطنطنیہ کے آس پاس یوں گھومنا بعید از گمان ہی تھا۔

"مصدقہ اطلاع ہے۔" اسی شخص نے عجلت میں کہا اور منظر سے ہٹ گیا۔

علوچی پھر ایک مخمصے میں مبتلا ہو گیا۔ اگر یہ اطلاع درست تھی تو وہ ایشیائے کوچک کے کس شہر میں موجود ہو سکتا تھا؟ اس لمحے علوچی اپنے اعصاب شدید بوجھل محسوس کرنے لگا۔ درگوت کی واپسی کی صورت دکھائی دے رہی تھی نہ ہی وہ ناکام لوٹنا چاہتا تھا۔

اعصاب کا یہ بوجھل پن اب تناؤ میں ڈھلنے لگا تھا۔

☆☆☆

سلطان سلیمان، رستم اور علوچی کی سوچوں، تفکرات اور کوششوں سے بے نیاز درگوت اس وقت قونیہ کے ساحل پر تھا۔ یہاں آمد کے بعد اس نے سب سے پہلے علاقائی حالات اور اہل علاقہ کے خیالات کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔ اگلے ہی روز اسے اپنے اہلکاروں سے علم ہوا کہ سلطان سلیمان کو اپنے ولی عہد شہزادہ مصطفیٰ کے خلاف ایک معرکہ درپیش آیا تھا۔

سلطان کے ولی عہد کی گرفتاری کے لیے رستم کو ہی

روانہ کیا گیا تھا۔ سلطان کو ولی عہد کے خلاف بھڑکانے میں اس کی دوسری زوجہ شہزادی خرم کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ شہزادہ مصطفیٰ کو پہلے مقابلے میں ناموافق ہوئی صورت حال کے باعث شکست ہوئی۔ اس کے بعد وہ ایرانی بادشاہ کے پاس پناہ گزین ہو گیا۔

کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ شاہ ایران نے شہزادے کے عوض تین لاکھ اشرفیوں کی سوداگری کر لی تھی۔ وہ شہزادے کو اپنے دام میں لے آیا کہ سلطان سلیمان، ولی عہد سے اہم مصالحتی امور پر گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ شہزادہ جھانسے میں مبتلا ہو گیا۔ اگرچہ اس کے پاس ایک قلیل حفاظتی فوج تھی تاہم والد پر بھروسا کرتے ہوئے وہ تنہا ہی اس ملاقات کے لیے راضی ہو گیا۔ اسے خیمے میں لے جانے سے قبل تنہا کر دیا گیا۔

شہزادے نے خیمے میں قدم رکھا ہی تھا کہ اندرونی سمت سے تین افراد نے اسے دبوچ لیا۔ ان کی دید نے شہزادے کی سٹی گم کر دی۔ وہ ان تینوں گونگے افراد کو پہچانتا تھا۔ یہ لوگ شاہی معتوبین کو خاموشی سے ٹھکانے لگایا کرتے تھے۔ شہزادے کے کسی بھی ردعمل سے پہلے ایک گونگے شخص نے اسے اپنے تومند بازوؤں میں جکڑا اور بقیہ دو نے اس کے گلے میں تانت کا پھندا ڈال کر مخالف سمتوں میں کھینچنا شروع کر دیا۔ اگلے چند لمحوں میں شہزادے کا لرزتا جسم ساکت اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابل چکی تھیں۔

اسی خیمے کے ایک پردے کی اوٹ میں سلطان سلیمان، ملکہ خرم اور ذہنی طور پر کمزور پسماندہ شہزادہ جہانگیر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جہانگیر پر اس نظارے کا بھیانک اثر ہوا۔ وہ جذباتی صدمے کے تحت پہلے ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا اور پھر اسی عالم میں جان کی بازی بھی ہار گیا۔ سلطان نے رستم ہی کی تجویز پر اپنے مقتول ولی عہد کے حامیوں کو سبق سکھانے کے لیے اس کی لاش کھلے خیمے میں رکھوا دی۔

ان واقعات سے آگاہی کے بعد درگوت ایک نئی سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ ایک عادل اور قانون پسند سلطان کا یہ روپ اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔ اگر ان واقعات میں کوئی کھوٹ نہیں تھا تو اس کا براہ راست مطلب اب یہی تھا کہ سلطان سلیمان کا کردار مختلف تضادات کا شکار ہو گیا ہے۔

کچھ لمحے مزید سوچ بچار کے بعد درگوت نے سلطان سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔ اس ملاقات کے دوران کسی بھی غیر متوقع صورت حال سے بچنے کے لیے بھی وہ ذاتی طور پر پہلے سے تیار رہتا۔ درگوت نے اپنے قریبی ساتھیوں سے بھی اس فیصلے کا کوئی ذکر نہ کیا۔ وہ انتظار کے معاملے میں خاصا قلاش ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے وہاں سے انخلا کرنے کے بعد بحری بیڑے کا رخ ترائے کی طرف کر لیا۔

"یہ درگوت کو آخر ہو کیا گیا ہے؟" سعید نے ایک معتمد سے کہا۔ "ترائے کیوں روانہ ہو رہا ہے؟ کیا اسے علم نہیں کہ یہ علاقہ قسطنطنیہ کے سامنے مشرق میں باسفورس کے دوسرے کنارے پر واقع ہے۔ یہاں سے قسطنطنیہ اتنا قریب ہے کہ سلطان کا بحری بیڑا اسے بہ آسانی گرفتار کر لے گا۔"

"ہم کیا کہہ یا کر سکتے ہیں؟ اور یہ بات اچھی طرح جان لو کہ درگوت سب کچھ جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس نے یہ فیصلہ یقیناً بہت سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ بس وقت آنے دو۔" اس شخص نے بے نیازی سے کہا۔

سعید ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گیا۔ اسے اس لمحے اپنی جان کی فکر لاحق ہو چکی تھی۔ اس نے سلطان کی حکم عدولی کر کے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا اور اب اس خطرے کے نتائج بھگتنے کا وقت آ گیا تھا۔

کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ حالات نے ایک اور غیر متوقع موڑ لے لیا۔ طرابلس سے آنے والا ایک جہاز ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ یہ جہاز صنعان پاشا نے بھیجا تھا جو سلطان کو جربہ کے حالات سے آگاہ کرنے آیا تھا۔ جہاز کا سفیر ساحل پر درگوت کے جہاز کو دیکھ کر چونک گیا۔ اسے سلطان اور درگوت کی باہمی چپقلش کی اصل نوعیت کا مکمل علم نہ تھا۔ وہ ابھی اسی تذبذب میں تھا کہ درگوت نے اسے خود ہی اپنے پاس طلب کر لیا۔ وہ اس سے طرابلس اور جربہ کے حالات جاننا چاہتا تھا۔

جوابی طور پر ابو عبداللہ نے جنوبی یورپ کے ڈیوک میڈینا کی منظر عام پر آمد اور اس کے بعد پیش آنے والے سبھی واقعات سے تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ درگوت کے لیے یہ صورت حال خاصی محظوظ کن تھی جب اسے ابو عبداللہ سے یہ علم ہوا کہ ڈیوک میڈینا کو بیرونی امداد ہنوز میسر ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ مالٹا کے کچھ ایسے جنگجو بھی مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے منصوبے مرتب کرتے رہے تھے جو جذباتی جنون میں مبتلا تھے۔

درگوت کے ذہن میں ایک منصوبے کے خدوخال پرورش پانے لگے۔ اس نے ابو عبداللہ کو تاکید کی کہ سلطان سے ملاقات کی صورت میں وہ درگوت سے ملنے اور جربہ

کے معاملات پر باہمی تبادلۂ خیال کا کوئی ذکر نہ کرے۔ اس ملاقات کے بارے میں سلطان کے کسی بھی استفسار کی صورت میں بے نیازی جتانے اور درگوت کی شاخ زریں آمد کا عندیہ دینے کی ہدایات دے کر اسے رخصت کر دیا۔

درگوت کے معتمدین اس صورت حال پر ششدر تھے۔ سعید اس سے استفسار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"رستم کے بارے میں کیا سوچا ہے آخر؟ اسے جیسے ہی یہاں آپ کی موجودگی کا علم ہوا، وہ آپ پر پوری شاہی قوت سے چڑھائی کر دے گا۔"

"وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ تم بھی دیکھ لو گے۔" درگوت معنی خیزی سے مسکرایا اور اپنے جہازوں سے سرخ و سفید پرچم اتار کر انہیں شاخ زریں روانگی کا حکم دے دیا۔

"امیر! ہم سب بری طرح پھنس جائیں گے۔ سلطان کی سفاکیت پوری طرح عود آئی ہوئی ہے۔ اس نے شہزادہ مصطفیٰ جیسے بہادر بیٹے کا قتل جس طرح کیا ہے، اس کے بعد ہم جیسوں کی کیا بساط ہے؟" سعید نے اسے متنبہ کرنا چاہا۔

"سلطان کے وہ فیصلے مختلف حالات اور اوقات میں کیے گئے تھے۔ مجھ سے ملاقات کے وقت حالات کچھ اور ہوں گے۔ وہ ہمارے خلاف ایسا کوئی بھی انتہائی فیصلہ نہیں کر سکے گا۔ تم سب چاہو تو جہازوں سے اتر کر قسطنطنیہ میں آزادانہ گھوم پھر سکتے ہو۔ کوئی بھی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔"

درگوت کے اس اطمینان بھرے جواب پر سعید سخت بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

"اور وہ شر پسند رستم؟" سعید نے مزید کچھ کہنا چاہا۔

"کوئی بھی مجھے کچھ نہیں کہہ سکے گا۔ کہہ دیا ہے نا!" درگوت نے حتمی انداز میں کہا اور جہاز سے اتر کر ساحل پر چلا آیا۔

کچھ ہی دیر میں وہ ایک قریبی جہاز سازی کے کارخانے کے منتظم کا گھوڑا زبردستی ہتھیا کر شاخ زریں کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ وہ منتظم کے اعتراضات اور خود کو پہچان لیے جانے پر اعتراضات کو بھی خاطر میں نہیں لایا تھا۔ روانگی سے قبل اس نے منتظم کو بے نیازی سے اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا۔

"میرا یہیں انتظار کرنا۔ میں سلطان سے ملاقات کے بعد تیرا گھوڑا یہیں لوٹانے آؤں گا۔"

درگوت نے یہ الفاظ دانستہ طور پر ادا کیے تھے۔ اس کے اندازے کے عین مطابق منتظم نے یہ خبر فوری طور پر رستم کو پہنچا دی۔ درگوت کی اس طرح واپسی نے رستم کو بھی متفکر کر دیا تھا۔ وہ فوری طور پر اس کے پیچھے شاخ زریں روانہ ہو گیا۔

اب صورت حال کچھ اس طرح تھی کہ درگوت اور رستم دونوں ہی بیک وقت سلطان کے پاس باریابی کے منتظر تھے۔ سلطان نے دونوں کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ وہ اس وقت ایک کھڑکی کے پیچھے بیٹھا تھا۔

"امید ہے تم نے سفارتی آداب کا خیال رکھتے ہوئے علوجی کو کوئی گزند نہیں پہنچایا ہوگا۔" سلطان نے درگوت کو مخاطب کیا۔

"کون علوجی؟" درگوت کا چونکا ہوا۔

"اب سلطان معظم سے بہت کہنا کہ تم یہاں اپنی مرضی سے آئے ہو اور تم کسی علوجی کو نہیں جانتے۔" رستم نے بھرپور وار کیا۔

"ہاں، میں خود ہی یہاں آیا ہوں اور میں کسی علوجی کو نہیں جانتا۔"

درگوت کے اس جواب میں ایسی قطعیت تھی کہ رستم یکدم خاموش ہو گیا۔

"اس موضوع کو یہیں ختم کرو۔ میں اصل حقائق سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر سلطان، رستم کی جانب متوجہ ہوا اور اسے تمام واقعات دہرانے کا حکم دیا۔ رستم نے وزارت عظمیٰ کی ذمے داری سونپے جانے سے لے کر درگوت کی سرکشی اور باغیانہ روش کی تمام تر تفصیل بیان کر دی۔ اس کی گفتگو کے دوران سلطان، درگوت کا مدعا بھی جانتا رہا۔ جہازوں پر اپنے پرچم لہرانے کی بات کا ذکر آیا تو درگوت اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"میرا وہ عمل رستم کی ناانصافی کا ردعمل تھا۔ اس نے میرا منصب چھینا اور کوڑے کروا کر میری عزت نفس مجروح کی تھی۔ اس ردعمل کا مجرم بھی رستم ہی ہے۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

اس دوران درگوت کی نظریں مسلسل سبھی اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ سلطان کے خصوصی تین گونگے محافظوں کی آمد اور اپنے ممکنہ قتل کے بارے میں مکمل طور پر چوکس تھا۔ ایسے کسی بھی حملے کا بھرپور جواب دینے کے لیے جوش اور مستعدی بھی سوا تھی۔

سلطان نے دونوں فریقین کا مدعا جان کر مقدمے کی کارروائی وقتی طور پر ملتوی کر دی۔ اب ان دونوں کو ہی اپنی قسمت اور سلطان کے فیصلے کا انتظار تھا۔ انہیں رتی بھر بھی

اندازہ نہیں تھا کہ اس مقدمے کے فیصلے کے سلسلے میں کھڑکی کے عقب میں بیٹھا سلطان کس سے مشاورت کر رہا ہے۔ انتظار کی ان گھڑیوں میں وہ ایک دوسرے پر جملے کسنے اور طنز کے وار کرنے سے بھی نہیں چوک رہے تھے۔

رستم اس صورت حال سے سخت بیزار تھا۔ اس بیزاری میں خوف بھی پوشیدہ تھا۔ تاہم درگوت قدرے مطمئن تھا۔ اسے سلطان کے انداز گفتگو سے اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اسے کوئی سزا نہیں سنائے گا۔ درگوت کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ طویل انتظار کے بعد کمرے کی دوسری جانب سے ایک خواجہ سرا سلطان کا فیصلہ لیے چلا آیا۔

درگوت اور رستم کو اپنے دل کنپٹیوں میں دھڑکتے محسوس ہونے لگے۔ خواجہ سرا کے ہاتھوں میں ایک قیمتی تلوار، قرآن پاک کا نسخہ اور کچھ کاغذات تھے۔ اس نے وہ تمام چیزیں بے نیازی سے ایک چوکی پر رکھیں اور پھر ایک کاغذ درگوت کو تھما دیا۔

"کیا حکم ہے سلطان کا میرے لیے؟" درگوت نے باوقار انداز میں دریافت کیا۔

"آپ کو معاف کر دیا گیا ہے۔ یہ تلوار اور قرآن پاک کا نسخہ معافی نامے کے ساتھ بھیجا ہے۔"

یہ سن کر درگوت کے چہرے پر اطمینان در آیا تو وہیں رستم کی رنگت بری طرح متغیر ہو گئی۔ اسے اپنے لیے سزا کا خطرہ مجسم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ خواجہ سرا اس کے ساکت وجود کی طرف متوجہ ہو کر گویا ہوا۔

"سلطان نے آپ کو بھی معاف کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا ذمے دار ٹھہرایا ہے۔ سلطان کی جانب سے آپ کو سختی سے یہ ہدایت ہے کہ مستقبل میں ایسی غلطی نہ دہرائی جائے ورنہ فیصلہ مختلف بھی ہو سکتا ہے۔"

رستم یک دم متضاد کیفیات کا شکار ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ابھرنے والی پہلی سوچ یہی تھی کہ سلطان سلیمان کا یہ فیصلہ عارضی ہے۔ اصل فیصلہ یقیناً کچھ دن بعد سنایا جائے گا جس کے نتیجے میں اسے وزارت عظمیٰ سے برخاست بھی کیا جا سکتا تھا۔ اپنی اس کشمکش اور درگوت کے ہاتھ میں تلوار، قرآن پاک کا نسخہ دیکھ کر وہ سخت مضطرب ہونے لگا۔ اس اضطراب کی تہ میں خود شناسی اور خود احتسابی کی لہریں بھی ہلکورے لے رہی تھیں۔ وہ غیر جانبدارانہ طور پر اپنا اور درگوت کا موازنہ کرنے لگا۔ اگر سلطان کی جانب سے رستم کو سزا ملتی اس کی بھی توجیہ ہو جاتی لیکن درگوت کی سزا کے بعد تو سلطنت عثمانیہ کی بحریہ ہی تباہ ہو جاتی۔ خود احتسابی کے اس عمل میں رستم کا ذہن اور بھی بہت سے دریچے وا کر رہا تھا۔ رستم کو یاد آنے لگا کہ اسے سلطان کی بیٹی سے شادی کے بعد شاہی بیگمات کی سفارش سے وزارت عظمیٰ نصیب ہوئی تھی۔ درگوت کا معاملہ البتہ مختلف تھا۔ اس نے امیر البحری کا عہدہ اپنی ذاتی صلاحیتوں اور کارناموں کی بنا پر حاصل کیا تھا۔ اس کی مہمات کے بعد شاہی خزانہ مال و زر سے بھر گیا تھا۔ اسے غلاموں کی منڈیوں میں فروخت کے لیے ہزاروں غلام میسر آئے تھے۔ مال غنیمت کے طور پر گن کا اسلحہ اور جہاز الگ حاصل ہوئے تھے۔

اس موازنے سے رستم کے دل میں حسد کی ایک بلند و بالا لہر نمودار ہوئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ درگوت اور وہ کسی ترازو کے پلڑے میں موجود تھے اور اب یقیناً درگوت کا پلڑا بھاری ثابت ہوا ہے۔ اس حسد نے اسے پل بھر میں ہی خاکستر کر دیا۔ اسے اپنی سماعت میں خواجہ سرا کے الفاظ کہیں دور سے آتے محسوس ہو رہے تھے۔

"سلطان نے امیر البحر کو اس بات کا بھی پابند کیا ہے کہ وہ ان کی مرضی کے بغیر قسطنطنیہ سے کہیں نہ جائیں بلکہ یہیں رہ کر بحری بیڑا تیار کریں گے تاکہ طرابلس، جربہ اور تیونس ان بحری قزاقوں سے واپس لے کر انہیں سخت سے سخت سزا دی جائے۔"

درگوت نے سرشاری سے مسکراتے ہوئے سر تسلیم خم کیا اور نہایت شان سے شاخ زریں سے اپنے بحری بیڑے میں لوٹ آیا۔ اس نے رستم کی کینہ توز نظریں اور بھینچے ہوئے ہونٹ یکسر نظر انداز کر دیے تھے۔

☆☆☆

سعید بڑی بے چینی سے درگوت کی واپسی کا منتظر تھا۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی کہیں قرار نہیں مل رہا تھا۔ عرشے پر ٹہلتے ہوئے وہ سوچوں کے جنگل میں بے طرح بھٹک چکا تھا۔ وہ درگوت کی واپسی کے لیے بہت تشویش زدہ تھا۔ ہر ایک لمحہ صدیوں سے بھی طویل محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی تھکی آنکھوں سے نبرد آزما ہوتے وقت کچھ اور بیتا تو درگوت کی جھلک سے بالآخر سانس میں سانس آئی۔

"آہ..... امیر! میں بتا نہیں سکتا کہ ہم سب کتنے پریشان تھے آپ کے بارے میں سوچ کر۔"

"خواہ مخواہ ہی آزار میں مبتلا رہے تم۔ میں نے کہا تھا کہ سلطان مجھے کچھ نہیں کہے گا۔" اس نے اعتماد سے جواب دیا۔

سعید حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ درگوت نے

مختصراً سبھی کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ اگلے چند لمحوں میں جہاز پر ایک جشن کا سماں برپا ہو چکا تھا۔ ہر جانب چراغاں کیا گیا۔ ہر چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔ وہ اپنی مسرت کے اظہار میں اٹھلاتے رقص بھی کرنے لگے۔

"سچائی ایک امرت ہے
جس کے ابتدائی گھونٹ سخت تلخ ہوتے ہیں
ایسا محسوس ہوتا ہے
گویا اسے نوش کر کے
رگ جاں میں تلخی و آزار کے سوا
کوئی احساس باقی نہ رہے گا
لیکن یہ بھی ایک آزمائش ہوتی ہے
اس امرت کے گھونٹ در گھونٹ
پیتے رہنے سے
وہ لمحہ بھی آتا ہے
جب رگ جاں میں شیرینی کے سوا
کوئی دوسرا احساس باقی نہیں رہتا
ہر سو پھول کھل جاتے ہیں
اور ہر خواب تعبیر کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے
سچائی سچ میں ایک امرت ہی ہے
کائنات کا فرحت بخش ترین امرت!"

☆☆☆

جشن و طرب کو کچھ دیر گزری تھی کہ درگوت کو علوچی نامی ایک شخص کی آمد سے مطلع کیا گیا۔ درگوت ٹھٹک گیا۔ اس نے علوچی کو فوری طور پر اپنے پاس طلب کر لیا۔

"تو تم ہو علوچی، جسے میری تلاش میں شاخ زریں سے روانہ کیا گیا تھا۔" درگوت نے اس کا بغور جائزہ لیا۔

"جی ہاں، ہم نے بحیرۂ روم میں ہر جگہ آپ کو تلاش کیا۔ ہمیں کیا علم تھا کہ آپ سے یہاں قسطنطنیہ میں ملاقات ہوگی۔" علوچی شگفتگی سے مسکرایا۔ اسے درگوت کی جانب سے ایسے بے باک فیصلے کی توقع ہی نہیں تھی۔

"اختیارات کے نشے میں مبتلا "مریض" کا علاج اکثر "جراحت" سے کیا جاتا ہے۔" درگوت نے معنی خیزی سے جواب دیا۔

علوچی اس کا اشارہ فوری طور پر بھانپ گیا اور خلوص سے کہنے لگا۔

"مجھے یقین تھا کہ سلطان آپ کے معاملے میں کسی ناانصافی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔"

"مجھے بھی یہی یقین تھا اور اب تو ہمیں طرابلس و جربہ روانگی کے لیے بحری بیڑا تیار کرنے کا حکم بھی ملا ہے۔"

علوچی درگوت کی اس بات پر چونک گیا۔ اس کی آنکھوں میں یکدم ایک چمک در آئی تھی۔

"جناب امیر! اس مہم میں مجھے بھی شمولیت کے اعزاز سے بخشیے گا۔" وہ خلوص سے کہنے لگا۔

"یہ فیصلہ وقت آنے پر کیا جائے گا۔" درگوت نے نیم رضامندی کے باوجود قدرے تامل سے جواب دیا۔

علوچی کو رخصت کر کے درگوت بحری بیڑے کی جانب متوجہ ہوا۔ حیران کن طور پر اس کا عملہ مہم کی تیاریوں کا آغاز کر چکا تھا۔ درگوت کو اس لمحے اپنے ان ساتھیوں پر بے پناہ فخر محسوس ہوا۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیر الدین باربروسہ کا دور بھی یاد آیا تھا۔ یہ جوش و جذبہ اس کی وفات کے بعد اب اسی تابناکی سے جھلکتا دکھائی دیا تھا۔ وہ دلی طور پر ان جذبات کی بقا کے لیے دعا گو تھا۔ اس دوران وہ اپنی مہم میں علوچی اور پیالی پاشا کی شمولیت کا فیصلہ کر چکا تھا۔

اگلے روز یہ خواہش سلطان کے گوش گزار بھی کر دی گئی۔ سلطان نے پیالی پاشا کو درگوت کے ہمراہ بھیجنے کا حکم دے دیا۔ یہ حکم ملتے ہی پیالی پاشا ماہرین موسمیات کے پاس چلا گیا۔

"یہ مہم ایسے موسم میں خطرناک ثابت ہو سکتی ہے پاشا محترم!" ایک ماہر نے اسے بتایا۔

"جی ہاں اگر یہ مہم جاری رکھی گئی تو شاید تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرائے۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"کیسی تاریخ؟" پیالی پاشا نے چونک کر پوچھا۔

"چارلس کا وہ تاریخی فیصلہ بھول گئے ہیں آپ؟" پہلے ماہر نے اسے یاد دلایا۔ "اس نے اپنے امیر البحر ڈوریا کا مشورہ نہیں مانا تھا اور ناموافق موسم میں سفر کرنے پر ہی مصر رہا۔"

"اوہ ہاں..... یاد آ گیا مجھے۔" پیالی پاشا چونکا۔

"درگوت بھی اس سفر کے بعد وہی غلطی دہرائے گا۔ کیوں اپنی بربادی کو خود دعوت دے رہے ہیں؟"

"کیا تم یہ سب کچھ درگوت کو کہہ سکتے ہو؟" پیالی پاشا نے دریافت کیا۔

"میں اس سے یہ سب پہلے ہی کہہ چکا ہوں لیکن وہ کسی کی سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ نقصان دہ موسم زیادہ فائدہ پہنچائے گا۔" اس ماہر نے بتایا۔

اس کے انداز میں ہلکی سی تلخی بھی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ حقیقت یہی تھی کہ ان ماہرین موسمیات کو خطرناک منظر کشی اور ہولناکی کا تاثر پیدا کرنے کے لیے رستم نے

ہدایات دے رکھی تھیں۔ رستم اپنے حسد و بغض کے باعث درگوت کو ہر مہم سر کرنے سے کسی بھی طرح روکنا چاہتا تھا۔

"اس بار اور سرکش سے بھی امید کی جاسکتی ہے۔"

پیالی پاشا نے دانت پیسے اور پھر کسی خیال کے تحت اس ماہر سے کہنے لگا۔

"کیا تم یہ سب حقائق سلطان کے سامنے بیان کرسکتے ہو کہ موسم کی خرابی کے باعث یہ مہم ملتوی کردینا ہی بہتر ہے۔ بصورت دیگر بحری بیڑا تباہ کاری کو روکنا ممکن نہیں ہوگا۔"

"جی ہاں، اگر آپ چاہیں تو میں اپنی رائے تحریری شکل میں فراہم کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ یہ مہم کچھ عرصے تک ملتوی کردینا ہی بہتر ہے۔" وہ رستم کی پروردہ ہدایات پر من و عن عمل کر رہا تھا۔

پیالی پاشا نے تائید میں سر ہلادیا۔ ان ماہر موسمیات نے اپنی رائے تحریری طور پر فراہم کردی۔ سلطان نے یہ تحریر پڑھتے ہی درگوت کو شاخ زریں میں طلب کرلیا۔ درگوت کو اپنی اس طلبی کے پس منظر کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اس کا اعتماد و بے نیازی سوا تر ہوگئی۔ سلطان تمہید اور فروعی معاملات میں وقت ضائع کرنے کے بجائے براہ راست اصل مدعے پر آگیا۔

"ایک تجربہ کار امیر البحر ہونے کے باوجود تم اس موسم میں سفر کرنے کے لیے مصر کیوں ہو؟"

"اس بات کی منطق بہت سادہ ہے سلطان معظم!" درگوت نے اعتماد سے جواب دیا۔ "ہمارا دشمن بھی اسی گمان میں ہوگا کہ ایسے خطرناک موسم میں سلطنت عثمانیہ کا کوئی بحری بیڑا ان پر حملہ آور نہیں ہوگا۔ میں ان کی اسی غفلت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ جربہ میں حالات بے حد خراب ہیں۔ طوفان باد و باراں اور طاعونی وبا نے وہاں ہزاروں افراد کو لقمہ اجل بنا دیا ہے۔ بقیہ اکثریت الیون کی لت میں مبتلا ہوچکی ہے۔ وہ اس وقت کسی نہ کسی بیرونی امداد کے منتظر ہوں گے۔ اگر ہم ان تک کوئی بھی امداد پہنچنے سے قبل ہی حملہ کردیں تو نتائج خاطر خواہ ثابت ہوں گے۔"

"لیکن موسم کی ہولناکی کیسے نظر انداز کی جاسکتی ہے؟ ایسے خطرناک موسم میں اپنا بیڑا منزل تک کیسے پہنچاؤ گے؟" سلطان نے اگلا خدشہ بیان کیا۔

"اس کا حل بھی نہایت سادہ ہے۔ اگر ہم ساحل کے بالکل ساتھ سفر کریں تو موسم میں کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں فوراً قریبی ساحل پر لنگر انداز ہوجائیں گے۔ اس کے علاوہ ہم اسکندریہ میں کھانے پینے اور آرام کے انتظامات کر کے رکھیں گے۔" درگوت نے بتایا۔

"نہایت مناسب خیال ہے۔" سلطان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"میری ایک اور گزارش بھی ہے سلطان معظم!" درگوت نے لمحاتی توقف کے بعد کہا اور سلطان کی جانب سے مثبت اشارہ پاکر مزید گویا ہوا۔

"میری بیان کردہ حکمت عملی سے ہر ایک کو بے خبر رکھا جائے...... ہر ایک کو۔"

سلطان نے اس کا عندیہ فوراً بھانپ لیا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسا تمہیں مناسب لگتا ہے، ویسے ہی ہوگا۔"

"سب سے پہلے تو اس بات کا اعلان کروا دیں کہ ترک بحری بیڑا اب موسم کی خرابی کے باعث کچھ عرصے بعد جربہ پر حملے کے لیے روانہ ہوگا۔"

سلطان نے اس کی تجویز تسلیم کرلی۔ بہت جلد قسطنطنیہ میں یہ چہ میگوئیاں گردش کرنے لگیں کہ جربہ پر حملے کا ارادہ منسوخ کردیا گیا ہے اور اب بحری مشقوں کا آغاز ہوگا۔

رستم کی خوشی دیدنی تھی۔ اسے اپنے مقصد میں ملنے والی یہ کامیابیاں مزید "محنت" کے لیے مہمیز کررہی تھیں۔ وہ درگوت کو ہر قیمت پر نیچا ہی دکھانا چاہتا تھا۔ درگوت اس کی کیفیات سے بے خبر اور اپنے معاملات میں مگن تھا۔

بحری بیڑے کی شاخ زریں سے روانگی کے بعد حسب دستور خیر الدین باربروسہ کے مزار کو سلامی دی گئی۔ توپوں کی مخصوص آواز گونجی اور بیڑا آہستہ آہستہ باسفورس سے بڑھ کر ترائے کے سامنے سے ہوتا ہوا تونیہ پہنچ گیا۔ قرب میں موسمی صورت حال سخت ناخوشگوار تھی۔ طغیانی ہواؤں نے سمندر میں مدوجزر پیدا کر رکھا تھا۔

"موسم مزید خراب بھی ہوسکتا ہے۔ ہم کچھ روز یہیں قیام کرلیں تو بہتر ہوگا۔" پیالی پاشا نے اسے تجویز دی۔

"نہیں، میں یہاں قیام نہیں کرنا چاہتا۔ ہمیں جلد از جلد اطالیہ روانہ ہونا ہے۔"

درگوت کے اس دو ٹوک جواب پر پیالی پاشا اختلاف کے باوجود خاموش ہوگیا۔ کچھ مسافت طے ہونے کے بعد درگوت نے اپنے ساتھیوں کو جہاد کے فضائل کی بابت وضاحت کا آغاز کردیا۔ اس نے سب سے پہلے سورۃ النساء کی آیات کا حوالہ دیا۔

"جو مسلمان گھروں میں بیٹھ رہتے اور لڑنے سے جی چراتے ہیں اور کوئی عذر نہیں رکھتے اور وہ جو اللہ تعالیٰ کی راہ

میں اپنے مال اور جان سے لڑتے ہیں وہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔ مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے درجے میں فضیلت بخشی ہے۔ اور گو نیک وعدہ سب سے ہے لیکن اجر عظیم کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر کہیں فضیلت بخشی ہے اور رحمت میں اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔"

اس کے خوبناک انداز بیان پر بھی ساتھی خود کو ایک سحر میں گرفتار محسوس کرنے لگے۔ درگوت نے ان کی کیفیت کا بغور جائزہ لیا اور ایک اور آیت کا ترجمہ بیان کرنے لگا۔

"اے ایمان والو! میں تم کو ایسی تجارت نہ بتادوں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے۔ تم لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاؤ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہت بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ جب ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کردے گا اور تمہیں جنت کے ایسے باغات میں داخل کردے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں داخل کرے گا جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں بنے ہوں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک اور چیز تمہیں دے گا جس کو تم پسند کرتے ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اور جلدی فتح یابی۔"

اس بیان نے بھی افراد کے بدن سنسنا دیے۔ وہ سب یک زبان نعرۂ تکبیر بلند کرنے لگے۔ درگوت بے حد مطمئن تھا۔ دوسری جانب پیالی پاشا، درگوت کی ہر ایک جنبش پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ طوجی سے اپنی بے چینی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"درگوت کے ذہن میں یقیناً کوئی خاص کچھ کھلبلا رہا ہے۔"

"ایسا کیوں محسوس ہوا ہے آپ کو پاشا؟" طوجی چونکا۔

"کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ وہ اس وقت کس جنونی کیفیت میں مبتلا ہے۔ ہم بحری مشقوں کے لیے روانہ ہوئے ہیں لیکن درگوت جہاد کے فضائل بیان کرنے پر تلا ہوا ہے۔ وہ ایسا کس مقصد کے لیے کررہا ہے؟ اگر یہ مہم صرف بحری مشقوں کے لیے ہے تو وہ اسے تثلیث اور وحدانیت پرستوں میں لڑائی سے کیوں منسوب کررہا ہے؟" پیالی پاشا نے جوش سے کہا۔

"میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر جناب امیر ایسا کچھ کررہے ہیں تو ان کے پیش نظر ضرور کوئی نہ کوئی عظیم تر مقصد ہوگا۔" طوجی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

پیالی پاشا اس کی عقیدت پر ناگواری محسوس کرنے کے باوجود خاموش ہوگیا۔ وہ باریک بینی سے درگوت کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ درگوت اطالیہ پہنچا تو اس دوران طلایہ گرد اور دیگر اہلکار اسے کئی معلومات بہم پہنچاتے رہے۔

"اطالیہ کے عیسائیوں میں کافی کھلبلی برپا ہے امیر!" ایک اہلکار نے بتایا۔

"کیوں؟ ایسی کیا تشویش لاحق ہوگئی ہے انہیں؟" درگوت معنی خیزی سے مسکرایا۔

"وہ اس بیڑے کی منزل جاننے کے متعلق بے چین ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ تشویش بھی ہے کہ ہم اطالیہ میں ان کے مقدس مقامات کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔"

اہلکار کی اس بات پر درگوت ایک بار پھر مسکرا اٹھا۔

"کئی افراد کو یہی شبہ ہے کہ اس بیڑے کی منزل مالٹا ہے۔" دوسرے اہلکار نے بتایا۔

"اگر وہ سب ہماری وجہ سے اتنے آزار میں مبتلا ہیں تو ان کی یہ اذیت راحت میں بدل دیتے ہیں۔ اطالیہ سے کوچ کرجاتے ہیں۔" درگوت نے اپنا طے شدہ فیصلہ سنایا۔

عملے نے حیرت کے باوجود حکم کی تعمیل کی اور حلب روانہ ہوگئے۔ حلب میں قیام بھی مختصر رہا۔ اس کے بعد درگوت نے صیدہ روانگی کا عندیہ دے دیا۔ وہاں پہنچ کر بھی اہلکاروں کی جانب سے متفرق اطلاعات ہی موصول ہوئیں۔

"تشویش کی یہ لہر یہاں بھی ویسی ہی شدت سے موجود ہے امیر!" ایک اہلکار نے بتایا۔

"بالکل ہونی بھی چاہیے۔" درگوت نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"وہ اس بحری بیڑے کی منزل جاننے کے لیے سخت بے چین ہیں۔" دوسرے اہلکار نے بتایا۔

"کہہ دو کہ اسکندریہ جارہے ہیں۔" درگوت کی بے نیازی برقرار تھی۔

"لیکن وہاں تو مقامی افراد ترکوں کے خلاف ہیں۔" پہلا اہلکار چونکا۔

"بالکل ہیں۔ وہ بغاوت کے مرتکب بھی ہوئے ہیں۔ سلطنت عثمانیہ کے مقابلے میں عرب بحریہ کا قیام عمل میں لانا چاہتے ہیں۔" درگوت نے کہا اور پھر کسی فوری خیال کے تحت گویا ہوا۔

"بلکہ تم لوگ رہنے دو۔ ایسا کچھ مت کہنا یا کرنا۔ یہ کام میں خود ہی سرانجام دے لوں گا۔"

اہلکاروں نے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے

باوجود کچھ بھی پوچھنے سے گریز ہی کیا۔ درگوت نے اپنے منصوبے کے تحت ایک ساحلی سرائے کا رخ کرلیا۔ وہاں موجود کچھ عیسائیوں نے اس کی شناخت کرلی تھی۔ وہ تجسس اور دلچسپی سے مغلوب ہوکر اس کے پاس چلے آئے۔

''صیدہ میں کتنے روز قیام کا ارادہ ہے؟'' ایک عیسائی نے دریافت کیا۔

''ہمیں مہمان نوازی کا بھرپور موقع فراہم کرنا امیر!'' دوسرے عیسائی نے قدرے طریقے سے اپنا مدعا بیان کیا۔

درگوت ایسے سوالات کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار تھا۔

''یہ موقع پھر کبھی فراہم ہوجائے گا۔ ابھی تو ہمیں اسکندریہ کوچ کرنا ہے۔ وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔'' اس نے متانت سے کہا۔

''سننے میں آیا ہے کہ اسکندریہ میں مقامی لوگ ترکوں اور سلطنتِ عثمانیہ کے بہت خلاف ہیں۔'' پہلے عیسائی نے تجسس سے دریافت کیا۔

''ہاں، وہاں کافی لوگ بغاوت کے مرتکب بھی ہورہے ہیں۔'' درگوت نے تشویش جتائی۔

''میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ سلطنتِ عثمانیہ کے مقابلے میں عرب بحریہ وجود میں لا رہے ہیں۔'' دوسرے عیسائی نے اپنی معلومات کا تبادلہ کیا۔

اسی دوران وہاں کئی اور افراد بھی چلے آئے تھے۔

''خواب دیکھتے رہنے میں کیا حرج ہے؟'' درگوت نے تمسخر اڑایا۔ ''یہ عرب یونہی خواب ہی دیکھتے رہیں گے۔ سلطنتِ عثمانیہ انہیں کبھی ایسے کسی بھی ارادے میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔''

''ہمیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔'' وہاں موجود ایک اور عیسائی نے کہا۔

''میں عربوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ ترکوں کے خصائل عربوں سے قدرے بہتر ہیں۔ عرب خاصے کاہل اور تنگ نظر ہوا کرتے ہیں۔'' تیسرے عیسائی نے متعصبانہ انداز میں کہا۔

''پانچوں انگلیاں برابر بھی نہیں ہوتیں۔'' درگوت نے دانستہ طور پر نرمی سے اسے ٹوکا۔

''یہ تو تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے۔'' پہلے عیسائی نے معنی خیزی سے کہا۔ ''ورنہ تم تو خود بھی ایسے ہی ایک عرب سے چوٹ کھائے ہوئے ہو۔ ہمیں کیا علم نہیں کہ صالح رئیس نے تم لوگوں کی پیٹھ میں کیسے چھری گھونپی تھی۔ اسے باربروسہ نے بہترین انداز میں تربیت دی تھی اور وہ اسی کے مقابلے میں عرب بحریہ قیام میں لانے کے خواب دیکھنے لگا۔''

''تو اب غداری بھی تو خوب اختیار کرلی ہے۔'' ایک اور شخص نے کہا۔

''ہاں، وہ کہیں کا بھی نہیں رہا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اسکندریہ میں بھی اس نے کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کیا ہوگا۔'' سرائے میں موجود ایک اور شخص کہنے لگا۔

درگوت وہاں کچھ دیر مزید ٹھہرنے کے بعد واپس اپنے جہاز پر چلا آیا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق وہاں چہ میگوئیوں کا آغاز ہوگیا تھا۔

''حالات کوئی نیا رخ اختیار کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔'' ایک شخص نے سرگوشی کی۔

''لیکن مجھے اس میں بہتری محسوس ہورہی ہے۔ مسلمان آپس میں کٹ مریں گے۔ اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے؟''

اس نکتے سے دیگر عیسائیوں کی باچھیں بھی کھل گئیں۔ ان سبھی کی آنکھوں میں خوابوں کے نئے جگنو جگمگانے لگے۔ وہ تصور میں مسلمانوں کے باہمی نفاق کے بعد لاشیں گرتی اور لہو اچھلتا دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

صیدہ میں قیام کافی خوشگوار ثابت ہوا تھا۔ روانگی کا وقت آیا تو حالات نے ایک غیر متوقع موڑ لے لیا۔ شمال کی جانب سے ہوائیں چلنے کا آغاز ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہوائیں طوفانی شدت اختیار کرنے لگیں۔

درگوت نے فوری طور پر جہازوں میں باہمی فاصلہ بڑھوا دیا تاکہ ہواؤں کی شدت ان جہازوں کے ٹکراؤ اور کسی تباہی کا سبب نہ بن جائے۔ اس کے بعد عیسائی غلاموں کو بھی چپو برداری سے سبکدوش کرکے جہاز سے اتروا لیا۔ یہ حکمتِ عملی اس صورت میں اختیار کی جاتی تھی کہ کسی بھی ناگہانی صورت میں یہ غلام جہاز لے کر فرار نہ ہوجائیں۔ ان احتیاطی تدابیر کے بعد درگوت کو شدید بارشوں کا خدشہ بھی لاحق تھا تاہم یہ تشویش جلد ہی زائل ہوگئی۔ تیز ہواؤں نے بادل رفع کردیے۔

صیدہ میں اس چار روزہ زائد قیام کے دوران کئی عیسائیوں نے درگوت، پیالی پاشا اور علوچی سے انفرادی طور پر ملاقاتیں کیں۔ علوچی اور پیالی پاشا نے بعد ازاں ان ملاقاتوں کا احوال درگوت کو سنا کر اس سے رائے بھی طلب کی۔

''امیر! کل میرے پاس ایک عیسائی عہدیدار جوزف آیا تھا۔ وہ چارلس، قلب، فرڈیننڈ اور پاپائے اعظم کی ٹولی کی مذمت کررہا تھا۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ ان تینوں کی حکمت عملی سے عام عیسائی سخت ناخوش ہیں۔'' علوچی نے بتایا۔

''اچھا اور کیا کہہ رہا تھا وہ عہدیدار؟'' درگوت نے بے نیازی اور قدرے بے تاثر سے انداز میں دریافت کیا۔

''اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایک مخصوص مذہبی طبقے نے عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین دانستہ طور پر تفرقہ پیدا کر رکھا ہے۔'' علوچی نے مزید بتایا۔

''اوہ.... تو اس کے کہنے کا مطلب ہے کہ عام عیسائی طبقہ اپنے مسلمان حکمرانوں سے بہت مطمئن اور خوش ہے۔'' درگوت نے لقمہ دیا۔

''جی ہاں، عام عیسائیوں کو مسلمان حکمرانوں سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' اس نے جوش سے کہا۔

''اور تمہیں لگتا ہے کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں۔'' درگوت کی اس بات پر علوچی جھجک کر خاموش ہوگیا۔

یہ خاموشی بذاتِ خود بہت بڑا اثباتی جواب تھی۔

''اگر تم ان باتوں کو حقیقت سمجھتے ہو تو تمہاری سمجھ اور فہم ابھی بہت خام ہے۔ یہ عیسائی عہدیدار صریحاً منافقت سے کام لے رہے ہیں۔ ان پر اعتبار کرنے کی غلطی سے بھی غلطی نہ کرنا۔'' درگوت نے سنجیدگی سے کہا۔

''کچھ عیسائی میرے پاس بھی آئے تھے۔'' پیالی پاشا بتانے لگا۔

''تمہیں کیا داستان سنائی انہوں نے؟'' درگوت نے دلچسپی سے پوچھا۔

''التجا کررہے تھے کہ انہیں بھی اپنے ساتھ اسکندریہ لیتے چلیں۔ وہ اپنے طور پر وہاں روانگی کے اہل نہیں ہیں۔ موسم کے تیور خطرناک ہیں۔'' پیالی پاشا نے تفصیل بتائی۔

''انہیں صاف انکار کردو۔'' درگوت نے جواب دیا۔ ''وہ ہمارے ساتھ کسی حفاظتی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اپنے تجسس سے مغلوب ہوکر جانا چاہتے ہیں۔ وہ کسی بھی طرح ہماری اصل منزل کے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہیں تاکہ بعد میں یورپ کی متحدہ قوت کو آگاہ کیا جاسکے۔''

پیالی پاشا نے مزید بحث سے گریز ہی کیا۔

درگوت کے اس بیڑے کا اگلا پڑاؤ اب غزہ تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد بھی بحری طوفان نے انہیں خاصے آزار میں مبتلا رکھا۔ غزہ میں قیام موسم کے حوالے سے ناخوشگوار رہا تاہم اس اعتبار سے خاصا سودمند ثابت ہوا تھا کہ درگوت کو مقامی افراد سے ملاقات اور ان کا نقطۂ نظر مکمل طور پر جاننے کا موقع ملا۔

ان مقامی افراد میں ایک ہی بات مشترک تھی کہ انہیں ترکوں سے بے حد شکایات تھیں۔ ان کی اکثریت ترکوں کو غاصب سمجھتی تھی۔ اس کے علاوہ سلطنتِ عثمانیہ سے ایک گلہ یہ بھی تھا کہ وہ عرب علاقے فتح کرکے وہاں ترک گورنر مقرر کردیا کرتے ہیں جنہیں مسائل و ثقافت سے رتی بھر بھی آگاہی نہیں ہوتی تھی۔ غزہ میں صالح رئیس کے بارے میں بھی خاصی غلط فہمیاں موجود تھیں۔ ان کا گمان بھی تھا کہ صالح کو محض عرب ہونے کی پاداش میں ترک بحریہ سے سبکدوش کیا گیا تھا۔

درگوت یہ سن کر تاسف زدہ ہوگیا۔ اس نے ان عربوں کو اصل حقائق سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کرلیا کہ صالح رئیس کو خیر الدین باربروسہ نے حیاتی پیشہ ورانہ ذمے داریاں سونپ کر بھیجا تھا لیکن اس نے وہاں عرب اتحاد اور عرب بحریہ کے قیام کی داغ بیل ڈال دی۔ ترک بحریہ سے اس بغاوت کے بعد اس نے اپنی عافیت اسی میں جانی کہ عیسائیوں سے راہ و رسم بڑھالی جائے۔

یہ باتیں واضح کرنے کے بعد درگوت نے اپنی اصل منزل کا رخ کرلیا۔ غزہ کے عیسائیوں کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو ان کے قدموں تلے سے گویا زمین ہی نکل گئی۔ انہوں نے فوری طور پر اپنے مخبر جربہ روانہ کردیے تاکہ انہیں درگوت کی پیش قدمی سے آگاہ کیا جاسکے۔

جربہ میں یہ اطلاع پہنچی تو وہاں ایک قیامت برپا ہوگئی۔ ڈیوک میڈینا، ڈوریا اور دیگر اعلیٰ عہدیدار حواس باختہ ہوگئے۔ ایسے طوفانی موسم میں انہیں اسپین اور یورپ سے بھی کوئی کمک نہیں مل سکتی تھی۔ بلند بانگ دعوے کرنے والے ڈیوک میڈینا کی ہوا بھی اکھڑ چکی تھی۔ وہ اپنے قریب [illegible] کو دیکھ کر سرد آہیں بھرا کرتا جو اس قدر محنت و جتن سے تیار کروایا گیا تھا لیکن اب ترکوں کے زیر تسلط آجاتا۔ ڈوریا کا تاسف بھی سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ اسے اپنی بے بسی، ناتوانی اور بڑھاپے کا احساس کچوکے لگانے لگا کہ اب وہ ماضی کی طرح پُرجوش توانائی سے دشمن کا مقابلہ کرنے کے بجائے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور تھا۔

مالٹا کے نائٹس کا ردعمل البتہ مختلف تھا۔ وہ مذہبی جوش و جذبے سے بے طرح مغلوب تھے۔ ان کے سربراہ نے ڈیوک میڈینا سے کافی بحث کی کہ وہ اس طرح میدان چھوڑ کر فرار ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ ڈیوک میڈینا نے

اسے جتنا سمجھایا کہ یہ وقتی پسپائی بھی جنگی حکمتِ عملی کا ہی ایک حصہ ہے۔ وہ بھرپور قوت اور شدت سے ترکوں کا مقابلہ کرنے میدان میں اتریں گے۔ میڈینا کی کوئی بھی بات ان کے فہم میں نہیں سما رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ترک بحریہ کا مقابلہ کرنے کے درپے تھا۔

ترک سپاہ کی آمد کی خبر جربہ میں عیسائیوں پر بجلی بن کے گری تھی۔ وہ شدید حواس باختہ ہو چکے تھے۔ انہیں کوئی بھی رستہ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ سب سے پہلے ڈوریا نے جربہ سے فرار حاصل کیا۔ اس کے بعد ڈیوک میڈینا نے اپنا بوریا بستر باندھ لیا۔ کچھ ہی وقت میں جہاز عیسائیوں سے بھر چکے تھے۔ ان میں سے ہر ایک جہاز کے عملے کی یہی کوشش تھی کہ وہ ترک سپاہ کی آمد سے پہلے جربہ سے روانہ ہو جائیں۔

اس صورت حال میں شدید بدنظمی دیکھنے میں آئی۔ بڑے جہاز، چھوٹے جہازوں کی راہ میں حائل تھے جس وجہ سے ان کے نکلنے کا راستہ مسدود ہو رہا تھا۔ میڈینا کا بحری بیڑا بھی بڑے جہازوں پر ہی مشتمل تھا۔ وہ اپنے عقب میں موجود جہازوں کو نظرانداز کیے قلعے کو آزردگی سے دیکھتا رہا۔ اس لمحے میڈینا کے دل و دماغ میں ایک ہی سوچ راسخ تھی کہ اس قدر اہتمام سے تعمیر کردہ قلعے پر ترک سپاہ قابض ہو جائے گی۔

اس ہنگامی بحران کے بعد میڈینا جربہ کے ساحل سے بالآخر روانہ ہو گیا۔ اس نے چند میل کی مسافت ہی طے کی تھی کہ جنوبی سمت سے سرخ ہلالی پرچم نمودار ہوتے دکھائی دیے۔ ان جہازوں کی کمان طلوچی کے ہاتھ میں تھی۔ کچھ ہی لمحوں میں شمالی سمت سے پیالی پاشا اپنے جہازوں کے ساتھ چلا آیا۔ قلب میں البتہ درگوت موجود تھا۔ وہ چھوٹے اور بڑے جہازوں کو پیش قدمی سے روک کر جنگ کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ جہازوں پر عیسائیوں کی ضرورت سے زیادہ تعداد جنگ میں خاصا آزار پیدا کر رہی تھی۔ درگوت کے جہازوں میں نصب توپوں کا رخ عیسائیوں کی جانب تھا۔ اس صورت میں وہ اپنے جہازوں میں قیام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اب ان عیسائیوں کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ جہاز خالی کر کے خشکی پر مسلمانوں کا مقابلہ کریں۔

ساحل پر مالٹا کے جنگجو اس مقابلے کے لیے پہلے ہی تیار تھے لیکن انتشار ایسا شدید تھا کہ انہیں بھی منظم ہونے کا بالکل وقت نہ ملا۔ ایک طرف عیسائی جہازوں کو ساحل کے قریب لے جانے کی کوششیں کر رہے تھے تو دوسری جانب ساحل پر پہنچ جانے والے عیسائی کو قلعے کی طرف بھاگنے کے جتن کر رہے تھے۔ ان افراد میں مقابلے کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ وہ اس مقابلے کو جبر اور مجبوری ہی گردان رہے تھے۔ اس صورت حال نے مالٹا کے جنگجوؤں کا جنگی توازن بھی بگاڑ دیا۔ ان منتشر عیسائیوں کی وجہ سے وہ اپنی صفیں درست نہ کر پا رہے تھے۔

دو طرفہ گولہ باری بھی جاری تھی۔ مالٹا کے جنگجو شدید جھنجلاہٹ کا شکار تھے۔ اب درگوت بھی ساحل پر اترنے کی کوششوں میں مگن تھا۔ مالٹا کے جنگجوؤں نے اسے وہیں روکے رکھنے کے جتنوں کا آغاز کر دیا۔ ان کی یہ کوشش اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی تھی کہ وہ پورے ساحل کا احاطہ کریں۔ اس کشمکش میں پیالی پاشا شمالی ساحل اور طلوچی جنوبی ساحل کی خشکی پر اتر کر بدحواس عیسائیوں سے نبرد آزما ہو گئے۔

جووا کو بحری جہازوں سے مسلمانوں کے خلاف مورچا سنبھالنے کا موقع مل گیا۔ درگوت نے اس چال کا توڑ بھی جلد ہی تلاش کر لیا۔ اس نے جہاز خالی کروا کے فوجیوں کو ساحل پر اترنے کا حکم دیا اور ملاحوں کو یہ جہاز شمالی و جنوبی سمت لے جانے کی تاکید کر دی تاکہ عیسائی بحریہ ان کا تعاقب کرے۔

پیالی پاشا اور طلوچی، درگوت کی حکمتِ عملی کے تحت مشرقی سمت سے سمندر میں آگے تک بڑھ گئے تاکہ جووانکیو کے جہازوں کا محاصرہ کیا جا سکے۔ ان کا یہ منصوبہ کامیاب رہا۔ شمالی اور جنوبی سمت میں درگوت کے جہازوں کا تعاقب کرنے والے جہازوں کو پیالی پاشا اور طلوچی نے گھیر کر گولہ باری کی زد میں لے لیا۔

اس گولہ باری کا آغاز ہوتے ہی درگوت کے جہاز بھی مڑے اور جووا پر دھاوا بول دیا۔ دو طرفہ گولہ باری نے جووانکیو کو چند گھنٹوں میں روند کر رکھ دیا۔ اس بربادی میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب جووا کے مسلمان غلاموں نے چپو برداری سے انکار کر دیا۔ مسلمان ابھی اس فتح پر ہی مسرور تھے۔ فاتحانہ سرشاری میں چور طلوچی، جووانکیو کو تلاش کرنے لگا لیکن اس کا کہیں کچھ پتا نہ تھا۔ اس وقت ان میں سے کسی کو بھی اندازہ نہ تھا کہ وہ خاموشی سے میدان سے روانہ ہو چکا ہے۔

اس محاذ پر کامیاب ہوتے ہی قلعے کے سامنے جاری جنگ میں شدت آ گئی۔ پیالی پاشا اور طلوچی بھی درگوت سے پہلے قلعے میں داخل ہونے کے درپے تھے۔ گولہ باری کا شور

ایسا ساعت شکن تھا کہ مقامی افراد نے جنگلوں کا رخ کر لیا۔ قلعوں کے عادی عیسائی بھی اپنی جان بچانے کے لیے انہی کے نقشِ قدم پر روانہ ہو گئے۔ مالٹا کے جنگجوؤں کا مقابلہ کرتے درگوت کو ایک بار تو دانتوں پسینا آیا تھا۔ تعداد میں کمی اور غیر منظم صورت حال کے باعث ان کی مزاحمت زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکی اور انجام کار یہ جنگ اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ درگوت نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ ہتھیار پھینک دینے والوں کو کسی بھی قسم کا گزند نہ پہنچایا جائے۔

میدانِ جنگ کے مناظر اب ہولناک دید پیش کر رہے تھے۔ ہر سُو لاشیں اور آہنی و آتشی ہتھیار بکھرے تھے۔ مزاحمت ترک کر دینے والوں کی گرفتاریاں عمل میں لائی جانے لگیں۔ درگوت کو اب جنوبی یورپ کے معززین کی تلاش تھی لیکن مخصوص لباس اور وضع قطع والے وہ معززین غائب تھے۔ درگوت، طلوچی اور پیالی پاشا کو بعد ازاں علم ہوا کہ فرار ہونے والے افراد میں یہی معززین اور امرا شامل تھے۔ انہوں نے عام سپاہیوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک کر اپنی زندگیاں بچائی تھیں۔

''فرار ہونے والوں میں زیادہ تر تعداد امرا اور معززین کی ہے۔ انہوں نے اپنے پیچھے لڑنے مرنے والے سپاہیوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔'' پیالی پاشا نے اسے بتایا۔

درگوت کو اس لمحے سخت تاسف محسوس ہوا۔ وہ اپنے سپاہیوں کی ایسی بے قدری کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی کسی بھی صورت حال میں وہ ان کی بقا کے لیے ہر ممکن طور پر انہی کا ساتھ دیتا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ طلوچی ایک نوجوان کے ہمراہ اس کے پاس چلا آیا۔

''یہ کسے اٹھا لائے ہو؟'' درگوت نے اس کی شخصیت کا بغور جائزہ لیا۔

''مجھے یہ نوجوان کسی خصوصی اہمیت کا حامل محسوس ہوا ہے۔ اس لیے اسے آپ کے پاس لے آیا ہوں۔'' طلوچی کہنے لگا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟ کہاں کے رہائشی ہو؟'' درگوت نے دریافت کیا۔

''آپ سب میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں ایک معمولی سا سپاہی ہوں۔''

اس اکھڑ جواب پر درگوت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ نوجوان کا یہ انداز ہی اس کی کوئی غیر معمولی حیثیت باور کروا دینے کے لیے کافی تھا۔

''جینوا کے رہنے والے ہو کیا؟'' درگوت نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے دوسرے سوال کے تحت پوچھا۔ اس کی نظریں نوجوان کے چہرے کے نقوش کھنگال رہی تھیں۔

''وہ ہمارا آبائی وطن ضرور تھا لیکن اب ہم بارسلونا میں رہتے تھے۔'' اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

''ڈوریا سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟'' درگوت نے فوری اگلا سوال داغ دیا۔

نوجوان کا چہرہ واضح طور پر متغیر ہوا۔

''عقیدت کا۔'' اس نے ایک توقف سے کہا۔ ''وہ ہمارے عظیم امیر البحر ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک انہی کی طرح شاندار کارنامے سرانجام دینا چاہتا ہے۔''

''لیکن تم میں سے ہر ایک کی مشابہت ساخت اور نقوش تو ڈوریا سے نہیں ملتے ہوں گے۔ کیا رشتہ ہے تیرا ڈوریا سے؟'' درگوت نے اس کے دلائل نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''کہیں یہ اس کا بیٹا تو نہیں ہے؟'' پیالی پاشا نے چونک کر کہا۔

''نہیں، بیٹا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے اپنے بڑھاپے میں یہ کم سن اولاد بے حد پیاری ہوتی اور وہ اسے کسی بھی طرح اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا۔'' درگوت نے اسے جواب دیا اور پھر نوجوان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''جووانکیو سے کیا رشتہ ہے تیرا؟''

''یہ کچھ نہیں بتائے گا امیر!'' طلوچی کے ہمراہ آئے دیگر قیدیوں میں سے ایک درمیانی عمر کا سپاہی بولا۔ ''میں بتاتا ہوں کہ یہ کون ہے۔''

درگوت، طلوچی اور پیالی پاشا چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

''یہ لڑکا ڈوریا کا نواسا ہے۔ ڈوریا تو اسے اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا لیکن یہ رضامند نہیں تھا۔''

''جووانکیو کہاں ہے؟ وہ بھی ڈوریا کے ساتھ ہی فرار ہوا ہے کیا؟'' درگوت نے طلوچی سے دریافت کیا۔

''اس بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں ہے۔'' طلوچی نے ہونٹ بھینچے۔ ''ہمارے آدمی اسے ہر جگہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اس کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔''

''لاشوں میں تلاش کیا تھا اسے؟'' درگوت نے پوچھا۔

''جی ہاں اور اب قیاس یہی ہے کہ وہ شاید سمندر

میں غرق ہونے والے جہازوں میں سے کسی ایک پر سوار تھا۔ جہاز کے ساتھ ہی ڈوب گیا ہوگا۔"

درگوت نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا اور قلعے کی تلاشی کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس قلعے سے مال غنیمت میں مال ودولت کے علاوہ ایسے پرچم بھی نکلے جن کی امتیازی حیثیت کافی نمایاں تھی۔ شاتین کی تشبیہ والا ایک پرچم پاپائے روم کا تھا جبکہ دوسرا اسپین کا شاہی پرچم تھا جو چارلس کے پاس ہمیشہ ہی دیکھا گیا تھا۔

"میں پاپائے روم کے اس پرچم پر کافی حیران ہوں امیر!" علوچی نے الجھ کر کہا۔ "ایک جانب وہ عدم تشدد کا سب سے بڑا داعی ہے اور دوسری جانب شاتین کی یہ تشبیہ کندہ کروائی گئی ہے۔ مجھے یہ بالکل دوہرا معیار لگتا ہے۔"

"یہ پرچم دراصل روڈس کا ہے جسے پاپائے روم سے منسوب کردیا گیا ہے۔" پیالی پاشا نے اپنی معلومات کا اظہار کیا۔

قلعے سے فراغت کے بعد درگوت نے ان عیسائیوں سے بھی ملاقات کی جنہیں میڈینا نے مقامی مسلمانوں کی ذہنی ومذہبی تسخیر کے لیے مامور کیا تھا۔ اب وہ افیون کے نشے کے زیر اثر رہتے ہوئے ہوش وحواس سے ہی بیگانہ ہوچکے تھے۔ درگوت کو ان کی حالت اور ذہنی شکستگی دیکھ کر تاسف محسوس ہونے لگا۔ وہ کبھی افراد بھی بہترین جنگجو رہے ہوں گے لیکن اب افیون کے خمار میں ہی زندگی بتا رہے تھے۔

ان افراد کو نظر انداز کیے وہ آگے بڑھے تو پیالی پاشا نے یکدم فرمائش جڑدی۔

"انہیں دلدلی جھیل کا وہ حصہ تو دکھایئے جسے سمندر سے ملا کر فرار کا راستہ بنایا گیا تھا۔"

درگوت انہیں دلدلی جھیل کے پاس لے گیا۔ اس نے پہلے انہیں وہ حصے دکھائے جنہیں کھود کر سمندری پانی اندر لایا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ گڑھے بھی دکھائے جہاں کھدی ہوئی مٹی پھینکی گئی تھی۔

"آپ کا ذہن لاجواب ہے امیر! ڈوریا آپ کے فرار کے بعد یقیناً سر پیٹ کر رہ گیا ہوگا۔" علوچی نے والہانہ انداز میں کہا۔

پیالی پاشا کو اس لمحے درگوت سے شدید حسد محسوس ہوا۔ اپنے اسی جذبے سے مغلوب ہوکر وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

"جب بقا کا معاملہ ہو تو انسان اضطراب میں ایسی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیا کرتا ہے۔"

"میں اسے اضطراری ردعمل نہیں مانتا۔" علوچی نے تردید کی۔ "ہزاروں آدمیوں سے منظم منصوبہ بندی کے تحت کام کروانا اور کامیابی سے فرار ہونا کوئی اتفاق ہرگز نہیں ہوسکتا۔"

"غلطی تو یہاں ڈوریا کی بھی تھی۔" پیالی پاشا نے مزید حسد کے تحت جواب دیا۔ "اسے تجربہ کار شخص کا یوں دھوکا کھانا عجیب تر لگتا ہے۔ توپوں کی گولہ باری ختم ہونے کے بعد اسے کس چیز کا انتظار تھا؟ وہ اگر ایسی حماقت کا مظاہرہ نہ کرتا تو دلدلی راستے سے فرار بھی ممکن نہ ہو پاتا۔ اگر ڈوریا کی جگہ میں ہوتا تو مجھے کوئی اس انداز میں دھوکا دے کر نکل ہی نہیں سکتا تھا۔"

درگوت کا چہرہ اہانت سے سرخ ہونے لگا۔ اسے پیالی پاشا کے انداز میں ذاتی توہین کا عنصر واضح محسوس ہوا تھا۔ وہ اس کی کامیابی کو ڈوریا کی کم فہمی اور غفلت کا شاخسانہ قرار دے رہا تھا۔ علوچی نے جب یہ صورت حال بھانپی تو معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے درگوت کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

"جربہ کی فتح کی خبر قسطنطنیہ میں دھوم مچادے گی۔ خاص طور پر یہ دونوں پرچم تو مدتوں تک دشمن کے سینے کا ناسور بنے رہیں گے۔"

"یہ کام پیالی پاشا اپنی مہم سے فراغت کے مطابق انجام دے لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ سلطان سلیمان کی پسند ناپسند ان سے زیادہ کون جانتا ہوگا؟" درگوت نے بے نیازی سے کہا۔

پیالی پاشا نے احساس تفاخر سے ہامی بھرلی۔ اس نے ایک کشتی اس انداز میں تیار کروائی کہ اس پر اسپین کے معزز قیدیوں کے علاوہ مال غنیمت رکھ کر دونوں پرچم بھی باندھ دیے گئے۔ ان پرچموں کے کنارے پانی سے مس ہورہے تھے۔ پیالی پاشا نے یہ کشتی ایک اور پاشا کے سپرد کی اور اس کی حفاظت کے لیے مسلح سپاہیوں پر مشتمل مزید دس کشتیاں بھی ہمراہ کردیں۔

درگوت کو اس انتظام میں واضح طور پر سقم محسوس ہوا تھا۔ "بالفرض غارت گر پرچموں کی حفاظت کے لیے اس کشتی پر لازماً حملہ کریں گے۔" اس نے پیالی پاشا سے اپنے خدشے کا اظہار کر ہی دیا۔

پیالی پاشا یکدم خاموش ہوگیا۔ انا جوابی مشورہ طلب کرنے پر بھی آمادہ نہ ہوئی تھی۔

"ان پرچموں کو اطالیہ تک پوشیدہ ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔" درگوت نے اس کی کیفیت بھانپ کر خود ہی کہہ دیا۔ "قبرص کے سامنے سے گزرتے ہوئے ان پرچموں کو نمائش کے لیے اسی انداز میں پانی کی سطح پر لٹکا دیا جائے۔

سفر طرابلس براستہ اسکندریہ کیا جائے۔ ساحلوں سے قریب تر ہی رہنا بہتر ہوگا۔"

درگوت کا یہ مشورہ پیالی پاشا کے دل کو لگا۔ اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا اور سفر کا آغاز ہوگیا۔

☆☆☆

جربہ کی فتح اور کشتیوں پر مال غنیمت کی خبریں پیالی پاشا کی قسطنطنیہ آمد سے پہلے ہی تجارتی جہازوں کے توسط سے وہاں پہنچ چکی تھیں۔ قیدیوں اور متوقع مال غنیمت کی آمد کی یہ خبریں قسطنطنیہ میں موجود عیسائیوں کے دل پر بجلی بن کر گری تھیں۔

انہی دنوں وہاں "اوگیر یوزبک" نامی فرڈیننڈ کا ایک نمایندہ بھی موجود تھا۔ وہ فرڈیننڈ کی جانب سے سلطان کے پاس صلح کی درخواست لے کر آیا تھا تاہم سلطان سے اس کی ملاقات ممکن نہ ہوپائی تھی۔ اسے جب جربہ سے جنوبی یورپی قیدیوں کی آمد کی اطلاعات ملیں تو وہ بھی شدید رنج محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بھی اگلے روز ساحل پر پہنچ گیا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اسے وہ مخصوص پرچم سرنگوں اور کناروں سے پانی میں مس ہوتے دکھائی دیے۔ اوگیر یوزبک کا دل دکھ سے بھر گیا۔ باقی سب نظارے یکدم ہی پیچھے نابود ہوگئے تھے۔ اس نے آن کی آن میں ان جھنڈوں کے حصول کا فیصلہ کرلیا۔

اس کے بعد اوگیر یوزبک نے قسطنطنیہ میں موجود اپنے شناساؤں سے روابط بحال کیے اور اس مخصوص کشتی کے پاشا سے ملاقات کی راہ نکال لی۔ اس ملاقات کا عذر یہ تھا کہ وہ جربہ کی اس عظیم الشان فتح کی تفصیلات جاننے کا خواہش مند ہے۔ روانگی سے قبل وہ ریشمی کپڑے کے دو تھان بطور تحائف اپنے ساتھ لے گیا۔

پاشا ان قیمتی تحائف اور اوگیر یوزبک کے شیریں انداز پر خود کو کافی زیر بار محسوس کرنے لگا۔ اس نے اپنے مہمان کو جربہ میں ہونے والے تمام تر واقعات بلاکم وکاست بیان کردیے۔ اوگیر یوزبک، ڈوریا اور ڈیوک میڈینا کے فرار اور ناقص حکمت عملی پر تاسف محسوس کرنے لگا تاہم اس دوران وہ پاشا کو اپنے اخلاق اور "وسعت نظری" سے مکمل گرویدہ بنا چکا تھا۔

"مجھے آپ سے ملاقات کرکے حقیقتاً بہت خوشی ہوئی ہے۔ آپ ایک نہایت نفیس اور شائستہ انسان ہیں۔ اگر مجھے آپ سے ملنے کا پہلے سے علم ہوتا تو آپ کے شایان شان کوئی تحفہ ضرور لے کر آتا۔" وہ تاسف سے کہنے لگا۔

"تحفہ مالیت سے ترجیح نہیں ہوتا۔ یہ تو دینے والے کے خلوص پر منحصر ہوتا ہے۔ مجھے آپ کے خلوص اور فیاضی پر بالکل کوئی شبہ نہیں۔ اس لیے اگر میں خود کچھ طلب کروں تو کیا آپ مجھے عنایت فرمائیں گے؟" وہ بھرپور شیرینی سے بولا۔

"ضرور میرے عزیز! کیوں نہیں، یہ تو میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہوگی۔" پاشا پرجوش ہوا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے وہ دو پرچم عنایت فرمادیں جو پانی میں بھگوتے ہوئے لائے گئے ہیں۔" اس نے مزید ملائمت اختیار کی۔

"ان پرچموں کا آپ کیا کریں گے بھلا؟" پاشا کو حیرت ہوئی۔

"میں انہیں بطور یادگار اپنے خاندانی اثاثے میں شامل کروں گا۔" اوگیر یوزبک معصومیت سے کہنے لگا۔

"لیکن وہ جھنڈے تو سلطان کی خدمت میں پیش کیے جانے ہیں۔" پاشا کو تامل ہوا۔

"سلطان کے لیے یہ جھنڈے چیتھڑوں سے زیادہ اہم کہاں ہوں گے؟" اس نے تحریک دی۔

"مجھے تو یہی ہدایات دی گئی ہیں۔" پاشا ہنوز متامل تھا۔

عجیب وغریب عادات

بعض مشاہیر کی عادات عجیب وغریب ہوتی ہیں مثلاً۔

☆ مشہور فرانسیسی مصنف وکٹر ہیوگو گھر میں داخل ہوتے اور جو بھی ذہن میں کوئی خیال آتا، لکھنا شروع کردیتے اور صفحات کو ادھر ادھر زمین پر گراتے جاتے۔

☆ امریکا کے ایک صدر جیمس گارفیلڈ یونانی زبان، بائیں ہاتھ سے اور لاطینی زبان دائیں ہاتھ سے تحریر کرتے تھے۔

☆ مشہور برطانوی داستان نویس، سر گلبرٹ پارکر اپنے سیکرٹری کو زبانی ٹائپ کرواتے اور آنکھوں کو رومال سے بند کرلیتے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ان کے خیالات مجتمع رہتے ہیں۔

☆ بیتھوون جو ایک بہت عظیم موسیقار گزرے ہیں، موسیقی کے اشارات اخبارات کے کناروں پر لکھتے تھے اور ہر وقت ان کاغذات کو جیب میں ٹھونسے رہتے تھے۔

(مرسلہ: حمیرا اقبال، کوٹری)

''ہدایات دینے والوں کو یہ علم نہیں ہوگا کہ سلطان کے لیے اب ان پرچموں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ چارلس کی بادشاہت تو فرڈینڈ کو منتقل ہو چکی ہے۔ فرڈینڈ آج کل آسٹریا میں مقیم ہے۔ بادشاہ سلونا کا قلب...... تو اب اس کی حیثیت بھی صرف اسپین کے بادشاہ سے زیادہ نہیں رہی۔'' اس نے ایک اور وار کھیلا۔
''لیکن یہ جھنڈے آپ کے کس کام کے ہیں؟'' پاشا نیم رضامند دکھائی دینے لگا۔
''میں نوادرات جمع کرنے کا شوقین ہوں اور یہ پرچم اپنے خزانے میں جمع کروں گا۔ بس اتنی سی بات ہے۔'' اوگیر یوزبک نے بھرپور معصومیت کا مظاہرہ کیا۔
پاشا لمحہ بھر کے لیے کسی سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے نقطہ نظر سے بھی پرچم بے مصرف ہی تھے۔ پاشا کے تئیں پرچموں سے زیادہ قسطنطنیہ سے آئے ان قیدیوں کی اہمیت تھی جن کی رونمائی شہر بھر میں ہونی تھی۔
''آپ میرا یقین کیجیے، سلطان ان پرچموں کے بارے میں بالکل استفسار نہیں کریں گے۔ وہ ایک عملی سوچ کے معاملہ فہم انسان ہیں۔ انہیں بھی علم ہے کہ جب چارلس کی بادشاہت ہی قائم نہیں رہی تو اس کے پرچموں کا کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟''
اوگیر یوزبک کی یہ دلیل کام کر گئی۔ پاشا نے جھنڈے بطور تحائف اسے تھما دیے۔
بعد ازاں اوگیر یوزبک کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ سلطان نے صرف معزز قیدیوں کے معائنے میں ہی دلچسپی ظاہر کی تھی۔ ان قیدیوں کو قسطنطنیہ کے بازاروں اور گلی کوچوں میں گشت کروایا گیا۔ شہری اس نمائش پر بے حد پرجوش اور درگوت کے لیے رطب اللسان تھے۔
رستم کے سینے پر ہر ایک لمحہ سانپ لوٹ رہے تھے۔ اس کے ہزار ہا جتنوں کے باوجود درگوت نے کامیابی سے ایک میدان اور مار لیا تھا۔ رستم ہر محاذ پر شکست در شکست کا سامنا کر رہا تھا۔ قیدیوں کی نمائش اور ان کی ستائش ہی کم نہ تھی کہ سلطان نے ایشیائے کوچک کے شہر میں اوگیر یوزبک سے ملاقات کی ہامی بھر لی۔ رستم ایک بار پھر تلملا کر رہ گیا۔ وہ تو قیصر کے اس نمائندے کو قسطنطنیہ تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا لیکن سلطان، فرڈینڈ کو اس کی اصلیت یاد کروانا چاہتا تھا کہ وہ ماضی میں سلطان کو خراج ادا کرتا رہا ہے اور آج بھی اس کے نزدیک فرڈینڈ کی حیثیت یہی ہے۔ اوگیر یوزبک نے بے چون و چرا سلطان کی بات تسلیم کر لی اور اس سے چھ ماہ کا معاہدۂ امن حاصل کر لیا۔

☆☆☆

جربہ کی شکست ایسی معمولی نہ تھی کہ اس کا تکمیل بہ اثرات محسوس نہ کیے جاتے۔ چارلس کو شدید خدشہ لاحق تھا کہ جربہ فتح کرنے کے بعد سلطنت عثمانیہ اسپین پر حملہ آور ہو سکتی تھی۔ وہ بے بسی محسوس کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکتا تھا کیونکہ کہنہ سالی اور گٹھیا کے مرض نے اسے جنگ یا دفاع تو درکنار گھوڑے پر سوار ہونے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔
دوسری جانب ڈوریا کی شکستگی کا عالم بھی نرالا تھا۔ اس نے جربہ سے واپسی کے بعد اپنے آبائی وطن جینوا میں قیام کیا تھا۔ دل میں کہیں نہ کہیں یہ آس اب بھی سلامت تھی کہ اس کا بھتیجا اور نواسا کسی روز واپس آملیں گے لیکن اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ حالات اس قدر ہولناک صورت حال اختیار کر جائیں گے۔ جربہ میں ہونے والی تباہی نے اسے اعصابی طور پر مزید شکستہ کر دیا۔ چند ماہ بعد جربہ سے بچ نکلنے والے چند افراد نے اسے جیوانکیو کے غیاب اور نواسے کی گرفتاری کی خبریں سنائیں تو اس کے اعصاب بالکل ہی جواب دے گئے۔ بڑھاپے، علالت اور ان دلخراش خبروں نے اس کا پیمانہ برداشت لبریز کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ غشی میں مبتلا ہو چکا تھا۔
ڈوریا کے احباب نے اسے تشویش سے گھیر لیا اور ہوش میں لانے کے مختلف جتن کرنے لگے۔ اب اس کے بدن کو جھٹکے لگنے کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس نیم غشی میں اس کے ہونٹوں سے چند الفاظ برآمد ہو رہے تھے۔
''تین ہزار سکے...... درگوت...... کاش...... میرا لالچ...... آج...... نہ ہوتا۔''
احباب اس کی حالت پر مزید تشویش زدہ ہو گئے۔ وہ اسے ہوش میں لانے کے جتن کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد ڈوریا قدرے ہوش میں آ گیا۔
''خداوند کا شکر ہے کہ آپ نے آنکھیں کھول دیں۔ ہم سب کس قدر پریشان ہو گئے تھے۔'' اس کے ایک دیرینہ ساتھی نے کہا۔
ڈوریا پژمردگی سے مسکرایا اور اپنی آنکھیں چند لمحوں کے لیے موند لیں۔ اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں دوبارہ کھولیں اور نقاہت سے کہنے لگا۔
''میں گرجا گھر میں جا کر پادری صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے فوراً لے چلو وہاں۔''
ڈوریا کی یہ فرمائش بلا تامل قبول کر لی گئی۔ گرجا گھر

پہنچ کر ڈوریا کی طبیعت زیادہ ابتر دکھائی دینے لگی۔ اس کا تنفس غیر متوازن ہو جاتا۔
''میں آپ کے سامنے کچھ اعترافات کرنا چاہتا ہوں مقدس باپ! شاید اس کے بعد میرا آخری سفر کچھ آسان ہو جائے۔'' ڈوریا نے ہانپتے ہوئے کہا۔
پادری نے تاسف سے اس کی جانب دیکھا اور ہمدردانہ انداز میں پانی کا ایک گلاس تھما دیا۔ ڈوریا نے مشکور نگاہوں سے اسے دیکھا اور بے تابی سے پانی پینے لگا۔
''کیا اعترافات کرنا چاہتے ہو تم؟'' پادری نے نرمی سے دریافت کیا۔
ڈوریا نے چند لمحوں کے لیے اپنے خیالات مجتمع کیے اور آزردگی سے کہنے لگا۔
''سمجھ نہیں آرہا کہ کیا بتاؤں آپ کو۔ مختصراً بس یہ کہوں گا کہ میں پہلے ایک کامیاب قزاق تھا۔ کچھ عرصہ تو اس قزاقیت میں بیت گیا پھر وہ وقت آیا جب مذہب کو میری ضرورت پیش آگئی۔ میں نے خود کو خوش قسمت سمجھتے ہوئے شہنشاہ چارلس کی جانب سے امیر البحر کا عہدہ قبول کر لیا۔ اس وقت سب یہی سمجھتے رہے کہ میں یہ سب کچھ مذہب کے تحفظ اور بقا کے لیے کر رہا ہوں۔ وہ ایسا سمجھتے رہے اور میں نے انہیں سمجھنے بھی دیا۔ حقیقت تو صرف میں ہی جانتا تھا۔ میں نے اپنے ذاتی مفادات کو ہمیشہ بلند تر رکھا لیکن بظاہر مذہب کی خدمت کا لبادہ بھی اوڑھے رکھا۔ درگوت کی گرفتاری کے بعد میں بہت خوش تھا۔ میری تجربہ کاری بھانپ گئی تھی کہ وہ شخص مستقبل میں عیسائیت کے لیے بہت بڑا ناسور ثابت ہوگا۔ کچھ عرصے بعد چارلس نے اسے تین ہزار طلائی سکوں کے عوض رہا کر دیا۔ میں بظاہر چارلس سے بحث کیا کرتا۔ درگوت کی رہائی کے خلاف احتجاج کرتا لیکن درون خانہ حالات کچھ اور ہی تھے۔ اس وقت اگر میں چاہتا تو کسی بھی طرح کوشش کر کے درگوت کو زندگی سے محروم کروا سکتا تھا لیکن اب پھر لالچ میرے آڑے آ گیا۔ میں نے درگوت کی رہائی کے لیے فرانس کے امیر البحر سے پندرہ ہزار طلائی سکے حاصل کیے ہوئے تھے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہی کہاں تھا کہ درگوت ہمارے لیے کس قدر عذاب ثابت ہونے والا ہے۔ درگوت نے عیسائیت کو جتنے زخم پہنچائے ہیں اس سب کا ذمے دار میں ہوں۔ اب جربہ میں تباہی کی ایک نئی داستان رقم ہوئی ہے۔ یہاں بھی میں خود کو ہی قصوروار سمجھتا ہوں۔ میں چاہتا تو جربہ میں رہ کر مقابلہ کر سکتا تھا لیکن میری بزدلی آڑے آ گئی اور میں نے راہ فرار اختیار کر لی۔ جربہ کے اس سانحے میں وہاں موجود ہزاروں عیسائیوں کی موت اور گرفتاریوں کی اصل وجہ میں ہوں۔ میرے دل پر شدید بوجھ ہے مقدس باپ! میرے حق میں دعائے خیر کیجیے تاکہ میں اپنی آخری منزل تک سکون سے پہنچ سکوں۔''
ڈوریا کے خاموش ہوتے ہی پادری نے حسب روایت دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور زیر لب مناجات کرنے لگا۔ ڈوریا کے چہرے پر سکون چھا گیا۔ اس نے متشکرانہ انداز میں پادری کے ہاتھ تھامے اور آنکھیں موند لیں۔ پادری خاموشی سے دعا میں مصروف رہا۔ کچھ دیر بعد ڈوریا کے ہاتھ سرد ہو گئے۔ پادری نے اس کے ہاتھوں کو نرمی سے ایک جانب کیا اور اس کے احباب کو طلب کر کے جسد خاکی لے جانے کے لیے کہہ دیا۔

☆☆☆

جربہ کی فتح تاریخی ثابت ہوئی۔ بحیرۂ روم اور افریقی ساحلوں سے تمام عیسائی بے دخل ہو چکے تھے۔ یورپ کے بحری جہاز بھی اب راستہ بدلنے پر مجبور تھے۔ جبرالٹر سے طرابلس تک افریقا میں عیسائیت کے مراکز قائم کرنے کے خواب دیکھنے والوں کے لیے صورت حال ایسی ابتر تھی کہ اب انہیں طانجہ کے سامنے سے گزر کر مغربی افریقا کا چکر کاٹنے کے بعد ہی جنوب کی خلیج راس امید تک پہنچنے میں مہینوں بیت جایا کرتے۔
درگوت نے بارباروسہ کا بہترین جانشین ثابت ہوتے ہوئے پورے بحیرۂ روم کو اپنے زیر تسلط کر لیا تھا تاہم ایک خلش اب بھی برقرار تھی۔ صالح رئیس جانے کہاں روپوش ہو چکا تھا۔ بھرپور تلاش کے بعد بھی اس کا کوئی سراغ مل کے ہی نہ دے رہا تھا۔ درگوت ہر قیمت پر اسے بازیاب کرنا چاہتا تھا۔ صالح رئیس کے ذمے بہت سے قرضوں کی ادائیگی تھی۔

☆☆☆

شاخ زریں میں اس وقت قدرے تناؤ کی کیفیت تھی۔ سلطان پیشانی پر بل لیے گہری سوچ میں غرق تھا۔ کچھ لمحوں بعد پیالی پاشا نے اذن باریابی دریافت کیا۔ اسے سلطان نے ہی طلبی کا حکم دیا تھا۔
ابتدائی تسلیمات کے بعد سلطان کہنے لگا۔
''شامی ساحلی شہروں سے موصول ہونے والی خبریں اچھی نہیں ہیں۔''
''جی ہاں سلطان معظم! مخبروں کی جانب سے متواتر اطلاعات موصول ہو رہی ہیں کہ سمندروں میں سات سرخ

کشتیاں اچانک ہی کسی جانب سے نمودار ہو کر بحری جہازوں میں لوٹ مار کے بعد غائب ہو جاتی ہیں۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ سمندر پر درگوت بلاشرکت غیرے حاکم ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کوئی ایسی جسارت کیسے کرسکتا ہے؟'' پیالی پاشا کی اُلجھن فطری تھی۔

''یہ کام درگوت کے حوالے ہی کردو تو بہتر ہے۔ مجھے بہرصورت ان کے متعلق مکمل معلومات درکار ہیں۔'' سلطان نے زور دیا۔

''میں اس سے رابطے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ آج کل طرابلس میں کہیں مصروف ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اگر درگوت سے رابطہ نہیں ہوتا تو علوچی سے کام لیا جاسکتا ہے۔''

پیالی پاشا اس حکم پر بھی مضطرب ہوگیا۔ اسے علم تھا کہ علوچی بھی درگوت کے ساتھ ہی ہے۔ سلطان سے رخصت ہو کر کافی سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن میں بحری امور کے ایک اور ماہر ''مصطفیٰ رئیس'' کا نام آیا۔ پیالی پاشا نے اسے فوراً اپنے پاس بلوایا اور اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

''ان کشتیوں کے بارے میں کچھ اڑتی اڑتی خبریں میں نے بھی سنی تو ہیں۔'' مصطفیٰ کہنے لگا۔

''تم فوری طور پر ایک مناسب بحری بیڑا تیار کرو اور جتنی بھی کشتیاں پکڑ سکو، انہیں قسطنطنیہ روانہ کردو۔''

مصطفیٰ اس حکم پر قدرے متذبذب ہوگیا۔

''مجھے بحری میدان میں وارد ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ میرے لیے بحیرۂ روم کی وسعتیں ناآشنا ہیں۔''

''میں جانتا ہوں لیکن جزائر اُنجین سے اسکندریہ تک کے راستوں سے تو تم واقف ہو نا؟'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''شاہی یا خصوصی اہمیت کے حامل جہازوں کی حفاظت و نگرانی تم ہی کیا کرتے ہو۔ قبرص، کریٹ، قونیہ، انطاکیہ، حلب، صیدہ، صور اور غزہ تم سے ڈھکے چھپے بالکل نہیں ہیں۔ یہ سرخ کشتیاں بھی انہی حدود میں دیکھی گئی ہیں۔''

مصطفیٰ نے گہری سانس بھر کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ ان سرخ کشتیوں کی جانب سے ایک اور واردات سامنے آئی۔ اسکندریہ سے قسطنطنیہ بھیجا جانے والا قیمتی سامان غزہ کے سامنے لوٹ لیا گیا تھا۔ اس جہاز میں سلطان کے لیے بھی چند قیمتی تحائف موجود تھے۔ اس لوٹ مار اور فرار کے کئی لوگ چشم دید گواہ تھے۔ ان افراد کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اس حرکت کا ذمے دار سسلی ہے۔ یہ شبہ تقویت میں اس وقت تبدیل ہوا جب کشتیوں کا رخ سرقوسہ کی جانب ہوگیا۔ سرقوسہ کے متعلق یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ وہاں چارلس کے بھائی فرڈیننڈ اور بیٹے فلپ کا اثر و رسوخ رہا ہے۔

پیالی پاشا نے حلب کے سامنے موجود مصطفیٰ سے رابطہ کیا۔ مصطفیٰ فی الفور غزہ پہنچا اور ساحل پر اترتے ہی تحقیقات کا آغاز کردیا۔ وہ سب سے پہلے ان لٹیروں کی وضع قطع کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔

''عجیب الخلقت لوگ تھے وہ۔ ان کے گلوں میں طلائی اور نقرئی صلیبیں تھیں۔'' چند افراد نے بتایا۔

''حلیے کیسے تھے ان کے؟ لباس کیسا پہن رکھا تھا؟'' مصطفیٰ نے اگلا سوال کیا۔

''لباس تو تین چار صدیوں قبل کا محسوس ہوتا تھا۔''

اس جواب پر مصطفیٰ سوچ میں پڑ گیا۔

''کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ؟'' اس نے خود کلامی کی۔ ''سرقوسہ اور سسلی میں اس وضع قطع کے لوگ تو نہیں پائے جاتے۔''

''لباس دانستہ طور پر بھی تو ایسا پہنا جاسکتا ہے۔'' اس کے نائب نے جواب دیا۔ ''آپ ان کی طلائی اور نقرئی صلیبوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچ رہے ہیں؟''

''سوچ تو رہا ہوں۔ چارلس کی زندگی اور دورِ اقتدار میں سسلی پر اسی کے نمائندے حکومت کرتے رہے ہیں۔'' اس نے سسلی کا امکان ذہن میں رکھ کر کہا۔

''جی ہاں، چارلس کو ہمیشہ ہی پاپائے روم کی حمایت اور اعانت حاصل رہتی ہے۔ یورپ بھر کے عیسائی اس کی زبان سے ادا ہوا لفظ خدائی احکامات سمجھ کر تسلیم اور عمل کرتے ہیں۔''

''متاثرہ جہاز کا عملہ میرے پاس بھیجو۔ میں ان سے بھی کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔'' مصطفیٰ نے اپنے نائب سے کہا۔

اس حکم کی فوری تعمیل کردی گئی۔

''تم لوگ ایک طویل عرصے سے بحری سفر کرتے رہے ہو۔ مختلف علاقوں کے لوگوں سے ملتے رہے ہو۔ ان کشتیوں کے افراد کی زبان و انداز اور وضع قطع کیسی تھی؟'' مصطفیٰ نے دریافت کیا۔

''ایک بات تو طے ہے امیر! وہ کافی مذہبی سوچ و نظریات کے حامل تھے۔ ان کا پس منظر یقیناً مذہبی تھا۔'' ایک شخص کہنے لگا۔

''کیا تم نے انہیں ایسا کچھ کہتے سنا یا کرتے دیکھا؟'' مصطفیٰ چونکا۔

''وہ بار بار ایک ہی بات کہہ رہے تھے کہ وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے ہیں اور مستقبل میں بھی مسلمانوں کے خلاف ایسی ہی مہمات سرانجام دیتے رہیں گے۔''

اس انکشاف نے مصطفیٰ کو لمحہ بھر کے لیے سوچ میں مبتلا کردیا۔

''اگر یہ حملہ آور واقعی سسلی سے تعلق رکھتے ہیں تو ہم کوئی جوابی کارروائی نہیں کرسکتے۔ یہ حکومتی معاملات ہیں۔ ان سے صرف سلطان سلیمان ہی نمٹ سکتے ہیں۔'' اس نے اپنے نائب سے کہا۔

جوابی طور پر نائب نے بھی اس کی تائید کردی۔

''امیر! میں ان کے لباس کی بابت کچھ بتانا چاہتا ہوں۔'' ایک اور شخص نے کہا۔

مصطفیٰ فوری طور پر اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''کیسا لباس پہنا تھا انہوں نے؟''

''بارھویں صدی عیسوی کے صلیبی جنگجوؤں جیسا۔ میں نے کئی یورپی ممالک کی سیاحت کی ہے۔ وہاں آج بھی مذہبی جنگجو ایسا ہی لباس پہنتے ہیں۔ کارسیکا اور سرڈانیا کی پرانی خانقاہوں، گرجاؤں میں بھی ایسے لباس میں ملبوس لوگ دیکھ رکھے ہیں میں نے۔'' وہ پُریقین تھا۔

''یعنی یہ لٹیرے ان قدیم گرجاؤں اور خانقاہوں کے راہب بھی ہوسکتے ہیں۔'' مصطفیٰ نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

اگلے کئی روز اسی تحقیقات میں بیت گئے لیکن مزید معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ چاروناچار اس نے جہاز کے عملے کو قسطنطنیہ روانگی کی تجویز دی تاکہ وہ سلطان سلیمان کو سسلی سے جواب طلبی کے ممکنہ معاملے سے آگاہ کرسکے۔

اس کے بعد مصطفیٰ نے خود اسکندریہ کا رخ کرلیا۔ اس کے پیشِ نظر مزید معلومات کا حصول تھا۔ اسکندریہ کی بندرگاہ پر اس کی ملاقات چند ایسے افراد سے ہوئی جنہوں نے وہ سرخ کشتیاں دیکھ رکھی تھیں۔ کشتیاں مقامی اور نادار مسلمانوں کو اسی طرح اغوا میں کام میں لائی جاتی تھیں جیسے [illegible] ماضی میں اسپین کے ساحلی شہروں سے مسلمانوں کو مکھن سے بال کی طرح نکال لایا کرتے تھے۔

ان مغویان میں ایک بات یہ بھی مشترک تھی کہ وہ بھی افراد معماری کے پیشے سے تعلق رکھتے تھے اور وہ ماضی قریب میں جربہ کے قلعے کی تعمیر میں بھی حصہ لے چکے تھے۔

مصطفیٰ کو مسافت کے لیے اب نشانِ منزل مل گیا۔

اسی سلسلے میں جب وہ جربہ پہنچا تو اغوا شدہ بارہ افراد کے اہلِ خانہ سے فرداً فرداً ملاقات کی۔ یہاں بے شمار انکشافات اس کے منتظر تھے۔ مصطفیٰ کو ان اغواکاروں کے مزید حلیے کا علم ہوا۔ ان کی داڑھیاں جھاڑ جھنکاڑ، گلے میں طلائی و نقرئی صلیبیں اور چہرے خشونت زدہ تھے۔ آنکھیں سخت درندگی کا تاثر دیتی تھیں۔ چند ایک کھالوں سے بنے لباس میں بھی ملبوس تھے۔ وہ کسی بھی طور مہذب دنیا کے باشندے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ زبان اور لب و لہجے کے بارے میں البتہ اتنا معلوم ہوا تھا کہ وہ کسی انجان زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ ان لٹیروں کے اطوار خاصے وحشیانہ تھے۔ مغویان کی کسی بھی مزاحمت کے نتیجے میں وہ انہیں تشدد کا نشانہ بنانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

اس کے بعد مصطفیٰ رئیس کو ایک ایسی بات کا علم ہوا جس نے اس کی سابقہ رائے پر مہرِ تصدیق ثبت کردی۔ چند لٹیروں نے روانگی سے قبل قرآن پاک کی بے ادبی بھی کی تھی۔ یہ اس بات کا واضح عندیہ تھا کہ وہ اسلام دشمن عناصر ہی تھے۔ ان معلومات کے بعد مصطفیٰ کو یہ بتایا گیا کہ لٹیروں کی سرخ کشتیوں کا رخ شمالی سمت تھا۔

ان معلومات کی روشنی میں مصطفیٰ نے تیونس جانے کا فیصلہ کرلیا۔

''امیر! تیونس میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملے گی۔'' اس کے نائب نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''کیوں نہیں ملے گی؟'' مصطفیٰ کو طیش آیا۔

''وہاں ہم سے بالکل تعاون نہیں کیا جائے گا۔ جتنی معلومات مل گئی ہیں، بس اسی پر اکتفا کیجیے اور انہی کی روشنی میں کوئی حکمتِ عملی مرتب کرلیں تو بہتر ہے۔'' نائب نے خلوص سے مشورہ دیا۔

''جو بھی ہو، تیونس تو میں پہنچ کر ہی رہوں گا۔'' وہ پُرعزم تھا۔

تیونس پہنچتے ہی نائب کے خدشات درست ثابت ہوگئے۔ وہاں کے حاکم نے خاصی سرد مہری سے ان کا استقبال کیا اور سرخ کشتیوں کے بارے میں کسی بھی بات کا علم ہونے سے انکار کردیا تھا۔

''میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا امیر! یہ لوگ ہم سے تعاون نہیں کریں گے۔ اب حاکم کو بھی کسی بات کا علم نہیں ہے۔'' نائب کہنے لگا۔

''تمہیں واقعی ایسا لگتا ہے کہ اسے کچھ علم نہیں ہے؟ اس کے پاس یہاں تیونس میں حلق الوادی جیسی شاندار بندرگاہ ہے، بے شمار کشتیاں اور جہاز ہیں۔ یہ کشتیاں کھلے سمندر میں سفر بھی کرتی ہوں گی پھر ایسا کیسے ممکن ہے کہ انہیں آج تک سرخ کشتیاں نہ دکھائی دی ہوں؟'' مصطفیٰ ہنسا۔

حاکم تیونس اور مصطفیٰ ریس کی بحث اگلے روز بھی جاری رہی۔ حاکم نے ایک بار پھر یہ کہہ کر کسی بھی تعاون سے انکار کر دیا کہ مصطفیٰ کی مطلوبہ کشتیاں تیونس سے ملحقہ بندرگاہوں میں حملہ آوری کے خوف سے کبھی بھی دکھائی نہیں دیں گی۔

”یعنی تم چاہتے ہو کہ اب قسطنطنیہ سے کوئی حکم موصول ہو۔“ مصطفیٰ نے سرد مہری سے کہا۔

حاکم تیونس خاموش ہو گیا۔ مصطفیٰ مزید گویا ہوا۔

”بہرحال میں ایک ڈیڑھ ہفتہ یہیں مقیم رہوں گا۔ اس دوران تمہاری کشتیاں سمندر میں گشت کرتی رہنی چاہئیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری مطلوبہ کشتیاں انہیں ضرور دکھائی دے جائیں گی۔“

”آپ ایک ڈیڑھ ہفتہ رہیں یا ایک ڈیڑھ سال، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

حاکم کے اس بے نیاز جواب پر مصطفیٰ کے دل میں ہزار ہا خدشات جنم لینے لگے۔ اسے یقین کی حد تک شبہ ہو چکا تھا کہ حاکم تیونس اس کے لیے بالکل سود مند ثابت نہیں ہوگا۔ اس تلاش کا ذمہ اسے خود ہی اٹھانا پڑے گا۔

”میں قلعے کا ایک حصہ آپ کے حوالے کر دیتا ہوں۔ امید ہے یہاں آپ کا وقت بہت اچھا گزرے گا۔“ حاکم نے اس کی اکتاہٹ اور خدشات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

مصطفیٰ نے کسی بحث سے گریز کیا اور خود ہی کھلے سمندر میں روانگی کا ارادہ کر لیا۔ اس نے شمالی حصوں میں واقع مختلف چھوٹے جزائر کو کھنگالنے کا سوچا جہاں عیسائی زیادہ تعداد میں آباد تھے۔

پہلے ہی جزیرے ”گوزو“ میں یہ مشکل پیش آئی کہ مقامی افراد کا تعلق جرمن نسل سے تھا اور وہ ترکی و عربی زبانوں سے ناواقف تھے۔ مصطفیٰ نے اپنے ایک ایسے ساتھی ”ترگوت علی“ کی مدد حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا جسے ہنگری سے تعلق ہونے کی بنا پر جرمن زبان آتی تھی۔ اس نے مقامی افراد سے بات چیت کی اور یہ انکشاف کیا کہ وہ لوگ ترکوں اور سلطان سلیمان سے سخت نفرت کرتے تھے۔

یہ انکشاف مصطفیٰ ریس کے لیے خاصا تکلیف دہ تھا۔ اس نے ترگوت علی سے کہہ کر ان خاندانوں کے کچھ افراد اپنے پاس طلب کر لیے تاکہ ان کے ذہنوں سے نفرت کے جالے صاف کر سکے۔

یہ امر مصطفیٰ کی سوچ سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ نو وارد افراد تعاون کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ وہ ترگوت کو سرخ کشتیوں کی بابت بتانے کے بجائے نہایت رعونت سے ایک ہی بات کہتے رہے کہ ترک نہ خود سکون سے رہتے ہیں اور نہ یورپی ممالک کے عیسائیوں کو سکون سے زندگی گزارنے دیتے ہیں۔ یہ مقامی افراد ترکوں کو آزار کے سوا کچھ بھی نہ سمجھتے تھے کیونکہ ان کے تئیں جنگ کا دیوتا ہر وقت ان کے ہمراہ رہا کرتا تھا۔

مصطفیٰ کی دھمکیوں اور تنبیہ کے باوجود وہاں کسی قسم کی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ مصطفیٰ کا ذہن کھول رہا تھا۔ اسے اتنا اندازہ بہرحال ہو گیا تھا کہ یہ لوگ بہت کچھ ضرور جانتے ہیں اور اپنے بغض و عناد کی بنا پر ان کی پردہ پوشی کر رہے ہیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دیا اور روانگی سے کچھ لمحے پہلے ایک نوجوان کو نہایت صفائی و ہوشیاری سے غائب کروا لیا۔ یہ کام ایسی مہارت سے کیا گیا تھا کہ جزیرے کے بقیہ افراد کو نوجوان کے اغوا کا علم ہی نہ ہو سکا۔

مصطفیٰ کے درشت تیور، کسی نامعلوم منزل کی طرف روانگی اور اپنی غیر یقینی رہائی کا سوچ کر نوجوان کی سٹی گم ہو رہی تھی۔ اسے یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ ان مسلمانوں سے تعاون کے بغیر اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس نے خوفزدگی کے عالم میں ترگوت علی کی تفتیش پر انکشافات کیے کہ ان کی مطلوبہ ساتوں سرخ کشتیاں سسلی سے نمودار ہوتی ہیں۔ وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو یکساں طور پر اپنی لوٹ مار کا نشانہ بناتی ہیں۔ ان کے حلیے اور گلوں میں صلیب کے مقدس نشانات کی وجہ سے عیسائی ان کی بابت رازداری برتتے تھے۔ نوجوان سے مزید تفتیش کے بعد انہیں علم ہوا کہ سسلی میں کسی قلعے کی تعمیر کا کام جاری تھا جس کے باعث وہ مسلمانوں کو بیگار میں کام کے لیے اغوا کرتے تھے۔ مصطفیٰ کو اب صورت حال کچھ واضح ہوتی محسوس ہونے لگی۔ اس نے حسب وعدہ نوجوان کو رہا کر دیا۔

سرخ کشتیوں کے اسرار کی دھند پہلی بار چھٹتی محسوس ہوئی تھی۔ اب مصطفیٰ منتظر تھا کہ اس دھند کے پار سے کیا کچھ ظہور میں آتا تھا۔

(جاری ہے)

ماخذات

تاریخ افریقہ، سلیمان عالی شان، تاریخ تیونس، تاریخ سلاطین ترکیہ

قاتل کی چالاکیوں اور معصوم بے ضرر انسانوں کے مابین معرکہ آرائی

مشاہدہ

عتیق بخاری

اکثر خاموش طبع لوگوں کا مشاہدہ بہت گہرا ہوتا ہے اور اس بات کو اس کی فطرت نے ثابت بھی کر دیا جب اپنے ہی درمیان رہنے والے ساتھیوں کا مشاہدہ کیا تو اندازہ ہوا کہ قاتل کوئی باہر سے نہیں آیا بلکہ انہی میں سے کوئی ہے اور وہ کوئی کون ہے؟ اس کی نشاندہی اسی خاموش رہنے والی اسٹوڈنٹ نے کر دی جس کی خاموشی ہمیشہ نشانے پر رہتی تھی۔

میڈم سوزی کی لاش لان میں پڑی تھی اور سب اردگرد کھڑے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے لیے یہ ناقابلِ یقین منظر تھا۔ خوبصورت لان اس وقت بڑا بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ دو روز قبل لان میں نئے پودے لگانے کی غرض سے ایک حصہ تیار کیا گیا تھا۔ اس بھربھری مٹی پر ہی میڈم سوزی کا مردہ وجود پڑا تھا۔ ہاتھ پاؤں، سر کے بال مٹی میں لتھڑ گئے تھے۔ پولیس پہنچ چکی تھی۔ چند میڈیا والے بھی تھے۔ ضروری کارروائی کرتے ہوئے لاش

پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی گئی۔

"سب سے پہلے کس نے لاش کو دیکھا؟" پولیس آفیسر نے سب لوگوں کو اکٹھا کر کے سوال کیا جو اس وقت اس بلڈنگ میں موجود تھے۔

"میں نے دیکھا تھا [illegible]۔"

میڈم سوزی کے بائیس تئیس سالہ بیٹے رکی نے روئی روئی آواز میں کہا۔ "میں صبح اٹھا اور معمول کے مطابق ایکسرسائز کے لیے لان میں آ گیا اور یہاں آتے ہی..... یہ سب....."

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر رونا شروع کر دیا۔

"آپ کے اور آپ کی ممی کے کمرے میں کتنی دوری ہے؟ کیا آپ کو رات یا صبح کے کسی پہر کوئی غیر معمولی آواز سنائی دی؟ آپ کی کسی سے دشمنی ہے؟ کیا کوئی ایسا ہے جسے میڈم کی جان کا دشمن کہا جا سکتا ہے؟" مختلف سوال کیے جا رہے تھے اور رکی کے پاس ہر سوال کا جواب "نفی" میں تھا۔

"ہم تو نہایت عام سی اور بغیر کسی مخالفت کو پالے زندگی گزار رہے ہیں۔ ممی کی تو اس بلڈنگ میں رہنے والوں اور آس پاس کے لوگوں سے بہت دوستی ہے۔ ان کی کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ نہ جانے کس نے انہیں مار ڈالا۔" رکی آنسو پونچھ رہا تھا۔

"پہلے تو ہم سمجھے کہ شاید وہ اچانک گر گئی ہیں اور یہ حادثہ ہے۔ میڈم سوزی اس بلڈنگ کی سب سے اوپر کی منزل پر رہتی ہیں اور کسی نہ کسی کام کے لیے ریلنگ کے قریب رہنا پڑتا تھا اس لیے ہمارا خیال تھا کہ شاید کسی طرح توازن کھو کر گر گئی ہیں لیکن غور کرنے پر پتا چلا کہ ان کے سر اور کنپٹیوں پر ضربیں لگی ہوئی ہیں یعنی کسی نے پہلے سر پر کچھ مار کر دھکا دے کر گرا دیا۔ ہمیں تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ایسی واردات کس نے اور کیوں کی ہے؟ ان میں تو ایسا کچھ بھی نہ تھا کہ وہ قتل کی جاتیں۔" میگ نے بتایا۔ اس کے چہرے پر بہت دکھ تھا۔ میڈم سوزی کے بہیمانہ اور بے گناہ قتل پر وہ بے حد افسردہ نظر آ رہا تھا۔

میڈم سوزی ایک بہت بڑی تین منزلہ اسٹوری بلڈنگ کی مالکہ تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد انہوں نے خود اپنے بیٹے رکی کے ساتھ بالائی منزل پر رہائش اختیار کر لی اور نچلی دونوں منزلیں مختلف لوگوں کو کرائے پر دے دیں۔ لوگ آتے جاتے رہے پھر میگ نامی میوزک ٹیچر نے میوزک اکیڈمی بنانے کے لیے دونوں نچلی منزلیں حاصل کر لیں۔ معقول کرایہ ملنے لگا۔ میگ نے یہ عمارت اس لیے لی تھی کیونکہ یہ بہت محفوظ علاقے میں ہونے کے ساتھ ساتھ پرسکون جگہ پر تھی اور کشادہ ہونے کی وجہ سے اس کے کمروں، برآمدوں میں آرام سے ڈسٹرب ہوئے بغیر کام کیا جا سکتا تھا۔ میوزک اکیڈمی بناتے ہی میگ نے اپنے چند میوزک سیکھنے والے اسٹوڈنٹس کو جو دور کے شہروں سے آئے تھے، وہیں رکھ لیا یعنی چند کمرے بطور ہاسٹل استعمال ہونے لگے۔ لڑکے لڑکیاں، کک، مالی رکھے گئے اور گیٹ پر میگ کے مشورے سے سیکیورٹی گارڈ بھی رکھا گیا۔ قریبی اسٹوڈنٹس کے جانے کے بعد شام کو کسی کا بھی عمارت میں داخلہ اتنا آسان نہ تھا۔ صرف عمارت کے رہائشی یعنی بلڈنگ میں رہائش پذیر میوزک سکھانے اور سیکھنے والے، ان کا کک، صفائی کرنے والا، لان کی دیکھ بھال کرنے والا، میڈم سوزی اور رکی ہی آ جا سکتے تھے۔

میڈم سوزی بہت خوش تھیں۔ ان کی آمدن کا بہت اچھا اور معقول اور تقریباً مستقل ذریعہ پیدا ہو گیا تھا۔ میڈم سوزی خود بھی میوزک میں کافی دلچسپی لیتی تھیں۔ وہ اکثر کبھی دونوں منزلوں پر پائی جاتی تھیں۔ لڑکے لڑکیاں میوزک سیکھنے کے لیے پریکٹس کرتے تو وہ انہیں نہایت خوشی سے سنتیں۔ اکیڈمی مالک میگ جو کہ بہت اچھا میوزیشن تھا، کے علاوہ میوزک ٹیچرز لوتھی، جیروم اور جانسن سے بھی میڈم سوزی کی خوب دوستی ہو گئی۔ ایک بار شہر میں ہونے والے کسی میوزک مقابلے میں حصہ لینے والے سنگرز کا انتخاب کرنا تھا۔ میڈم سوزی نے میگ سے پوچھا کہ کیا وہ اس سلسلے میں کوئی مشورہ دے سکتی ہیں؟ اثبات میں جواب ملنے کے بعد انہوں نے چند لڑکے لڑکیوں کے نام فائنل کر دیے جنہوں نے وہ میوزک مقابلہ جیت لیا۔ مسٹر میگ بہت خوش ہوئے اور میڈم سوزی سے درخواست کی کہ آئندہ بھی وہ ایسی لسٹ بنانے میں ان کی مدد کریں۔ میڈم سوزی بہ خوشی رضامند ہو گئیں۔ ان کی ہر میوزک اسٹوڈنٹ سے گپ شپ تھی سوائے اپنا کے..... اور اس کی وجہ بھی اپنا کا بہت کم گو اور احمقانہ انداز میں ایک سائڈ پر بیٹھے رہنا۔ وہ میوزک کلاس لینے اپنے حصے کا کام کرنے کے بعد یوں ایک طرف ہو کر بیٹھ جاتی جیسے اسے کسی سے کوئی غرض ہی نہ ہو اور نہ اس کی کسی سے شناسائی ہو۔ وہ اپنے اردگرد غور سے نہ جانے کیا دیکھتی رہتی۔

"کیا کرے گی یہ لڑکی؟" میڈم سوزی اور مسٹر میگ اکثر ہنستے۔

"مجھے تو لگتا ہے کسی کنسرٹ میں محض اس وجہ سے

ہمارا گروپ پیچھے رہ جائے گا کہ اپنا راسٹن گانا گاتے گاتے اچانک خاموش ہو کر ایک طرف غور سے کچھ دیکھنے لگے گی اور دیکھتی رہے گی..... بغیر کسی کی پروا کیے۔" میڈم سوزی نے اپنا کی طرف دیکھتے ہوئے بات کی۔ اس وقت اپنا راسٹن بڑا سا نظر کا چشمہ لگائے سامنے دیوار کو نہ جانے کیوں گھور رہی تھی۔ وہ اس وقت کسی میوزک اسٹوڈنٹ کے بجائے کوئی بوڑھی سی لڑکی لگ رہی تھی۔

اکیڈمی میں موجود باقی لڑکیوں لزا، سارا، بیٹرس وغیرہ کے اپنا کے متعلق خیالات میڈم سوزی جیسے ہی تھے۔ وہ اکیڈمی سے کچھ فاصلے پر رہتی تھی جو کلاس کے وقت آتی اور کلاس ختم ہوتے ہی واپس گھر چلی جاتی۔ رکی ہیلو ہائے کرنے کے علاوہ وہ کچھ نہیں کرتی تھی۔ سب لڑکے لڑکیاں اپنا پر حیران تھے کہ ایک سنگر کا مستقبل کیسے ہو سکتا ہے؟

مسٹر میگ، لوتھی، جیروم، جانسن میوزک سکھاتے ہوئے اپنا کام کر رہے تھے۔ میوزک مقابلے یا کنسرٹ کے لیے سنگرز کا انتخاب میڈم سوزی کے ذمے آ گیا تھا کیونکہ وہ یہ ذمے داری انتہائی سمجھ داری سے نبھا رہی تھیں۔ سب معمول کے مطابق ہو رہا تھا کہ پتا چلا شہر میں ایک بہت بڑا میوزک کنسرٹ ہونے والا ہے۔ اس کے منتظمین نے بہت بڑے کنسرٹ کے انعقاد کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بہت عظیم الشان پروگرام تھا۔ ملک بھر کے علاوہ تین دیگر ممالک سے بھی گلوکار آ رہے تھے۔ کئی قسم کے مقابلے تھے۔ مختلف کیٹیگریز کے لیے انعامات کا اعلان کیا گیا۔ انتہائی پرکشش انعامی رقوم ملنا تھیں۔ اس کنسرٹ میں شرکت کرنے کا مطلب تھا، بہت زیادہ شہرت، قابل ذکر پیسا اور بہت بڑی کامیابی۔ سب نئے پرانے سنگرز جنونی ہو کر اس کنسرٹ کا حصہ بننے کے لیے محنت کرنے، ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔

میڈم سوزی کی بلڈنگ میں قائم میوزک اکیڈمی میں بھی ہلچل مچ گئی۔ مسٹر میگ نے تمام میوزک ٹیچرز، اسٹوڈنٹس اور میڈم سوزی کو اکٹھا کر کے اس کنسرٹ کے متعلق بات کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ہر حال میں بیسٹ پرفارمنس دے کر اپنا کام سب کو دکھانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بیسٹ چیزیں تیار کی جائیں۔ سب لڑکے لڑکیاں تیاری کریں اور پھر ان سب میں سے ان لوگوں کا چناؤ کیا جائے جو مقابلے میں جیتنے کے قابل ہوں۔

مسٹر میگ نے کہا کہ پہلے کی طرح میڈم سوزی ہی لسٹ تیار کریں گی اور وہی حتمی لسٹ ہوگی۔ میڈم سوزی مکان مالکن ہونے کے ساتھ ساتھ اس اکیڈمی کا حصہ بھی بن گئی تھیں۔ دن رات محنت اور ریہرسل کی جانے لگی اور پھر کنسرٹ سے پہلے وہ دن آ گیا جب میڈم سوزی نے کہا کہ آج رات وہ کنسرٹ میں جانے والے ناموں کی فہرست بنائیں گی اور صبح مسٹر میگ کو دے دیں گی لیکن اس صبح اکیڈمی والوں کو فہرست کے بجائے ان کی لاش ملی اور اب تفتیش جاری تھی۔

میڈم سوزی کا پوسٹ مارٹم مکمل ہونے اور لاش سے نمونے لینے کے بعد ان کی آخری رسومات ادا کر دی گئیں۔ رکی اور اکیڈمی انتظامیہ و سنگرز کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ کنسرٹ میں حصہ لینے کا خیال بھی جا رہا۔ مسٹر میگ شدید غم و غصے میں تھے کہ کون ہے وہ ظالم انسان جس نے ایک طرف تو ایک بے گناہ عورت کا قتل کیا اور دوسری جانب اتنے بڑے پروگرام میں ان کی اکیڈمی کی شرکت مشکوک کر کے ایک سنہری موقع تباہ کر ڈالا۔ وہ چاہ رہے تھے کہ قاتل ان کے سامنے آ جائے اور وہ اسے کچا چبا جائیں۔

"رکی! میڈم تمہاری ممی تھیں، تم اس لیے غمزدہ ہو لیکن ان کی موت میرے لیے بھی بہت بڑا نقصان ہے۔ وہ میری مخلص دوست اور میرے کام کا اہم حصہ بلکہ یوں کہو کہ چارم بن چکی تھیں۔ بہت برا ہوا ہمارے ساتھ..... بہت ہی برا۔ کاش وہ قاتل میرے ہاتھ آ جائے تو میں..... میں....." مسٹر میگ کی آنکھوں میں غم اور ناکامی کے آنسو اور شدید غصہ تھا۔ وہ مٹھیاں بھینچ رہے تھے۔ رکی سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ اچانک ملنے والے غم نے اسے ادھ موا سا کر دیا تھا۔ لزا، سارا، بیٹرس، اپنا راسٹن، مسٹر لوتھی، جانسن، جیروم اور دیگر میوزک اسٹوڈنٹس بھی موجود تھے۔ سب آئندہ کے لیے سوچ رہے تھے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ گیٹ پر سیکیورٹی گارڈ کی موجودگی کی وجہ سے کوئی باہر والا اندر آ ہی نہیں سکتا۔ گیٹ پر نصب کیمرے نے بھی ایسا کچھ نہیں دکھایا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ قاتل عمارت کے اندر موجود لوگوں میں سے کوئی تھا یا کوئی نہایت ہوشیاری سے گیٹ بند ہونے سے پہلے اندر آ کر چھپ گیا اور پھر موقع دیکھ کر میڈم کا قتل کر دیا۔ قاتل کون ہے؟ قتل کی وجہ کیا ہے؟ باہر سے کوئی عمارت میں کیسے آ کر واردات کر گیا اور اگر کوئی باہر کا آدمی نہیں تو پھر اندر والا کون ہے؟

یہ سوال، جواب طلب تھے اور جواب ڈھونڈے

جارہے تھے۔ پولیس سب کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے تفتیش کر رہی تھی۔ میڈم سوزی کے کمرے سے لے کر ریڈنگ، ان کے استعمال کی اشیا، سیل فون، سب کو کڑے طریقے سے چیک کیا گیا۔ کچھ بھی ایسا نہ ملا جس سے قاتل کا سراغ ملتا۔ میڈم سوزی کے قتل کو تقریباً ہفتہ ہو چکا تھا۔ مسٹر میگ لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اکیڈمی میں کلاس دوروز بعد شروع ہونا تھی۔

"میڈم کے افسوسناک قتل کے بعد سوگ میں بند ہونے والا کام پھر سے شروع ہونے والا ہے۔" لوتھی نے میگ سے کہا۔

"ہاں، شروع تو ہو رہا ہے لیکن افسردگی بہت ہے..... لوتھی! نہ جانے مجھے کیوں لگتا ہے کہ قاتل ہمارے بہت قریب ہے اور ہم بے وقوف اسے دیکھ نہیں پا رہے لیکن کوئی بات نہیں۔ میں خود کوشش شروع کرنے والا ہوں۔ میں نے میڈم کے بیٹے سے ان کے کمرے میں جانے کی اجازت لے لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ضرور ایسا کچھ ڈھونڈ لوں گا جو قاتل تک پہنچنے میں میری مدد کرے۔" مسٹر میگ بہت سنجیدہ ہو چکے تھے۔

لوتھی نے حیرت سے مسٹر میگ کو دیکھا اور کندھا جھٹکاتے ہوئے بولا۔ "پریشان مت ہوں مسٹر میگ! جلد معاملہ حل ہو جائے گا۔" مسٹر میگ سرہلاتے ہوئے اٹھے اور عمارت کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئے۔

اگلی صبح مسٹر میگ اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے مردہ پائے گئے۔ وہ کمرے کے دروازے اور راہداری کے درمیان اس طرح گرے ہوئے تھے کہ ان کا سر کمرے میں اور ٹانگیں باہر تھیں۔ انہیں بھی سر پر وزنی چیز مار کر قتل کیا گیا تھا۔ صفائی کرنے والے نے ان کی لاش کو سب سے پہلے دیکھا تھا۔ وہ حواس باختہ سا ہو گیا۔ ابھی میڈم سوزی کے قتل کا معاملہ حل نہیں ہوا تھا کہ ایک اور قتل ہو گیا۔ اکیڈمی میں غم اور خوف مزید بڑھ گیا۔

"مسٹر میگ کا قاتل وہی ہے جس نے میڈم سوزی کی جان لی ہے۔" سب کی زبان پر یہی تھا۔

"لگتا ہے کوئی اس میوزک اکیڈمی کا دشمن ہے۔ اسے بند کروانا چاہتا ہے اور وہ یہ ظالمانہ کام کر رہا ہے۔" سنہرے بالوں والی بیٹرس بولی۔ پولیس والے نے چونک کر اس میوزک اسٹوڈنٹ کو دیکھا جو بھورے چیک والی شرٹ اور وائٹ جینز میں بہت معصوم سی لگ رہی تھی۔

"آپ اس پہلو سے تفتیش کیوں نہیں کرتے آفیسر؟" اس نے مزید بولتے ہوئے کہا۔

مسٹر میگ کے قتل کو دو روز ہو گئے تھے۔ پولیس نے تفتیش کا دائرہ اکیڈمی میں موجود لوگوں سے بڑھا کر باہر تک وسیع کر دیا تھا۔ ایک ایک میوزک ٹیچر، میوزک اسٹوڈنٹ کو شک کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ اس وقت ہال میں وہ تمام لوگ موجود تھے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس اکیڈمی سے تھا۔ میوزک سیکھنے سکھانے والے، سویپر، کک، سکیورٹی گارڈ، سب سے سخت سوالات کیے جا رہے تھے۔ خصوصاً سکیورٹی گارڈ سے کیونکہ وہ باہر سے آنے والے قاتل کو عمارت کے اندر آنے میں مدد دے سکتا تھا۔

"مسٹر چارلی! کیا آپ کو یقین ہے کہ میڈم سوزی اور مسٹر میگ کے قتل والی رات کوئی بھی غیر متعلقہ یا مشکوک فرد عمارت کے اندر نہیں آیا؟" آفیسر نے سکیورٹی گارڈ سے سوال کیا۔

"نہیں سر! کوئی نہیں آیا اور یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔" چارلی نے دھیمے لیکن مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"اگر پتا چلتا ہے کہ تمہاری ڈیوٹی میں ذرا سی بھی اونچ نیچ ہو جائے تو کسی بھی قسم کا ناخوشگوار واقعہ تمہاری ہی غفلت بلکہ سنگین جرم کہلائے گا۔" آفیسر نے کڑے تیور دکھاتے ہوئے کہا۔ چارلی ان تیوروں کو اور ان کے مطلب کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

"میں نے کہا نا کہ میں نے کسی مشکوک فرد کو اندر آتے نہیں دیکھا اور نہ ہی اپنی ڈیوٹی نبھانے میں کوئی بے ایمانی کی ہے اور آپ گیٹ پر نصب کیمروں کی ریکارڈنگ بھی دیکھ چکے ہیں کہ سب عمارت میں روزانہ آنے والے ہی دونوں اموات کے دنوں میں عمارت میں داخل ہوئے ہیں۔ آپ میری بات کی سچائی کے لیے جتنی مرضی چاہے چھان بین کر سکتے ہیں۔" چارلی کی باتوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔

"سر! آپ ہماری اکیڈمی کے مخالفین کے بارے میں کیوں نہیں سوچ رہے؟ بیٹرس نے بھی ابھی آپ کی توجہ ادھر دلائی تھی۔" میوزک اسٹوڈنٹ لزا نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہم اس پہلو پر بھی کام کریں گے۔ فی الحال آپ سب اپنا دھیان رکھیں۔ غیر ضروری طور پر ادھر ادھر نہ جائیں۔ ہم نے آپ کی سکیورٹی کا بندوبست کر دیا ہے۔ تینوں اسٹورز پر پولیس والے دھیان رکھیں گے۔" آفیسر نے کہا۔ اسی دوران لوتھی ایک دم بولا۔

"آفیسر! مجھے یہ کسی مخالف کا کام نہیں لگتا۔ آپ اس طرف وقت ضائع کرنے کے بجائے باقی پہلوؤں پر ہی نظر رکھیں۔ ایسا نہ ہو تاکہ قاتل ہماری توجہ اصل معاملے سے ہٹا کر دوسری جانب مبذول کروا دے کر ہمیں مزید نقصان پہنچا دے۔"

"لیکن سر! آپ کسی مخالفت کو کیوں نظر انداز کر رہے ہیں۔ پیشہ ورانہ رقابت میں کئی بار ایسے واقعات ہو چکے ہیں۔" ایک اسٹوڈنٹ نے کہا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی بیٹرس اور لزا کے خیالات سے متفق ہے۔

"کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ ہماری میوزک اکیڈمی نے کچھ عرصے سے اچھی کارکردگی دکھا کر سب کو حیران کیا ہے لیکن ابھی ہم اس مقام تک نہیں پہنچے کہ کوئی ہمیں بہت بڑے مقصد کے حصول میں رکاوٹ سمجھے۔ اس لیے میں اس امکان کو مسترد کرتا ہوں۔" لوتھی نے اپنی بات کو اچھے طریقے سے سمجھایا۔ ایڈرا لسٹن حسب معمول بڑے سے فریم میں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

سوال جواب کا سلسلہ ختم ہوا۔ پولیس جا چکی تھی۔ لوتھی و دیگر میوزک ٹیچرز سر پکڑے سوچ رہے تھے کہ اس میوزک اکیڈمی کو فی الحال بند کر دیا جائے یا نہیں اور یہ حل کر دیا جائے۔ پریشانی و خوف نے انہیں گھیرا ہوا تھا۔ سب چپ چاپ بیٹھے اپنی اپنی جگہ جانے کیا اندازے لگا رہے تھے۔

"رکی کہاں ہے آج کل؟ اس نے مسٹر میگ کو میڈم سوزی کے کمرے میں جانے کی اجازت دی تھی۔ اس سے پوچھو کیا مسٹر میگ نے اس رات....."

جاسن خاموشی توڑ کر بول ہی رہا تھا کہ لوتھی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "نہیں، بے چارے میگ کو اس رات کچھ بھی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مجھے رکی نے بتایا تھا۔" وہ کچھ دیر رکا اور پھر بولا۔ "ابھی تو سب اپنے ہی لوگ بیٹھے ہیں۔ میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں سنسنی اور سسپنس سا تھا۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"دیکھو، یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ بہت زیادہ غلط ہو چکا ہے۔ ہمارے دو اہم ترین لوگ..... بے دردی سے قتل کر دیے گئے ہیں اور آگے کیا ہوگا؟ یہ سوال کئی خدشات پیدا کر رہا ہے۔ خوف و ہراس کی فضا میں سب رک کر رہ گیا ہے۔ ہم سب اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگے ہیں۔ پولیس ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے اور ہمیں اپنے قریب کھڑا کوئی بھی شخص مشکوک لگ رہا ہے۔ رات کو کمرے میں اس طرح دبک جاتے ہیں جیسے اگر دروازہ کھول دیا تو کوئی ہمیں بھی مار ڈالے گا۔ ڈر ڈر کر، سہم سہم کر، پولیس کے سوالوں کے جوابات دے دے کر ہم تھک چکے ہیں اس لیے میں نے ایک فیصلہ کیا ہے کہ میں..... مسٹر میگ والا کام کروں گا۔ یعنی آج میں میڈم کے کمرے کے علاوہ رکی کے کمرے اور لاؤنج، کچن تک کو خود چیک کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں یہ کام کامیابی سے کر لوں گا۔" لوتھی نے کہا تو سب کی آنکھیں حیرت و خوف سے کھل گئیں۔

"سر! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" بیٹرس تقریباً چیخ پڑی۔ "کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ سر میگ کے ساتھ کیا ہو چکا ہے پھر بھی آپ وہی غلطی کر کے قاتل کو مشتعل کر رہے ہیں۔ پلیز رک جائیے۔" وہ التجا کر رہی تھی۔

"لوتھی! کیا پاگل ہو گئے ہو؟ پولیس تفتیش کر رہی ہے نا۔ تم انہیں ان کا کام کرنے دو۔ کیوں مزید مسائل پیدا کرنا چاہتے ہو۔ کچھ کرنا ہے تو اپنی حفاظت کرو اور یہی کام سب کو کرنا چاہیے۔" جاسن نے تیز لہجے میں کہا۔

"نہیں، میں نہیں رکوں گا۔ میں اپنی اکیڈمی میں خوف کی فضا ختم کر کے یہاں روشنی بکھیرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں پھر سے یہاں میوزک پر کام ہو، پھر سے قہقہے گونجیں۔ میڈم سوزی اور مسٹر میگ کا ادھورا کام، ادھوری خواہش پوری ہو۔ میں..... میں..... اس میوزک اکیڈمی کو پھر سے فعال کرنا چاہتا ہوں۔ چاہے مجھے کتنے ہی خطرات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔" لوتھی مکمل جذباتی ہو چکا تھا۔

"اور اگر اس میں تمہاری جان چلی گئی تو..... تو پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے پھر ہم تمہاری ادھوری خواہش و خواب کو پورا کرنے کے لیے جان جوکھم میں ڈالیں؟" جیروم اسے سمجھا رہا تھا۔ اس کا لہجہ کافی طنزیہ تھا۔

"سر! ہمیں پولیس کی کارکردگی کو ہی دیکھنا چاہیے کہ کیا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی سراغ لگا لے گی۔" لزا نے بڑے یقین سے کہا۔

"میرے خیال میں ہمیں یہ اکیڈمی کچھ روز کے لیے بند کر دینا چاہیے اور کوئی نئی عمارت ڈھونڈ کر اس میں شفٹ ہو جانا چاہیے۔ خوف سے میرا تو برا حال ہے۔ مجھے نہیں لگتا ہم یہاں مزید کام کر پائیں گے۔" یہ بیٹرس تھی۔ ایڈرا لسٹن نے اس کی جانب غور سے دیکھا جبکہ جیروم، جاسن اور لوتھی کے ماتھوں پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔

"بیٹرس! ہم کیوں بھاگیں اپنی جگہ چھوڑ کر۔ نہیں، یہ غلط ہوگا۔ ہرگز نہیں اور اگر کچھ لوگوں کے مطابق ہمارے

کہ لفظیں ہمیں نقصان پہنچا رہے ہیں تو پھر تو ایسا کرنا انہیں خوش کرنا ہی کہلائے گا۔ یہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہوگی کہ اکیڈمی ختم ہوگئی یا گھبرا کر دوسری جگہ منتقل کردی گئی۔" جانسن نے کہا۔ اس کے دل میں درد سا اٹھ رہا تھا کہ چند دن پہلے جہاں میوزک کا شور زندگی کی رونق پیدا کرتا تھا، آج وہاں خوفزدہ کردینے والے سناٹے نے ویرانی پھیلا دی ہے۔

بیٹرس چپ چاپ جانسن کی بات سنتی رہی اور پھر لوتھی کے پاس چلی گئی۔ کچھ لوگ جو باہر کے تھے، وہ جا چکے تھے۔ صرف اینا رالسٹن موجود تھی جو پانی کی بوتل کو منہ لگائے بیٹرس، لوتھی، لزا، جینا اور جانسن کی گفتگو سن رہی تھی۔ پانی پیتے پیتے وہ یکدم رکی اور اس کی آنکھیں تھوڑی سی پھیل گئیں۔ وہ کئی دنوں سے جو اندازے لگا رہی تھی، وہ اسے ٹھیک لگنے لگے۔ وہ بوتل دوبارہ منہ کے پاس لے کر گئی ہی تھی کہ اسے پھر رکنا پڑا اور چونکنا پڑا۔ وہ کچھ دیر اپنے سے کچھ ہی فاصلے پر موجود لوگوں کی باتیں سنتی رہی اور ساتھ ہی کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے غور کرتی رہی۔

"تو کیا میڈم سوزی اور سرمیگ کے بعد لوتھی کی باری ہے.....؟" اس نے دل کر سوچا اور بوتل کا بچا ہوا پانی ایک ہی سانس میں پی لیا۔

کیا میرے اندازے اور یہ جملے آپس میں کوئی تعلق رکھتے ہیں؟

کیا واقعی قاتل ہمارے بہت قریب ہے؟

کہیں میں ضرورت سے زیادہ تو نہیں سوچ رہی؟

اگر اس پہلو پر نظر رکھی جائے تو کوئی نتیجہ نکل سکے گا؟

اینا کے ذہن میں سوال سر ابھار رہے تھے۔ وہ اٹھی اور سب کو بائے بولتی ہوئی ہال سے باہر نکل آئی۔ باہر آکر وہ ہال کے دروازے کی طرف واپس مڑی اور غور سے کسی جانب دیکھا۔

☆☆☆

رات خوب گہری ہو چکی تھی۔ بلڈنگ میں سناٹا تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے یا سونے کی کوشش میں تھے۔ میوزک اکیڈمی میں صرف وہ لوگ موجود تھے جو یہاں رہتے تھے۔ باہر کے تمام اسٹوڈنٹ اپنے اپنے گھروں میں تھے سوائے اینا رالسٹن کے..... کمرے کی لائٹ آف تھی۔ زیرو بلب کی مدھم روشنی میں اینا ایک الماری کے ساتھ چپک کر کھڑی تھی۔ اس کی نظریں دروازے کی جانب تھیں۔ اس کے ہاتھ میں کافی موٹا ڈنڈا اٹھا رکھا تھا۔ وہ کسی بھی ممکنہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ اس کے باوجود اسے گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کئی بار اپنے ماتھے سے پسینا صاف کر چکی تھی۔ اینا جس الماری کے پاس کھڑی تھی، وہ دروازے کے قریب تھی۔ اینا بار بار ڈنڈے کو یوں اوپر اٹھاتی جیسے ضرورت پڑتے ہی اس کا استعمال کرلے گی۔ کمرے میں موجود دوسرے شخص کے پاس بھی ہتھیار تھا یعنی پستول۔ وہ کھڑکی سے کچھ پرے کھڑا اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ بھی کافی ہیجان اور سنسنی میں تھا۔ بالکل خاموش و ساکت کھڑے دونوں کسی کا انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆

کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک انسانی وجود باہر نکلا۔ منہ پر نقاب اور ہاتھوں پر دستانے تھے۔ ہاتھ میں لوہے کی موٹی سلاخ تھی۔ اس نے اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ احتیاط سے اچھی طرح بند کر دیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے نچلی منزل کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ وہ تین سیڑھیاں نیچے آکر اوپر کی جانب دیکھ کر گویا تسلی کی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ بغیر قدموں کی آواز پیدا کیے وہ انسانی وجود مختلف کمروں کے سامنے سے گزرتا ہوا ایک کمرے کے سامنے رک گیا۔ چند سیکنڈ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اس نے اس دروازے کو نہایت آہستگی سے کھٹکھٹایا۔ صاف لگ رہا تھا اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ کمرے کے اندر آنے والا آواز سنے، باقی لوگوں کی نیند خراب نہ ہو یا وہ ڈسٹرب نہ ہوں۔ دستک کرتے ہی وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہوگیا اور لوہے کی راڈ پر گرفت مضبوط کرلی۔

☆☆☆

اینا رالسٹن اپنے دل کی دھڑکن سنتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کیا جو اس نے سوچا تھا، وہ درست ثابت ہوگا؟ ان دونوں کو کمرے میں تصویر پوز میں کھڑے کافی دیر ہو چکی تھی۔ تینوں منزلوں کے کمروں کے بند ہونے اور رات کی تاریکی و خاموشی طاری ہوجانے کے بعد وہ ایکشن میں آگئے تھے۔ ان کا ایکشن تھا مختلف جگہوں پر کھڑے ہو کر کسی کا انتظار کرنا۔ محض ایک اندازے، ایک مفروضے، شک کی بنیاد پر وہ یہ کام کر رہے تھے۔ اینا نے اپنے اندازے، شک کو جتلایا تو بھی اس کو ان جملوں نے اس پہلو پر غور کرنے پر مجبور کیا جو اس نے دن بارہ گھنٹے قبل اپنے کانوں سے سنے تھے: "آئے گا..... کوئی ضرور آئے گا۔" اس نے

خود کو یقین دلایا۔ "لیکن اگر آج وہ نہ آیا تو؟" اس کے اندر سے ایک سوال نے اٹھ کر خوا مخواہ اسے پریشان کردیا۔ کمرے میں موجود دوسرا فرد بھی کم و بیش ایسے ہی خیالات میں گھرا ہوا تھا۔ اینا نے اس کی جانب دیکھا۔ مدھم روشنی میں بھی اسے اس کے تاثرات واضح نظر آرہے تھے۔ اینا نے اپنے ہاتھ اور آنکھوں کو تسلی دینے والے انداز میں جنبش دیتے ہوئے اسے گویا امید دلائی کہ آج کامیابی مل سکتی ہے۔ کھڑے ہو کر اتنی تھکاوٹ نہیں ہوئی جتنا اعصابی تناؤ نے نڈھال کر دیا تھا۔ اینا نے چند سیکنڈ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اچانک اسے اپنے شانے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں موجود دوسرا فرد اس کے قریب کھڑا تھا۔

"ڈر گئیں کیا تم، اینا؟" اس نے بے تکا سوال کیا۔ لہجہ نہایت دھیما تھا۔

"موجودہ پوزیشن میں اور کیا کرسکتی ہوں؟" اینا نے جواباً سرگوشی کی اور پھر پوچھا۔ "آپ یہاں کیوں آگئے؟ دھیان رکھیں، کوئی کھڑکی کی جانب سے بھی آسکتا ہے۔"

"اینا! تمہیں یقین ہے کہ کچھ ہوگا اور وہ بھی آج ہی؟" جواباً اس شخص نے آہستگی سے پوچھا۔

"معلوم نہیں..... لیکن ہم انتظار کریں گے۔" اینا کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"اور اگر....." بات ادھوری رہ گئی۔ انتظار ختم ہوگیا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ دونوں چند لمحوں کے لیے گویا بت سے ہو گئے۔ "اب کیا کرنا ہے؟" یہ تو پہلے ہی طے کرلیا گیا تھا لیکن یہ بھی تو دیکھنا تھا کہ جس کے منتظر تھے، وہی آیا ہے یا.....! دونوں نے دروازے کو یوں دیکھا تھا جیسے باہر ایسی خوفناک بلا کھڑی ہے جو دروازہ کھلتے ہی ان دونوں کو ہڑپ کر جائے گی۔

"میں دروازہ کھولنے لگی ہوں۔ چٹخنی ہٹتے ہی آپ یہ زیرو کا بلب بھی آف کردیں۔ میں تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مطلوبہ شخص ہونے کی صورت میں اس پر ڈنڈے سے حملہ کروں گی۔ آپ پستول کا استعمال صرف انتہائی خراب صورت حال میں ہی کریں گے۔" تیز تیز سرگوشی کرتے ہوئے اینا دروازے کی جانب بڑھی۔

اس نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے چٹخنی پر ہاتھ رکھا۔ بایاں ہاتھ چٹخنی پر تھا اور دائیں ہاتھ میں ڈنڈا جس پر گرفت مضبوط ہو چکی تھی، اتنی کہ اینا کو وہ ڈنڈا ہتھیلی میں چبھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی لائٹ آف ہوگئی۔ ادھر دروازہ تھوڑا سا کھلا گیا اور اینا ہٹ کر پیچھے ہوگئی۔ باہر سے کسی نے دروازہ کھولنے والے کی پیشانی پر لوہے کی راڈ سے بھرپور چوٹ لگانے کی کوشش کی لیکن کمرے میں موجود دو افراد کے پہلے ہی سے چوکنا ہونے کی وجہ سے راڈ ہوا میں لہرا کر رہ گئی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اینا نے باہر سے آنے والی ہلکی سی روشنی کا فائدہ اٹھایا اور حملہ آور کے سر پر یکے بعد دیگرے تین چار ڈنڈے رسید کردیے۔ زندگی میں کبھی بھی ایسا کام نہ کرنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور زور زیادہ نہ لگایا گیا لیکن اس کے باوجود پے درپے ضربات نے حملہ آور کو لڑکھڑانے پر مجبور کردیا۔ ساتھ ہی کمرا روشنی میں نہا گیا اور حملہ آور کے ماتھے پر پستول کی نال آ لگی۔ پستول والے نے جو کہ میوزک ٹیچر لوتھی تھا، ٹانگ مار کر اسے زمین پر گرا دیا۔ دوسری جانب اینا ڈنڈا لیے مستعد کھڑی تھی۔ سر پر پڑنے والی ضربات، پستول اور لوتھی کی ٹانگ نے حملہ آور کو زمین پر بے دم سا ہو کر گر جانے پر مجبور کردیا۔

"خبردار....." پستول کی نال زمین پر گرے شخص کی جانب کرتے ہوئے لوتھی نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔ پہلا مرحلہ کامیابی سے مکمل ہونے پر اس کا اعتماد بحال ہوگیا تھا۔

"اس کے چہرے سے ماسک ہٹاؤ اینا!" لوتھی نے ذرا سا ہٹتے ہوئے کہا۔ پستول حملہ آور کی جانب ہی تھا۔ اینا آگے بڑھی اور بڑے چوکنا انداز میں نیچے جھک کر کراہتے ہوئے شخص کے منہ سے ماسک اتار دیا۔ حالانکہ لوتھی اور اینا رالسٹن ذہنی طور پر اس چہرے کو دیکھنے کے لیے تیار تھے پھر بھی دونوں کو ایک بار جھٹکا لگا۔

"تم..... تم ہو۔" لوتھی کے منہ سے نکلا۔

بظاہر احمق ہی نظر آنے والی اینا رالسٹن کا منہ بھی حیرت کی شدت سے کھل گیا۔

☆☆☆

گہری نیند میں تھا کہ اس کے موبائل کی اسکرین جگمگانے لگی۔ "اس وقت کون ہے ڈسٹرب کرنے والا؟" رکی نے بند آنکھوں سے موبائل سائیڈ ٹیبل سے اٹھایا۔ اسے ہلکا سا غصہ آگیا۔ بڑی مشکل سے وہ سویا تھا اور اسے خوا مخواہ اٹھا دیا گیا۔

"موبائل آف کرنا ہی بہتر رہتا ہے۔" سوچتے ہوئے اس نے اسکرین کی طرف دیکھا۔

"ہیلو لوتھی! خیریت؟" اس نے لوتھی کا نام دیکھ کر چونکتے ہوئے کہا۔ نیند یکدم غائب ہوگئی۔ اس کی چھٹی حس

کچھ بتا رہی تھی۔
"ایک مشتبہ شخص پکڑا گیا ہے۔ غالباً میڈم سوزی اور منگ کا قاتل وہی ہے۔" لُوتھی نے جواباً دھماکا کیا۔ رکی کی آنکھیں کھل گئیں۔
"کیا کہہ رہے ہو.....؟ کیا.....؟" رکی کے منہ سے بات مکمل نہیں نکل رہی تھی۔
"ذرا میرے کمرے میں آجاؤ۔" لُوتھی نے کہتے ہوئے کال منقطع کر دی۔
رکی بھاگم بھاگ سیڑھیاں اترا۔ وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا لُوتھی کے کمرے کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا۔ لُوتھی کے کمرے میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میوزک ٹیچرز اور اکیڈمی میں موجود اسٹوڈنٹس کمرے اور برآمدے میں کھڑے تھے۔
رکی کو دیکھ کر جانسن اس کے قریب آیا۔ "خود پر قابو رکھنا۔" کہتے ہوئے جانسن اسے اندر لے گیا۔ رکی کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر رسیوں سے بندھے شخص کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ شہد رنگ بالوں والی معصوم سی بیٹرس رسیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ اس نے چہرہ جھکا رکھا تھا اور آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔
"بیٹرس! تم.....تم نے.....تم نے یہ قتل کیے؟"
رکی اس کے قریب ہو کر چیخا۔ جیروم نے تیزی سے آگے بڑھ کر رکی کو تھام لیا۔ رکی تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ چہرے پر زلزلے کے تاثرات تھے۔ زلزلے کے تاثرات تو باقی لوگوں کے چہروں پر بھی تھے کہ نازک سی بیٹرس نے یہ کیسے کیا؟ اور اہم ترین سوال کہ آخر کیوں؟
"اس سے کچھ پوچھا نہیں تم لوگوں نے؟ اس نے کوئی جواب دیا؟" خود پر قابو پا کر رکی بولا۔
"نہیں، ہمیں تو کچھ نہیں بتایا لیکن اس نے اپنی حرکتوں سے خود کو مجرم ثابت کر دیا ہے۔ بظاہر معصوم نظر آنے والی یہ لڑکی بہت خطرناک نکلی ہے۔" لُوتھی نے بتایا۔ اس کا لہجہ زہرخند تھا۔ سب بیٹرس کو گھور رہے تھے۔
"تم نے اسے کیسے پکڑا.....یعنی کس شک کی بنیاد پر تم نے اس کو مجرم سمجھا؟" رکی نے قہر آلود آنکھوں سے بیٹرس کو دیکھتے ہوئے لُوتھی سے سوال کیا۔
"پولیس آرہی ہے کچھ دیر میں۔ میں نے فون کر دیا تھا۔ ہال میں چلتے ہیں۔ پولیس اور آپ سب کو وہیں ساری بات بتاتا ہوں۔ ویسے مختصراً جواب یہ ہے کہ یہ سب ایبا رالسٹن کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔" کمرے میں موجود لوگوں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ انہیں بیٹرس کے مجرم ہونے پر اتنی حیرانی نہیں ہوئی تھی جتنی ایبا رالسٹن کے بارے میں لُوتھی کا جملہ سن کر ہوئی۔
تھوڑی دیر بعد سب پولیس ہال میں جمع تھے۔ بیٹرس کی رسیاں کھول دی گئی تھیں۔ اب اس کے بھاگنے یا مزاحمت کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ جب پولیس کو ایبا رالسٹن کے بارے میں بتایا گیا تو وہ بھی حیران رہ گئے۔ ایبا اپنے مخصوص انداز میں چپ چاپ بیٹھی چشمے کے پیچھے سے سب کو احمقوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔ لُوتھی کے اشارے پر گویا چونک کر وہ سیدھی ہو بیٹھی اور بولنے لگی۔
"میری عادت ہے کہ میں چیزوں کو بہت غور سے دیکھتی ہوں۔ جب لوگ بات کر رہے ہوتے ہیں تو میں ان کے چہرے کے تاثرات اور ہاتھ پاؤں کی حرکت وغیرہ پر غور کرتی ہوں۔ میڈم سوزی کے مرڈر کے بعد میں نے نوٹ کیا کہ بیٹرس پولیس کا پاسی اور کا سوال سن کر ضرورت سے زیادہ مطمئن نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اسے بچپن عرصے سے جانتی ہوں، اس کا بات کرنے کا یہ طریقہ نہیں دیکھا جو کچھ دنوں سے تھا۔" سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بےچینی سے ایبا کی طرف دیکھنے لگے جو اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھی۔
"یہ بات کرتے ہوئے اپنے انداز سے کافی ہٹ کر تھی.....اور پھر مسٹر منگ کے مرڈر کے بعد اس میں یہ تبدیلی آئی کہ یہ بار بار کبھی ایک ہاتھ اور کبھی دوسرے ہاتھ کی مٹھی بند کرتی۔ جس روز اس نے کسی مخالف پر قتل ڈالنے کی بات کی تو میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اپنا جملہ بولنے سے پہلے اس نے متعدد بار مٹھیاں کھولیں اور بند کی تھیں اور کچھ دیر آنکھیں بند کی تھیں۔ یقیناً اس نے کچھ سوچا اور پھر یکدم آنکھیں کھول کر پولیس کو اپنی طرف سے ایک بھید دیا اور پھر جب سر لُوتھی نے اس امکان کو سختی سے مسترد کیا تو اس نے ملنے جانے والی نظروں سے سر لُوتھی کی جانب دیکھا لیکن ساتھ ہی نظریں دوسری جانب مرکوز کر دیں۔ مجھے کیونکہ پہلے ہی دن سے یہ مشکوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے اس پر مزید توجہ دینا شروع کر دی۔ جب سر لُوتھی جذباتی ہو کر خود قاتل کا سراغ لگانے کا کہہ رہے تھے تو سب کے چہروں پر پریشانی تھی۔ بیٹرس کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور اس کی آنکھیں سوچتی سی محسوس ہوئیں۔ ایسی سوچ جو مزید بُرا کر سکتی تھی۔

پولیس آفیسر نے غور سے ایبا کو دیکھا جو بولتے بولتے رک گئی تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔ پولیس آفیسر نے پاس پڑی پانی کی بوتل ایبا کو تھمادی۔ ایبا نے بڑی تیزی سے پانی پیا اور پانی پیتے ہی بغیر رکے بولنے لگی۔
"میں ان باتوں کو غور سے سننے کے لیے بیٹھ گئی جو بیٹرس اور دیگر لوگ کر رہے تھے۔ یہ اب سے کوئی تیرہ چودہ گھنٹے پہلے کی بات ہے۔ میں پانی پی رہی تھی کہ بیٹرس نے ایک چونکا دینے والا جملہ کہا۔ یہ کہہ رہی تھی...... 'بے چاری میڈم سوزی نے شام کو پیڈی کیور، منی کیور کروایا تھا اور رات کو ان کے خوبصورت ہاتھ، پاؤں خون و مٹی میں خراب کر دیے گئے۔' کسی نے غور نہیں کیا لیکن یہ بات بہت غور طلب اور قابل تفتیش تھی کیونکہ میڈم سوزی نے پارلر جانے کی تو اس روز کوئی بات ہی نہ کی تھی۔ میرے سامنے وہ کسی دوست کو ملنے کا کہہ کر گئی تھیں۔ میں گھر جانے کے لیے نکلنے والی تھی جب میڈم نے کہا تھا کہ وہ اپنی دوست کے پاس جا رہی ہیں اور چند گھنٹے لگیں گے۔ شاید رات کا کھانا بھی وہ کھا کر ہی آئیں۔ میں حیران تھی کہ اگر میڈم پارلر گئی تھیں تو بیٹرس کو کیسے پتا چلا کہ وہ وہاں گئی تھیں اور اگر یہ بات ہے کہ ہاتھ پاؤں دیکھ کر پتا چل سکتا ہے تو یہ آپ سب جانتے ہیں کہ میڈم کے ہاتھ، پاؤں، چہرہ بری طرح لان کی مٹی میں لتھڑے تھے تو پھر اس نے کہاں سے پیڈی کیور، منی کیور کا پتا چلا لیا؟ میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس نے دوسرا جملہ بولا جس نے میرا شک مزید پختہ کر دیا۔"
سب بےحد متجسس ہو کر ایبا کو دیکھ رہے تھے۔ "وہ کہتے ہیں نا کہ مجرم کوئی ایک غلطی ضرور کرتا ہے جس سے وہ پکڑا جاتا ہے۔ شاید یہی وقت تھا جب بیٹرس نے غلطی کر دی تھی۔ یہ کہہ رہی تھی۔ 'اچھا بھلا ہم کنسرٹ میں جانے والے تھے کہ یہ سب ہو گیا۔ حالانکہ میرا نام کنسرٹ میں حصہ لینے والوں کی لسٹ میں نہیں تھا پھر بھی مجھے دکھ ہے کہ ہماری اکیڈمی اس پروگرام میں نہیں جاسکی۔'"
سب کے منہ کھل گئے۔ یہ بات بہت خطرناک حد تک شک میں ڈالنے والی تھی کیونکہ میڈم سوزی نے تو اس ضمن ناموں کی لسٹ دی ہی نہیں تھی تو پھر بیٹرس کو لسٹ بتانے والی بات کا رات ہی کیسے پتا چل گیا کہ اس کا نام اس میں نہیں ہے؟ ایبا نے سب کی آنکھوں میں شدید چونکا دینے والے تاثرات کی جھلک دیکھی۔
"جی ہاں، میں نے بھی یہی سوچا کہ آخر اسے یہ کیسے پتا چلا؟ مجھے فوری سب کچھ سمجھ میں آ گیا کہ اتنے بڑے پروگرام میں نہ جانے کا غصہ میڈم سوزی کے قتل کا باعث بنا اور میڈم کے قتل کا سراغ لگانے والے کا قتل اس لیے ہوا کہ قاتل یعنی بیٹرس کو پکڑے جانے کا خوف تھا۔ اس کی باتیں سن کر مجھے خوف محسوس ہوا کہ اب سر لُوتھی کی باری ہو سکتی ہے۔ میں نے باہر نکل کر سر لُوتھی کو بتایا اور انہیں ساری باتیں بتائیں تو وہ حیران رہ گئے پھر ہم دونوں نے ایک پلان بنایا کہ کس طرح بیٹرس کو بےنقاب کیا جائے۔ کافی خدشات تھے، یہ یقینی تھی لیکن پھر بھی پروگرام حیرت انگیز حد تک کامیاب رہا۔ یہ ڈر تھا کہ اگر آج رات یہ سر لُوتھی پر حملہ کرنے کے لیے نہ آئی تو کیا؟ آئندہ ہم خود کو تیار کر پائیں کہ کچھ کر سکیں۔ ویسے تو ہمارے پاس کھلا آپشن تھا کہ پولیس کے حوالے سارا معاملہ کر دیا جائے لیکن ہم ذرا جذباتی ہو گئے تھے کہ اپنی اکیڈمی کی مجرم کو خود ہی پکڑیں۔"
آفیسر نے بڑے غور سے ایبا رالسٹن کا چہرہ دیکھا جہاں اسے جذباتیت نام کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی لیکن بہرحال وہ سچ ہی بول رہی تھی۔
اب بیٹرس کے بولنے کی باری تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ شکست خوردہ سی دکھائی دے رہی تھی۔
"اس دن کی رات میڈم سوزی جب اکیڈمی واپس پہنچیں تو ان کے ہاتھ میں سامان کے کافی سارے پیکٹس تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں سامان اوپر لے جانے میں ان کی مدد کروں۔ میں جب ان کے کمرے میں پہنچی تو سامنے میز پر ایک کاغذ رکھا تھا۔ مجھے چند نام نظر آئے۔ میں سمجھ گئی کہ یہ کنسرٹ میں جانے والوں کی لسٹ ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میرا نام بھی اس میں ہوگا۔ میں آگے بڑھی اور دیکھنے لگی کہ میرا نام ہے؟ اسی دوران میڈم نے مجھے دیکھا تو مسکرا کر بولیں۔
'بیٹرس ڈیئر! ناراض مت ہونا۔ میں نے تمہارا نام اس لسٹ میں نہیں لکھا۔ دراصل جس طرح کا کنسرٹ ہے اس کے لیے تم بالکل موزوں نہیں ہو۔ ابھی تم میں کچھ خامیاں ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ تم جلد ان پر قابو پا لوگی اور پھر اگلے کسی کنسرٹ میں تم بھی ہوگی، او کے؟ پلیز! دکھی مت ہونا.....اور ہاں، اس ایبا رالسٹن کا نام بھی نہیں ہے اس فہرست میں۔ میں نے سوچا ہے پہلے اسے کچھ کی سی کیفیت اور بونگے پن سے تو نکال لیں۔' یہ کہہ کر میڈم ہنسیں۔ میرا خون کھولنے لگا۔ ایک بونگی سی لڑکی کے

ساتھ ساتھ مجھے بھی اتنے بڑے پروگرام سے محروم رکھا جارہا تھا۔ میں شدید اشتعال میں آ گئی تب ہی میڈم بولیں۔

''ارے بیٹرس! دیکھو تو میں نے پیڈی کیور، مینی کیور کروایا ہے۔ ٹھیک لگ رہا ہے نا؟''

''وہ مسکرائیں اور میرا دل جل اٹھا۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں باہر نکل آئی۔ میرے سپنے ٹوٹ گئے تھے۔ میں خود کو بہت بڑی سنگر سمجھنے لگی تھی لیکن میرے بارے میں کہا جارہا تھا کہ ابھی خامیاں ہیں۔ میں کھولتی رہی اور پھر نہ جانے کیسے میں نے اسٹور میں جاکر لوہے کی راڈ اٹھائی اور میڈم کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ میرا کام آسان ہوگیا کیونکہ میڈم سوزی کسی کام کے لیے باہر آکر ریلنگ کے پاس کھڑی تھیں۔ میں نے...... میں نے ان کے سر اور کنپٹیوں پر زور زور سے وار کیے اور انہیں دھکا دے دیا تاکہ سب کو حادثہ لگے لیکن میں یہ بھول گئی کہ سر کے زخم اور پوسٹ مارٹم رپورٹ معاملہ مشکوک کردے گی پھر سر میگ کو میں نے پکڑے جانے کے خوف میں مبتلا ہوکر مار ڈالا...... مجھے نہیں پتا...... مجھے نہیں پتا یہ میں کیسے...... کرتی رہی...... اوہ خدایا! یہ میں نے کیا کردیا۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اور اب ٹموتھی کو بھی نہ جانے کیسے قتل کرنے چلی تھیں تم۔ ہے نا؟ وحشی قاتلہ!'' رکی چلایا۔ اس کے زخم تازہ ہوگئے تھے۔ بیٹرس بس روئے جارہی تھی۔

''تمہیں یہ ڈر نہیں تھا کہ آخر تو پکڑی جاؤ گی۔ کیوں جرم پر جرم کرتی رہیں؟'' جانسن نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ اسے ہتھکڑی لگائی جارہی تھی۔

''میں نے سوچا تھا کہ شاید میں بچ جاؤں گی۔ نہ جانے کس منحوس سائے نے مجھے گھیر لیا تھا کہ میں غصے اور گھبراہٹ میں جرم پر جرم کرتی چلی گئی۔'' بیٹرس ندامت سے روتے ہوئے بول رہی تھی لیکن اب اس کی ندامت اسے کوئی فائدہ دینے والی نہیں تھی۔ پولیس وین جاچکی تھی اور ہال میں سناٹا طاری تھا۔

''کیا تم رات ادھر ہی رہو گی یا تمہیں تمہارے گھر بھیج دیا جائے؟'' ٹموتھی نے اینا رالسٹن سے سوال کیا۔ وہ مشن مکمل کرنے کے لیے صرف ٹموتھی کو بتا کر اس رات اکیڈمی میں ٹھہری تھی۔

''جی سر! ٹیکسی منگوادیں۔'' مختصر سا جواب دے کر اینا نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

''کتنی عجیب بات ہے کہ جن دو لڑکیوں کا نام میڈم نے فہرست میں نہیں لکھا، وہ ان کی زندگی و موت کے حوالے سے نہایت اہم رہیں۔ ایک نے انہیں قتل کیا، دوسری نے ان کے قاتل کو پکڑوایا۔'' جیروم نے آہستگی سے جانسن سے کہا۔

''ہاں واقعی...... ٹھیک کہا تم نے۔'' جانسن، اینا کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہم اسے بونگی سمجھتے تھے۔ احمق، کم گو کہتے تھے اور دیکھو، اس نے خاموشی سے بیٹھے بیٹھے کیسا مشاہدہ کیا کہ اکیڈمی کو مصیبت سے نجات دلاتے ہوئے قاتل کو گرفتار کروادیا۔'' جیروم نے کہا۔

''اور قاتل بھی وہ جو ہمارے اتنے قریب تھا کہ ہماری نظر اور دھیان اس طرف نہیں جارہے تھے۔ اگر یہ چشمے کے پیچھے سے مشاہدہ نہ کرتی تو نہ جانے کیا کیا ہوجاتا۔ شاید آج بیٹرس کی گرفتاری کے بجائے ٹموتھی کی لاش دیکھنے کو ملتی۔'' جانسن نے بات کرتے کرتے جھرجھری لی۔

''خاموش رہنے والی نے کمال کردیا۔ بات کرنے کے بجائے آنکھوں کا شاندار استعمال کیا۔ واہ، بہت خوب!'' جیروم نے تعریف کی۔ تھوڑی دیر بعد سب اپنے کمروں میں اور اینا گھر پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆

میوزک اکیڈمی میں خوب رونق تھی۔ موسیقی کی دھنیں بکھر رہی تھیں۔ قاتل کے پکڑے جانے کے چند دن بعد سب کچھ بحال ہوگیا تھا۔ میڈم سوزی اور میگ کا کام مکمل کرنے کے لیے سب پرجوش ہوچکے تھے۔ میڈم سوزی کی بہن وکٹوریہ جو بہن کی طرح میوزک میں دلچسپی رکھتی تھی، آکر بھانجے رکی کے ساتھ رہائش پذیر ہوگئی تھی البتہ اس نے کنسرٹ کی فہرست بنانے کے کام سے معذرت کرلی تھی۔ میگ کا بیٹا جمی، باپ کی جگہ لے چکا تھا۔ سب ٹھیک چلنے لگا تھا۔

اینا رالسٹن اپنا کام کرکے میوزک اکیڈمی کے برآمدے میں بیٹھی چشمہ درست کرتے ہوئے ایک جانب جانے کیا دیکھ رہی تھی کہ لزا کا وہاں سے گزر ہوا۔

''یہ ایسے ٹکٹکی باندھ کر کیا دیکھ رہی ہے؟'' اس نے پاس کھڑے جانسن سے بات کی۔

''دیکھنے دو...... دیکھنے دو۔ کوئی مشاہدہ کررہی ہوگی۔ مشاہدہ کرنا اچھی عادت ہے۔ فائدہ ہی ہوتا ہے۔'' جانسن نے مسکرا کر کہا تو لزا نے اثبات میں سر ہلادیا۔

⌘⌘⌘

آزمائشوں میں مبتلا ایک جانور کی وفاداریوں کا عبرت اثر احوال

لائیکا

محمد ظفر حسین

وفاداری پر صرف اور صرف محبت کا حق ہوتا ہے اور اس حقیقت کو انسان تو انسان، جانور نے بھی ثابت کر ڈالا... اس کی محبت بھی بڑی عجیب تھی... جب انسانوں نے نظر انداز کیا تو اس نے ایک جانور سے دل لگالیا... کیونکہ جانور کسی کے عیبوں کا پرچار نہیں کرتے... انہیں تو بس اس محبت سے غرض ہوتی ہے جو انہیں دی جاتی ہے۔

شادی کے چھ سال اولاد کی نعمت سے محروم رہنے کے بعد وسیم صاحب کے آنگن میں اللہ کی رحمت سے پھول کھلا تو والدین کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ تھا۔ چار سال کی عمر میں ننھی نبیلہ کو ایسا شدید..... ٹائیفائڈ ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ اس بخار سے جان تو بچ گئی مگر کچھ طبی مسائل کی وجہ سے نبیلہ کی گردن ایک طرف جھک کر ٹیڑھی ہو گئی۔ اسپیشلسٹ ڈاکٹرز نے گردن کے پٹھے اور ریڑھ کی ہڈی کے جھکاؤ کے پیش نظر آپریشن تجویز کیا تھا۔ نبیلہ کچھ کمزور تھی لہٰذا چند سالوں تک یہ آپریشن مؤخر ہوتا رہا۔ اب نبیلہ بارہ سال کی ہوئی تو امی ابو کو امید بندھی۔

مگر انہی دوران بیماری میں غیر حاضری کے باعث تعلیم میں کافی حرج آ گیا تھا۔ وہ ذہین اور پڑھائی میں بھی اچھی تھی۔ شاید جلد ہی محنت کر کے اس کمزوری پر قابو پا لیتی مگر اسکول میں بچوں نے اس کو تنگ کرنا شروع کر دیا اور بُرے نام رکھ کر اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ کلاس میں کوئی اس کو ایلین کہتا تو کوئی بندریا کہہ کر چڑاتا۔ نبیلہ روتے ہوئے اسکول سے آتی اور پھر جانے کا نام نہیں لیتی۔ غیر حاضریاں بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک آ گئی کہ ایک دن اسکول جانا ہی چھوٹ گیا۔

ہمارے معاشرے میں رنگت، شکل صورت اور..... قد و قامت کو لے کر اچھے بھلے صحت مند انسانوں کی زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے تو ذہنی و جسمانی معذوری کا شکار لوگ تو کس گنتی میں ہی نہیں۔ بچپن میں گول مٹول اور ہنستے مسکراتے والی نبیلہ پورے گلی محلے کی جان ہوا کرتی تھی۔ پڑوس کے ہر گھر میں بلاتکلف آنا جانا لگا رہتا مگر بیماری کے بعد جیسے جیسے بڑی ہونے لگی تو اپنی جھکی ہوئی گردن سے لوگوں کے جھکتے ہوئے کردار کو بھی بہ خوبی سمجھنے لگی۔ بیماری کے بعد نبیلہ کو اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے اور کھانے پینے میں مشکل پیش آتی۔ تقریبات میں جاتی تو گردن کے ٹیڑھے پن کو دیکھ کر ہمدردی کی آڑ میں لوگ اس کا مذاق اڑاتے تو ہنستے بولتے والی خوش مزاج نبیلہ کو چپ لگ گئی اور دس سال کی عمر میں اسکول چھوٹا تو اس نے محلے میں بھی گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔

نبیلہ کے والدین فکر مند تھے۔ گھر میں ایک ٹیوٹر کا بندوبست کر لیا تھا۔ پڑھائی تو خیر ساتھ ساتھ چلنے لگی مگر نبیلہ کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ گھر میں کھوئی کھوئی سی رہتی۔ بڑھتی عمر کے ساتھ حساس ہوتی جا رہی تھی۔ کمزور جسمانی ساخت کے باعث محلے کے بچوں نے اس کو منی باجی کہنا شروع کیا تو لوگ نبیلہ کا نام ہی بھول گئے اور ہر ایک کو اس کا منی باجی نام یاد رہ گیا۔ منی باجی گھر میں اکیلی احساس کمتری کا شکار ہونے لگیں۔ ایسے میں وسیم صاحب نے وقت گزاری کے لیے منی باجی کو کچھ آسٹریلین طوطے لا کر دیے۔ منی باجی کا پرندوں میں دل لگ گیا کیونکہ یہ پرندے اس کو ٹیڑھے اور بُرے ناموں سے نہیں پکارتے تھے۔

منی باجی نے ابو سے مزید پرندوں کی فرمائش کی۔ والدین اس کے مزاج میں آنے والی تبدیلی دیکھ کر خوش ہوئے۔ وسیم صاحب کا گھر گلی کے کونے پر تھا۔ کارنر مکان ہونے کا فائدہ اٹھا کر انہوں نے گھر کی بغلی دیوار کے ساتھ کیاریوں والی جگہ پر چھوٹ مزید آگے جگہ بڑھا کر دیوار اٹھائی اور ایک چھوٹا سا صحن نما دالان بنا لیا جس میں مختلف پرندوں، کبوتروں اور طوطوں کے پنجرے رکھوا دیے۔ منی باجی کا دل جانوروں کی قربت میں لگ گیا تھا۔ دوستوں کی کمی دور تو نہیں ہوئی مگر مصروف رہنے کا ایک سہارا مل گیا۔ وسیم صاحب نے گھر سے جڑے اس عقبی دالان میں ایک بیرونی دروازہ نکلوا لیا۔ اب منی باجی صبح شام مرغیوں کو باجرا ڈال کر گلی میں چھوڑ دیتیں اور دروازے کے ساتھ اپنی چھوٹی سی کرسی نکال کر وہاں بیٹھ جایا کرتیں۔ منی باجی نے جب سے بچا ہوا کھانا محلے کی بلیوں کو ڈالنا شروع کیا تو یہ تمام بلیاں بھی ان کی کرسی کے گرد دائرہ بنا کر بیٹھ جاتیں۔

☆☆☆

ان ہی دنوں ایک چھوٹی سی نو عمر کتیا کہیں سے بھٹکتی ہوئی محلے میں چلی آئی۔ غالباً حال ہی میں اپنی ماں سے علیحدہ ہوئی تھی۔ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اس کتیا کی بچی نے آتے ہی محلے والوں کا ناک میں دم کر کے رکھ دیا۔ رات کو گھروں کے باہر رکھے ہوئے ڈسٹ بن الٹ دیتی۔ گاڑیوں کے کور سے تو اس کو اللہ واسطے کا بیر تھا۔ گلی کی بے شمار گاڑیوں کے کورز کا اپنے تیز پنجوں اور دانتوں سے حشر نشر کر چکی تھی۔

انسان اور جانوروں کے بیچ تعلق صدیوں پرانا ہے۔ دیکھنے میں یہ چھوٹی سی کتیا بظاہر بڑی معصوم نظر آتی اور حقیقت میں بھی سوائے گاڑیوں کے کور اور کوڑے دان کی دشمن ہونے کے علاوہ بے ضرر تھی۔ محلے کے بچے بھی کچھ ہی دن میں اس سے مانوس ہو گئے۔ ایک دن منی باجی کی نظر پڑی تو ہمدردی میں ایک پیالے میں دودھ ڈال کر دے دیا۔ بس وہ دن اور آج کا دن، اس کتیا نے وہیں ڈیرے ڈال لیے۔ صبح شام منی باجی جب مرغیوں کو باہر نکالتیں تو منی باجی کی کرسی کے ارد گرد بلیوں کے ساتھ ایک اور ساتھی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس آوارہ کتیا کے مستقل ٹھکانے کی پہچان اب منی باجی کے گھر کا کونا بن گیا تھا۔

وسیم صاحب دفتری آدمی تھے۔ دن بھر اپنے آفس کے کاموں میں مصروف رہتے۔ شام کو گھر آتے تو عشا اور پھر صبح سویرے فجر کی نماز گھر کے نزدیک مسجد میں ادا کرنے کا موقع ملتا۔ آج کل صبح سویرے فجر کی نماز کے لیے گھر سے نکلتے تو کتیا دم ہلاتی ان کے آگے پیچھے پھرتی چلی آتی۔ یہ بے چارے اپنے کپڑے بچانے کے چکر میں اس کو ہش ہش کر کے بھگاتے اور وہ کتیا کھیل سمجھ کر ان کے اور نزدیک آ جاتی۔ وہ روزانہ صبح بڑی آہستگی سے گھر کا دروازہ

کھولتے، خاموشی سے نیم اندھیرے میں گھر سے باہر نکلتے مگر وہ جیسے کہیں ان کے انتظار میں ہی ہوتی۔ نہ جانے کہاں سے دوڑتی بھاگتی وہ کتیا آ کر ان کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگتی۔ تنگ آ کر وہ دکھانے کے لیے پتھر اٹھا لیتے مگر مجال ہے کہ وہ کتیا غراتی یا ڈر کر وہ بھاگ جاتی بلکہ وہیں ان کے قدموں کے پاس لیٹ جاتی۔ اپنی دونوں اگلی ٹانگوں کو کھینچ کر سر تابعداری سے زمین پر یوں لگاتی کہ وسیم صاحب کا بھی دل پسیج جاتا۔ وہ پتھر ایک طرف پھینک کر مسجد کی طرف چل پڑتے۔ کتیا مسجد کے دروازے تک ان کے پیچھے آتی پھر واپس لوٹ آتی۔

وہ کتیا ایک پیالا دودھ کی قیمت ادا کر رہی تھی۔

محلے والوں کی بھی جان چھوٹی۔ منی باجی کی کتیا سے انسیت بڑھی تو وہ بس گلی کے کونے کی ہی ہو کر رہ گئی۔ اس سے پہلے کتیا کی حرکتوں کی وجہ سے سب عاجز تو آئے ہوئے تھے مگر وسیم صاحب کے پڑوسی اقبال صاحب ہنستے ہوئے اکثر مذاق میں کہتے۔

”آہ بے چاری کتیا کی بچی! کسی اچھے گھرانے کی لگتی ہے مگر بچپن میں ماں کی محبت نہیں ملی اس لیے اچھی تربیت نہ ہو سکی۔“

وسیم صاحب ان کی بات سن کر مسکرا دیتے۔

یہ کتیا بھی آہستہ آہستہ جدوجہد برائے بقا کی خاطر پتھر کھا کر چپ جاتی جیسے منی باجی نے ان انسانوں کے پتھر جیسے رویوں سے بچ کر خود کو تنہائی کے خول میں چھپا لیا تھا۔

☆☆☆

کچھ مہینے بیت گئے۔ کتیا نے قد نکال لیا تھا۔ شاید کسی اچھی روسی نسل کی کراس بریڈ تھی۔ سفید رنگ کی یہ کتیا منی باجی کی پکی دوست بن چکی تھی۔ ایک دن وسیم صاحب شام کو ذرا جلدی دفتر سے لوٹے تو دیکھا کہ منی باجی صحن کا عقبی دروازہ کھول کر مرغیوں کو دانہ ڈالنے سے فارغ ہو کر کرسی پر یوں بیٹھی تھیں کہ دونوں ہاتھوں میں اپنا گیم ٹیبلٹ لیے گیم کھیلنے میں منہمک تھیں اور وہ کتیا اپنے دونوں اگلے پیر بڑی ادا سے منی باجی کے زانو... میں حمائل کیے ٹیبلٹ پر نظریں جمائے ان کے بالکل ساتھ لگ کر یوں بیٹھی تھی جیسے کوئی عزیز ترین سہیلی ہو۔

وسیم صاحب نے اپنی بیگم سے اس بات کا ذکر کیا۔ وہ پہلے ہی اس کتیا اور منی باجی کی دوستی سے بیزار تھیں۔ وہ کتیا اکثر عقبی دروازے سے صحن میں منی باجی کے ساتھ اندر چلی آتی۔ وجہ منی باجی ہی تھیں۔ امی ناراض ہو کر تھک چکی تھیں۔ پہلے وہ محلے کی بلیوں سے تنگ تھیں، اب یہ کتیا اور آ گئی تھی۔ امی اکثر صحن میں اس کتیا کو دیکھ کر غصے سے کتیا کی بچی کہہ کر ڈانٹ دیا کرتیں لیکن پھر منی باجی، امی کے بار بار اپنی دوست کو توہین آمیز انداز میں ”کتیا کی بچی“ کہنے پر ناراض ہوئیں تو امی نے دو دن سے اس کو ”کتیا جہیں“ کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ وہ کتیا بھی چپ کر کے سر جھکائے امی کی جھڑکیاں سنتی مگر جب تک منی باجی اس کو صحن سے نہیں نکالتیں وہ ڈھیٹ بنی وہیں کھڑی امی کی ڈانٹ پھٹکار سنتی رہتی۔

ایک دن وہ کتیا اسی طرح صحن میں دونوں اگلی ٹانگیں منی باجی کی گود میں رکھے ہوئے تھی۔ منی باجی ٹیبلٹ پر مختلف کتوں اور ان کی نسلوں پر کوئی معلوماتی ویب سائٹ کھولے بیٹھی تھیں۔ امی نے یہ منظر دیکھا تو سخت سیخ پا ہو گئیں۔ کتا بہرحال ایک ناپاک جانور ہے۔ گھر میں داخل ہونے اور کپڑوں کی پاکی اور ناپاکی کے مسائل تو ہوتے ہیں۔ انہوں نے حسب عادت ”کتیا کی بچی“ کہہ کر ناراضی کا اظہار کیا تو منی باجی نے سخت برا منایا۔

”کیا ہے امی! میری ایک ہی تو سہیلی ہے لائیکا۔ اس کو بھی آپ حقارت سے ”کتیا کی بچی“ کہہ کر اس کا مذاق اڑاتی ہیں۔“ منی باجی نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ارے بیٹا! میں نے کب اور کیوں آپ کی کسی سہیلی کا مذاق اڑایا ہے؟ اور یہ کون ہے لائیکا؟“ امی نے حیرانی سے پوچھا۔

”یہ ہے میری سہیلی لائیکا!“ منی باجی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر شکایت کی۔ ”میں نے اس کا نام لائیکا رکھ دیا ہے اور یہ آج سے کتیا کی بچی...... یا کتیا جہیں نہیں...... لائیکا ہے۔ آپ کو پتا ہے مجھے کتنی تکلیف ہوتی تھی جب اسکول اور محلے میں میری دوست مجھے بُرے نام سے پکارتی تھیں۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میری طرح میری دوست کو بھی بُرے ناموں سے پکارا جائے؟“

منی باجی نے امی سے لپٹ کر کہا تو امی نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کو روک کر منی باجی کی پیشانی چوم لی اور پیار کرتے ہوئے وعدہ کر لیا کہ آج کے بعد منی باجی کی دوست لائیکا کو بھی ”کتیا کی بچی“ نہیں کہیں گی۔

بعد میں منی باجی نے امی کو بتایا کہ انہوں نے گوگل پر سرچ کیا تو پتا چلا کہ روسی کتیا لائیکا خلا میں جانے والی دنیا کی پہلی کتیا تھی۔ اس لیے اب امی کو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی

پیاری بیٹی کی خوشی کی خاطر لائیکا کو برداشت کرنا پڑا۔

وسیم صاحب خود اپنی آنکھوں سے منی باجی اور لائیکا کی محبت دیکھ چکے تھے۔ محلے کا کوئی بچہ منی باجی کا دوست نہیں تھا۔ وہ بھی اپنی لاڈلی بیٹی کے دکھی دل کی فرمائش سن کر اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو نہ روک سکے اور نہ ہی منی باجی کی لائیکا سے دوستی کو روک سکے تھے۔

☆☆☆

ان ہی دنوں شہر میں آوارہ کتوں کی بہتات اور پاگل کتے کے کاٹنے کی اطلاعات آنے لگیں۔ وسیم صاحب کی گلی میں بھی کچھ مہینے پہلے رات دن کے لیے چوکیدار رکھا گیا تھا مگر نااتفاقی کی وجہ سے وہ بھی نہ رہا۔ ان ہی دنوں مزید ایک برائی پوری قوت سے شہریوں پر حملہ آور ہو چکی تھی اور وہ تھی اسٹریٹ کرائم کی وارداتیں۔ آوارہ و پاگل کتوں اور ڈاکوؤں، دونوں کی من مانیاں عروج پر تھیں۔ کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ شہریوں کی جان و مال کی اللہ کی ذات کے سوا کوئی ضمانت نہیں تھی۔

☆☆☆

منی باجی اس سال پندرھویں سال میں لگ چکی تھیں مگر دیکھنے میں بارہ تیرہ سے زیادہ کی نہیں لگتی تھیں۔ حالات کے پیش نظر ابو نے ان کو بھری دوپہر کو سنسان گلی میں گھر سے باہر کرسی ڈال کر بیٹھنے سے منع کر دیا تھا۔

علاقے میں آوارہ کتے بڑھنے لگے۔ محلہ بھی اس کی زد میں آ گیا۔ وسیم صاحب کچھ دنوں سے محسوس کر رہے تھے کہ عشا اور فجر کے وقت لائیکا نظر نہیں آ رہی تھی۔ لائیکا کچھ دنوں کے لیے کہیں غائب ہو گئی تھی۔ منی باجی بھی اس کی گمشدگی سے اداس تھیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ اپنی فطری جبلت کے مطابق لائیکا نے بالغ ہوتے ہی ایک نوجوان کتے کو دوست بنا لیا تھا۔ ایک دن اتوار کی چھٹی والے دن فجر کی نماز سے واپسی پر وسیم صاحب اپنے نمازی دوستوں کے ساتھ ہوا خوری کے لیے ٹہلتے ہوئے کچھ دور ایک میدان میں نکل آئے تو دور میدان میں درختوں کے سائے میں کتوں کا ایک غول آرام کرتا نظر آیا۔ وسیم صاحب اور دیگر ان سے بچ کر دور سے ہی نکل جانا چاہتے تھے کہ غول سے ایک کتیا نکل کر بھاگتی ہوئی آئی اور وسیم صاحب کے قدموں سے کچھ دور زمین پر لوٹنے لگی۔ وسیم صاحب کے ساتھیوں نے بے اختیار ہاتھوں میں احتیاطاً پتھر اٹھا لیے تھے مگر وسیم صاحب نے روک دیا۔

وہ بہت دن بعد نظر آئی تھی مگر لوٹ پوٹ کر دور سے فاصلہ رکھ کر پیار جتا رہی تھی۔ اتنے مہینوں میں کم از کم لائیکا کو اس بات کی عادت پڑ گئی تھی۔ وسیم صاحب نے کبھی لائیکا کو ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر آج بے اختیار اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر نہ جانے کیوں پیار کر بیٹھے۔ کتوں میں سمجھنے کی حس عام جانوروں سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ لائیکا نے حیرانی سے وسیم صاحب کو دیکھا مگر وہ اب بھی فاصلہ رکھ رہی تھی۔

دور کتوں کے غول سے ایک قد آور کتا کھڑا ہو گیا تھا۔ لائیکا کے گرد انسانوں کا ہجوم دیکھ کر وہ بھونکتا ہوا نزدیک آنے لگا۔ لائیکا تڑپ کر اٹھی اور تیزی سے وہاں سے بھاگ اٹھی۔ وہ واپس اپنے غول کی طرف چلی گئی۔ وہ قد آور کتا بھی مطمئن ہو کر بھونکنا بند کر چکا تھا۔ غول کی طرف پہنچ کر لائیکا نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وسیم صاحب کی سمجھ میں بات آ گئی تھی۔ راتوں کو گلی کے آس پاس دوڑتے بھاگتے اس نے فطرت کے مطابق ایک نوجوان ساتھی ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ چند ہفتوں سے اس غول کے ساتھ تھی۔

☆☆☆

اس بات کو مزید کچھ عرصہ گزر گیا۔ پھر ایک دن صبح سویرے لائیکا واپس آ گئی۔

منی باجی نے دیکھا تو وہ کچھ ہلکی اور بھاری بھاری نظر آ رہی تھی۔ پہلے کی طرح منی باجی کے پاس نہیں آ کر بیٹھی۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی اور بے حال نظر آ رہی تھی۔ شاید منی باجی کو چھوڑ کر بھاگ جانے پر شرمندہ تھی۔

لائیکا کے منی باجی کا محلہ چھوڑ کر جانے سے پہلے منی باجی کو اس کی حرکتوں سے کچھ دن پہلے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ چل رہی تھی۔

لائیکا اچانک غائب ہو جاتی۔ کبھی صبح دیر تک غائب رہتی تو کبھی سرِ شام بھی نظر نہ آتی۔ وہ کم کم نظر آ رہی تھی۔ ابو کو بھی لائیکا کی غیر موجودگی اور منی باجی کی افسردگی کا احساس تو ہوا مگر دل ہی دل میں انہوں نے اللہ کا شکر ہی ادا کیا کہ لائیکا سے جان چھوٹی۔ انہیں گھر کے صحن میں لائیکا کی موجودگی ایک آنکھ نہ بھاتی۔ لائیکا کی جس نوجوان کتے سے دوستی ہوئی تھی، اب وہ اس کی خاطر اپنا محلہ چھوڑ کر اس کے غول میں چلی گئی۔ کچھ دن پہلے اس علاقے کے لوگوں نے میونسپلٹی والوں کو آوارہ کتوں کے خلاف کارروائی کی درخواست دی تھی۔ کتوں کا یہ آوارہ گروہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

پھر ایک دن میونسپلٹی کی گاڑی آئی اور علاقے میں جگہ جگہ زہریلا گوشت اور گلاب جامن ڈال گئی۔ لائیکا اس دن سستی محسوس کر رہی تھی۔ آج سارا دن میدان میں

درختوں کے سائے میں لیٹی رہی تھی۔ غول کے ساتھ بھی نہیں نکلی۔ دوپہر کو اس نے میونسپلٹی کی گاڑی کو دیکھا تو اس کو ماں یاد آ گئی۔ جس دن اس کی ماں نے یہ گاڑی دیکھی تھی نہ جانے کیوں ان سب بہن بھائیوں کو ایک پارک کے گوشے میں لے جا کر جھاڑیوں میں چھپا دیا تھا۔ ماں کو انجانا خطرہ محسوس تو ہو گیا مگر خود ہی اس خطرے کا شکار بن گئی۔ وہ سب بہن بھائی شام تک ماں کا انتظار کرتے رہے مگر ماں پھر کبھی واپس نہیں آئی۔

اگلے دن صبح کو بھوک سے بے چین ہو کر پارک سے نکلے تو علاقے کے بچوں نے پتھر مار مار کر ان کو زخمی کر دیا۔ سب بہن بھائی جان بچا کر ادھر اُدھر بھاگے تو بھٹک گئے۔ لائیکا کو جلد ہی منی باجی کا ٹھکانا مل گیا لیکن آج جب لائیکا نے دوپہر کو میونسپلٹی کی گاڑی کو علاقے میں دیکھا تو فطری خوف دل میں بیٹھ گیا۔ وہ اپنے ساتھی کو تلاش کرنے نکلی مگر شام کا اندھیرا پھیلنے تک اس کی زندگی میں بھی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میونسپلٹی کی گاڑی علاقے میں جگہ جگہ مردہ کتوں کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال کر لے جا رہی تھی۔ ان ہی میں سے ایک اس کا نوجوان ساتھی بھی تھا۔ لائیکا بری طرح ڈر کر وہاں سے بھاگی اور سیدھی اپنے پرانے ٹھکانے منی باجی کے پاس پہنچ گئی۔

☆☆☆

منی باجی دیکھنے میں بے شک چھوٹی اور منی سی نظر آتی تھیں مگر اب بڑی ہو رہی تھیں۔ گھر میں جانور پالے ہوئے تھے۔ مرغے مرغیاں، کبوتروں کے انڈوں سے نکلنے والے بچے اور بلیوں کے بلونگڑوں سے فطرت کے راز سمجھ آ رہے تھے۔ کتیا کی ڈھلکی ہوئی طبیعت اور ابھرے ہوئے پیٹ سے کچھ اندازہ تو ہو رہا تھا۔ پھر ایک دن منی باجی کی امی نے باہر آ کر دیکھا تو انہیں سمجھ آ گیا کہ کتیا بچے دینے والی تھی۔ امی نے ایک بار منی باجی کو پھر سمجھایا کہ ابھی بھی وقت ہے لائیکا کی فکر چھوڑ دے ورنہ کچھ دن بعد جب وہ بچے دے دے گی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ پہلے وہ ایک کتیا سے تنگ تھیں بعد میں اس کے پلوں کو اپنے گھر کے نزدیک برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔ منی باجی نے رو رو کر اس وعدے پر اپنی بات منوالی کہ آئندہ لائیکا یا اس کے ہونے والے پلے گھر کے صحن سے دور رہیں گے۔

☆☆☆

کچھ دن بعد لائیکا نے اکٹھے چھ پلوں کو جنم دیا۔ منی باجی نے صبح اٹھ کر باہر گلی میں جھانکا تو دروازے کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے گول مٹول سفید پلے چیاؤں چیاؤں کرتے اپنی ماں سے لپٹ کر دودھ پی رہے تھے۔ پلوں کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں۔ منی باجی نے گھر کے باہر دروازے کے ساتھ ایک بڑے سے خالی گتے کے کارٹن میں پرانے کپڑے رکھ کر پلوں کو ان میں ڈال دیا۔ منی باجی نے بچوں کو اٹھایا تو لائیکا ہلکی آواز سے غرائی مگر جارحانہ انداز میں منی باجی کے پاؤں میں لوٹنے لگی۔ عام طور پر کتیا نے بچے دیے ہوں تو وہ کسی اجنبی کو اپنے بچوں کے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتی مگر لائیکا نے محلے کے بچوں کو کچھ نہیں کہا جو سارا دن آ کر منی باجی کی اجازت سے ان بچوں کو دیکھتے رہے۔ بچوں کے اجازت مانگنے پر منی باجی کو پہلی دفعہ اپنی اہمیت کا احساس ہوا اور اس کی وجہ کوئی اور نہیں ان کی کتیا لائیکا تھی۔

دو ہفتے گزر چکے تھے۔

پلوں نے آنکھیں کھولیں تو اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔

پچھلے ہفتے سڑک پر دوڑنے والی تیز رفتار موٹر سائیکلوں اور کار کی زد میں آ کر لائیکا کے چھ میں سے صرف تین بچے رہ گئے تھے۔ بقایا تین کی صحت اچھی تھی۔ امی نے بھی ایک مہربانی کی تھی کہ منی باجی کی ضد اور کچھ ہمدردی میں ان پلوں کے لیے اضافی دودھ لگوا لیا تھا۔ منی باجی پلوں کے مرنے پر کچھ دن افسردہ ہوئیں تو امی نے منی باجی کو سمجھا دیا تھا کہ ان جانوروں کی آبادی کے بڑھنے اور کم ہونے میں ہی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی ورنہ شہر میں ایک وقت میں بچے دینے والے کتوں کی آبادی انسانوں سے زیادہ بڑھ چکی ہوتی۔

میونسپلٹی والوں کو اہلِ علاقہ کی طرف سے مسلسل آوارہ کتوں کے کاٹنے کی درخواستیں تواتر سے موصول ہو رہی تھیں۔ منی باجی کے محلے میں بھی چھ سات کتوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ آخرکار کچھ دن بعد منی باجی کے محلے کا بھی نمبر آ ہی گیا۔ ایک دن صبح سویرے تین روزہ کتا مار مہم کے لیے میونسپلٹی کی گاڑی ان کے علاقے میں آ پہنچی۔

☆☆☆

لائیکا صبح سے بے چین تھی۔

منی باجی نے بھی لائیکا کے ساتھ میونسپلٹی کی گاڑی دیکھ لی تھی۔ وہ بڑی دیر سے باہر صحن کے دروازے پر کھڑی لائیکا کی بے چینی کو نوٹ کر رہی تھیں۔ لائیکا بار بار سڑک کے کونے تک جا کر نہ جانے کیا تلاش کرتی پھر بے چینی سے واپس آ کر اپنے دونوں اگلے پیروں کو منی باجی کے دروازے پر ٹکا کر منی باجی کو یوں دیکھتی جیسے اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی ہو۔ لائیکا جانتی تھی کہ جب سے جوڑا

بتانے، اپنے ننھے ساتھی کے ساتھ یہاں سے چلی گئی تھی تو
واپس لوٹنے پر اس دن کے بعد منی باجی نے لائیکا کو گھر کے
اندر نہیں آنے دیا تھا کیونکہ امی سے وعدہ جو کر بیٹھی تھیں۔
وسیم صاحب کے دفتر جانے کے بعد امی ناشتے وغیرہ
سے فارغ ہو کر صحن میں آگئیں تو دیکھا کہ منی باجی پرندوں
کے پنجروں کی جگہ بدل رہی تھیں۔ موسم گرما میں پرندوں کو
دھوپ سے بچانے یا سردیوں میں دھوپ لگانے کے لیے
موسم کے حساب سے پہلے بھی منی باجی اکثر پنجروں کی ترتیب
بدل دیا کرتی تھیں اس لیے امی نے کوئی دھیان نہیں دیا۔
پنجروں کی ترتیب سے پچھلی رات ہی طے کر لی تھی۔
منی باجی نے میونسپلٹی کی گاڑی کو اپنی گلی میں آتا دیکھ
کر ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

اس دن کا اختتام کتا مار مہم کی کامیابی سے ہوا تھا۔
منی باجی کی طرح آس پاس کی کئی گلیوں میں کئی بچے
ایسے تھے جنہوں نے آوارہ کتوں کے ٹومی، سیزر اور لوسی
جیسے نام رکھ کر ان کو دوست بنایا تھا۔ اب ان کتوں کو گلی محلے
اور چوراہوں پر زہر سے مرتے دیکھ کر آنسو بھری نظریں
لیے افسردہ تھے۔
وسیم صاحب شام کو گھر لوٹے تو لائیکا بچوں سمیت
کہیں غائب تھی۔
عشا کی نماز پڑھ کر واپس آنے تک محلے میں تقریباً
آوارہ کتوں کا صفایا ہو چکا تھا مگر امی ابو کو حیرت تھی کہ منی
باجی حیرت انگیز طور پر پرسکون تھیں۔
وسیم صاحب تو تھکے ہوئے تھے۔ سوچنے کے لیے
وقت نہیں تھا لہٰذا جلدی سو گئے۔ منی باجی نے آج زیادہ تر
وقت گھر کے اندر امی کے ساتھ گھر اور کام کاج میں ہاتھ
بٹا کر گزارا۔ دوپہر کو امی تھک کر تھوڑا آرام کے لیے لیٹ
گئیں تو منی باجی اپنے پرندوں اور مرغیوں کو دانہ ڈالنے صحن
میں آگئیں۔ شام کو بھی منی باجی نے امی کے ساتھ چائے پی
اور بیٹھ کر ٹی وی دیکھا۔ امی بہت خوش تھیں۔ آج بڑے
عرصے بعد منی باجی کی طبیعت میں ٹھہراؤ نظر آیا تھا۔ یہ ایک
خوش آئند بات تھی۔ ویسے بھی ڈاکٹروں کی تجویز کردہ
عمر کے مطابق اب آپریشن کے دن بھی نزدیک آ رہے
تھے۔ ڈاکٹروں کے مطابق چودہ سے سولہ سال کی عمر منی باجی
کی گردن کے آپریشن کے لیے بہترین وقت تھا۔ امی نے
بھی منی باجی کی پسند کا کھانا بنایا۔ منی باجی سارے دن کی
طرح امی کے ساتھ کچن میں ان کا ہاتھ بٹاتی رہیں۔ شام کو
ابو گھر آئے تو وہ بھی منی باجی کی اس تبدیلی سے بہت خوش
تھے۔ اس خوشی میں وقتی طور پر سب ہی لائیکا عرف کتیا جی
کو بھول گئے تھے۔

☆☆☆

دوسرے دن اتوار کی صبح وسیم صاحب فجر کی نماز ادا
کرنے اٹھے تو حیرانی ہوئی۔
آج منی باجی بھی ان سے پہلے ہی اٹھ کر نماز ادا کر
رہی تھیں اور نماز میں بڑی دیر تک دعائیں مانگتی رہیں۔ منی
باجی نماز تو پڑھتی تھیں مگر باقاعدگی کے ساتھ نہیں۔ اکثر فجر کی
نماز قضا ہو جاتی۔ لاڈ پیار اور بیماری کی وجہ سے کچھ چھوٹ
ملی ہوئی تھی۔ وسیم صاحب کے مسجد جانے کے بعد ان کی
اہلیہ بھی کچھ دیر بعد اٹھ کر نماز پڑھ کر ناشتے کی تیاریوں میں
لگ جایا کرتیں۔
وسیم صاحب گھر سے مسجد جانے کے لیے نکلے تو لائیکا
اور بچوں کی جگہ خالی دیکھ کر کچھ دیر کے لیے دل دکھی سا
ہو گیا۔
آج اتوار کا دن تھا۔ فجر کی نماز کے بعد حسب معمول
اپنے نمازی ساتھیوں کے ساتھ کچھ دیر کے لیے چہل قدمی
کرنے نکل گئے۔ راستے میں زہر سے بے حال کچھ کتے نظر
آئے جو کل روزہ کتا مار مہم میں زہر آلود گوشت کھا کر آخری
سانسیں لے رہے تھے۔ جلد یا بدیر میونسپلٹی کی گاڑی انہیں
وہاں سے اٹھا کر لے جانے کے لیے آنے والی تھی۔ وسیم
صاحب کو لائیکا اور اس کے تینوں پلے یاد آ گئے۔
پچھلے چند ہفتوں سے وسیم صاحب کو بھی لائیکا اور اس
کے چھوٹے پلوں سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ آج وسیم صاحب صبح
سے گھر پر ہی تھے۔ منی باجی پر یہ دن بھاری پڑ گیا۔ دوپہر کو
کھانا کھا کر قیلولہ کرنے کے بعد اٹھ کر کسی کام سے صحن میں
آئے۔ یہ سناٹے کا وقت تھا۔ جانور، پرندے بھی آرام
کر رہے تھے۔ وسیم صاحب واپس جانے کے لیے مڑے تو
صحن کی راہداری کے پاس پنجروں میں پرندوں کے ننھے
منے چوزوں کی چوں چوں کے بیچ ہلکی ہلکی چیاؤں چیاؤں کی
آواز نے ان کے قدم روک لیے۔ منی باجی نے دو دن پہلے
پنجروں کی ترتیب بدل کر اس کاٹھ کباڑ کے سامنے اپنے
پرندوں کے پنجرے لگا دیے تھے۔ ساتھ ہی دیوار کے
ساتھ مرغیوں کے ڈربے تھے۔ وسیم صاحب نے حیرانی کے
ساتھ کان لگا کر سنا تو یہ آواز پنجروں سے نہیں بلکہ ان کے
پیچھے سے آ رہی تھی۔ وسیم صاحب نے پنجروں کے ساتھ بنی
ہوئی تنگ جگہ سے گزر کر صوفوں کے پیچھے جھانکا تو وہاں لائیکا

اپنے تین عدد ننھے منے پلوں کے ساتھ دبکی ہوئی تھی۔

☆☆☆

منی باجی اپنی ٹیڑھی گردن لیے مجرم بنی ابو امی کے
سامنے کھڑی تھیں۔
امی اور ابو نے ڈانٹا تو سہم کر رونا شروع کر دیا اور
اصل بات بتا دی۔ لائیکا کو گھر میں لانے کی وجہ کتا مار مہم
تھی۔ میونسپلٹی کی گاڑی جیسے ہی علاقے میں آئی تو منی باجی
نے لائیکا کی بے چینی بھانپ لی۔ گھر میں کسی کو بتائے بغیر
صحن میں پنجروں کو آڑ بنا کر پرانے صوفوں اور کاٹھ کباڑ کے
پیچھے لائیکا کو پلوں سمیت پناہ دے دی۔ منی باجی نے منہ پر
انگلی رکھ کر شش کی آواز نکالی اور لائیکا کو خاموش رہنے کا
اشارہ کیا۔ وہ بے زبان تھی مگر احسان مند تھی۔ نہ جانے کیسے
اشارہ سمجھ گئی۔ لائیکا نے خطرہ بھانپ کر بچوں کے ساتھ
خاموشی سے پناہ لی۔ ماں نے بچوں کو آواز نکالنے سے ڈرا
دیا تھا۔ پلے اگر ذرا سی آواز بھی نکالتے تو لائیکا ہلکی غراہٹ
سے فوراً ہی انہیں خاموش کروا دیا کرتی۔
کل ہفتے کا پورا دن گزر گیا۔ گھر میں کسی کو بھنک تک
نہیں پڑی، نہ ہی شک ہوا۔ امی ویسے ہی صحن میں بغیر کسی
کام کے نہیں آیا جایا کرتی تھیں اور منی باجی نے جان بوجھ
کر کل کا پورا دن امی کے ساتھ مصروفیت میں گزارا تو امی
نے بھی اس طرف غور نہیں کیا مگر آج اتوار کو ابو گھر پر نہ ہوتے تو
شاید مزید کچھ دن یہ راز نہ کھلتا۔
منی باجی نے امی ابو کو بتایا۔
کتا مار مہم میں محلے سے آوارہ کتوں کے خاتمے کے
ساتھ لائیکا کا بھی خاتمہ ہو جاتا جو کہ منی باجی کو منظور نہ تھا۔
منی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی جھکی ہوئی
گردن مزید جھک گئی تو والدین سے دیکھا نہ گیا۔ دل تڑپ
کر رہ گیا۔ پچھلے سال ڈاکٹروں نے آپریشن کے لیے منی
باجی کے میڈیکل ٹیسٹ لیے تو تفصیلی معائنے کے مطابق
نازک صحت والی منی باجی اپنی عمر کے حساب سے اس
آپریشن کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار نہیں تھیں مگر
لائیکا کو بچانے کے لیے منی باجی کے اندر ایک مثبت تبدیلی
آئی تھی۔ مستقبل میں ہونے والے آپریشن کے لیے ایسی
قوت ارادی ضروری تھی۔
والدین کو منی باجی کی بہتری عزیز تھی۔ وہ بالآخر مان
گئے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ اس احسان کے بدلے میں
انہیں کیا ملنے جا رہا تھا۔

☆☆☆

پیر کو کتا مار مہم کا تیسرا اور آخری دن تھا۔

منی باجی نے آج بھی امی کے ساتھ باورچی خانے میں کئی کام نمٹانے میں مدد کی۔ امی بھی بیٹی کی خوشی میں خوش تھیں۔ کھانا کھا کر امی آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں آ گئیں تو منی باجی بھی ان کے ساتھ آ کر ان کے ساتھ ہی لیٹ گئیں۔ امی نے پیار سے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ آج ہی امی نے منی باجی کی فرمائش پر ان کو اپنی سونے کی بالیاں اتار کر پہنائی تھیں۔ منی باجی کو کچھ دن سے بننے سنورنے کا شوق ہو چلا تھا۔ امی کے جھمکے اور گلے کی چین کو پہن کر اپنا شوق پورا کر لیا کرتیں۔ امی کو نیند آ رہی تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے سو گئیں تو کچھ دیر بعد منی باجی صحن میں چلی آئیں۔ دوپہر جا رہی تھی۔ عصر کا وقت ہونے ہی والا تھا۔ جب سے لائیکا نے بچے دیے تھے، منی باجی نے مرغیوں کو باہر نہیں نکالا تھا۔ آج لائیکا بچوں سمیت اندر تھی تو بڑے دن کے بعد مرغیوں کو صحن سے باہر گلی میں نکالا، ٹیبلٹ لیا اور دروازے پر کرسی ڈال کر اپنا پسندیدہ گیم کھیلنے بیٹھ گئیں۔

محلے میں ان دو دنوں میں آوارہ کتوں کا تقریباً صفایا ہو چکا تھا۔ آج اس مہم کا آخری دن تھا۔ آوارہ کتوں کا خطرہ تو ٹل گیا مگر آوارہ انسانی درندوں کا علاج کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

منی باجی اپنے گیم میں منہمک کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ گلی سنسان تھی۔ ایک بائیک دوسری دفعہ وہاں سے گزری اور پھر پلٹ کر واپس آئی۔ بائیک پر دو نوجوان سوار تھے۔ آتے ہی انہوں نے منی باجی کے ہاتھوں سے ٹیبلٹ چھین لیا۔ منی باجی نے گھبرا کر سر اٹھایا تو کانوں میں جھلمل کرتی بالیاں بھی ان کو نظر آ گئیں۔ بائیک پر سامنے بیٹھے ہوئے لٹیرے نے ٹیبلٹ چھین کر پیچھے بیٹھے ہوئے نوجوان کے حوالے کیا اور ایک معصوم بچی کے سامنے ریوالور نکال کر لہراتے ہوئے خونخوار نظروں سے منی باجی کو دیکھا تو وہ لرز کر رہ گئیں۔

"بالیاں اتارو..... جلدی کرو۔" ان لٹیروں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے منی باجی سے مطالبہ کیا۔

منی باجی نے خوف سے لرزتے ہوئے بائیں کان کی بالی نکال کر ان لٹیروں کے حوالے کر دی۔ دائیں کان میں جھکی ہوئی گردن کے باعث کان میں بغیر کسی کی مدد کے بالی نکالنا منی باجی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ سر جھکائے کوشش کرنے لگیں۔ اس کام میں ذرا دیر کیا لگی کہ وہ لٹیرے جھنجلا کر اکھڑ گئے۔ منی باجی کو چیخ کر حکم دیا کہ گردن سیدھی کرے۔ منی باجی گردن سیدھی نہیں کر سکتی تھیں۔ نہ ہی سمجھانے یا لٹیروں کو یقین دلانے کا وقت تھا۔ انہوں نے موقع دیکھ کر کھلے دروازے سے بھاگنا چاہا کہ بائیک کے پیچھے تیار بیٹھے لٹیرے نے لپک کر صحن دروازے کے سامنے ان کو دبوچ لیا۔

گرمیوں کی جاتی دوپہر میں گلی سنسان تھی۔ منی کو امی ابو نے منع کیا تھا کہ حالات خراب ہیں اس لیے باہر نہیں بیٹھا کریں مگر بھول چوک ہو جاتی ہے۔ بائیک سوار کے پیچھے بیٹھے نوجوان نے اتر کر منی کو پکڑا اور زبردستی ان کی گردن سیدھی کر کے کانوں سے بالی نوچنے کی کوشش کی۔ منی درد میں ڈوبی آواز میں چلا اٹھی۔ عین اس وقت صحن کے کھلے دروازے سے کوئی باہر آ گیا۔ اللہ نے مدد بھیج دی تھی۔

☆☆☆

صحن کے دروازے سے جست لگا کر خوفناک غراہٹ کے ساتھ ایک بڑے قد والی کتیا نے منی کی گردن پکڑے ہوئے لٹیرے کی کمر پر کاٹ کھایا تھا۔ لٹیرے نے تڑپ کر درد کی شدت سے منی کو چھوڑ دیا۔ دوسری طرف بائیک سوار لٹیرے کو اس ناگہانی آفت پر سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا کہ دیکھتے ہی دیکھتے غضب ناک لائیکا نے اس کا ہاتھ چبا ڈالا۔ اس لٹیرے کے ہاتھ سے ریوالور نیچے گر گیا۔ ادھر منی باجی کو لٹیرے کی قید سے آزادی ملی تو وہ چیخ کر کھلے دروازے سے صحن کی طرف بھاگیں۔ اندر امی بھی منی باجی کی چیخوں کی آواز سن کر جاگ اٹھی تھیں۔ کتیا نے بھونکتے ہوئے لٹیروں پر حملہ کیا تو امی صحن تک آ چکی تھیں۔ منی باجی روتے ہوئے امی کے سینے سے چمٹ گئیں۔ کتیا کی توجہ بائیک سوار پر گئی۔ اس نے جگہ جگہ کاٹ کر اس کو بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ اس اثنا میں دوسرا لٹیرا بھی اپنی جان بچانے کے لیے صحن میں داخل ہو گیا۔ اس دوران اس کے ہاتھ میں زمین پر گرا ہوا ریوالور بھی آ گیا۔ لائیکا بائیک سوار پر بھرپور حیوانی جبلت سے حملے کر رہی تھی۔ اس نے ذرا ہی دیر میں اس بائیک سوار کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ دوسرا لٹیرا زخمی حالت میں خود کو کتیا کے خونی حملے سے بچانے کے لیے دروازے سے اندر آیا ہی تھا کہ وہ کتیا بھی فوراً ہی اس کے پیچھے اندر آ گئی۔

☆☆☆

وہ کتیا انسانوں کی محبت اور نفرت سے اچھی طرح واقف تھی۔ ماں مر گئی تو بچوں کے پتھر کھاتی، بھٹکتی ہوئی اس محلے میں آ گئی۔ محلے میں کسی نے دھتکارا تو کسی نے چمکارا مگر منی باجی کی محبت نے کتیا کا دل جیت لیا تھا۔ اپنا جوڑا اپنانے

کے باوجود بھی منی باجی کی محبت کو بھولی نہیں تھی۔ پارک میں جب وسیم صاحب نے محبت سے ہاتھ پھیرا تو تب ہی اس نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا تھا مگر وہ ماں بننے والی تھی۔ پھر کتا مار مہم شروع ہوئی۔ پہلے اس مہم نے ماں کو چھین لیا تھا اور اب اس کا جوڑا چھین لیا۔ رشتہ ٹوٹا تو وہ ڈر کر منی باجی کے پاس چلی آئی۔

وہ آج دوپہر کو بچوں کو دودھ پلا کر آرام کر رہی تھی کہ منی باجی کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز سن کر یکایک ہوشیار ہو گئی۔ منی باجی خطرے میں تھیں۔ لائیکا چاروں پنجوں پر اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

جانور بھی انسان کے مزاج کو سمجھتے ہیں۔ لائیکا نے کھلے دروازے کے باہر مشتبہ افراد کو منی باجی پر تشدد کرتے دیکھا تو غضب ناک ہو کر ان پر جھپٹ پڑی تھی۔

بائیک سوار کو اچھی طرح ادھیڑ کر پلٹی تو زمین پر گرا ہوا لٹیرا اپنے کھوئے ہوئے حواس مجتمع کرتے ہوئے اٹھ کر منی باجی کے پیچھے اندر جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ جاتے جاتے زمین پر پڑا ہوا ریوالور ہاتھ لگا مگر وہ غضب ناک کتیا اتنے قریب سے جان لیوا حملے کر رہی تھی کہ ہتھیار ہاتھ میں آنے کے بعد بھی اوسان ایسے خطا ہوئے کہ چلانے کے لیے ہمت نہیں کر پایا۔ وہ کھلے دروازے سے گھستا ہوا اندر آ کر صحن کی زمین پر سیدھا بیٹھ گیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریوالور تھام کر اس کا رخ دروازے کی طرف کیا جہاں وہ خونخوار کتیا اپنے نکیلے دانتوں اور تیز پنجوں کے ساتھ اس پر چھلانگ لگانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

☆☆☆

گلی میں اتنا بڑا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ ایک ڈاکو بری طرح زخمی حالت میں وسیم صاحب کے دروازے پر پڑا تھا اور دوسرا جان بچا کر گھر کے اندر بھاگ آیا۔ محلے کے بیشتر لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ اتنے میں کسی نے پولیس کو خبر کر دی۔ گھر میں ایک ڈاکو ہتھیار سمیت گھس گیا تھا۔ لوگوں کی کھلے دروازے سے اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ہلاکت خیز حیوان ان کے راستے کی رکاوٹ بن سکتا تھا۔ اس وفادار حیوان کا نام لائیکا تھا۔ گھر کے صحن میں منی باجی امی کے سینے سے لگی کانپ رہی تھیں۔ امی نے زخمی حالت میں اسلحہ بردار ڈاکو کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو دروازے پر غضب ناک ہوئی کتیا جس کا نام لائیکا تھا بھونکتی ہوئی اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔

وہ بدبخت ڈاکو تھا جو منی باجی کی معذوری کی پروا کیے بغیر زبردستی ان کی گردن سیدھی کرتے ہوئے کان سے بالی نوچ رہا تھا۔ لائیکا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے ٹکڑے کر ڈالتی۔ ادھر لائیکا نے اس ڈاکو کو نوچنے کے لیے چھلانگ لگائی ادھر اس ڈاکو نے ریوالور سیدھا کر کے ساری گولیاں کتیا پر چلا دیں۔ ڈر سے کانپتے ہوئے ہاتھوں کا نشانہ درست نہیں تھا۔ کچھ گولیاں ادھر ادھر بھی نکل گئیں۔ دھپ سے کتیا جب اس ڈاکو پر گری تو اس نے کئی گولیاں کھانے کے بعد بھی ڈاکو کی گردن پکڑی تھی اور جھنجوڑتے ہوئے اس وقت تک نہیں چھوڑی جب تک وہ خود نڈھال نہ ہو گئی تھی۔

پولیس پہنچی تو ایک ڈاکو گھر کے دروازے پر شدید زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا اور اندر صحن میں ایک قد آور کتیا کے بوجھ تلے دبا ہوا دوسرا ڈاکو اب زندگی کے بوجھ سے آزاد ہو چکا تھا۔ کتیا نے مرتے مرتے بھی اس کی گردن چبا کر ادھیڑ ڈالا تھا۔

☆☆☆

وسیم صاحب بھی گھر پہنچ گئے۔

ڈاکوؤں نے کان کی بالی اتارنے کے لیے زبردستی کی تو گردن کے پٹھوں اور مہروں میں شدید تکلیف کے باعث منی باجی کو فوراً اسپتال پہنچایا گیا جہاں فوری آپریشن تجویز ہوا۔ اللہ کے فضل سے آپریشن کامیاب رہا تھا۔ ایک ہفتے بعد نبیلہ عرف منی باجی نے گھر میں قدم رکھا۔ ڈاکٹروں نے نبیلہ کو چند مہینے فزیو تھراپی تجویز کی تھی۔

چھ مہینے گزر چکے تھے۔ نبیلہ کا دوبارہ اسکول میں ایڈمیشن ہو گیا۔ آج شام نبیلہ عرف منی باجی کی سولہویں سالگرہ تھی۔ ابو نے ایک خصوصی تحفہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ ایک سرپرائز تھا۔

شام کو ابو آئے تو گھر کے باہر اصل سرپرائز نبیلہ کا منتظر تھا۔ لائیکا کے مرنے کے بعد اس کے تین پلوں میں سے صرف ایک کتیا بچ پائی تھی۔ وسیم صاحب نے اس کو جانوروں کی حفاظت کرنے والی ایک این جی او کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ چھ مہینے میں اس کتیا نے اچھا قد نکال لیا تھا۔ وہ اپنی ماں لائیکا پر گئی تھی۔ کتا گھر کے اندر رکھنا درست نہیں مگر حفاظت کے پیش نظر گھر کے باہر رکھ سکتے ہیں۔ وسیم صاحب منی باجی کے لیے جان دینے والی اس کتیا کی بچی کو واپس لے آئے تھے۔ گیٹ کے باہر اس کے لیے ایک چھوٹا چار بائی چار فٹ کا لکڑی کا گھر تیار کروا لیا گیا۔ اس کتیا کا نام اپنی ماں کے نام پر رکھ دیا گیا۔ وہ کچھ ہی دنوں میں نبیلہ سے مانوس ہو گئی۔

⌘⌘⌘

قسط نمبر: 36

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار روح کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

"اب کرنا کیا ہے؟" اب تک خاموشی اختیار کیے رکھے جارو نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"اردگرد کا جائزہ لو پھر اس عورت کو ٹریپ کرتے ہیں۔ معلوم تو ہو کہ یہ سارا کیا چکر ہے اور خان کیسے ان کے ہاتھ لگا۔" معاذ نے ان سے کہا اور پھر خود زانگ تاؤ سے رابطہ کرنے لگا۔

"مجھے اپنا ایک ساتھی، ایک اجنبی عورت کے ساتھ دکھائی دیا ہے۔ ہم انہیں اپنے قبضے میں لینا چاہتے ہیں۔ تم چیک کرو کہ آس پاس سب کلیئر ہے یا نہیں۔ اوور۔"

"اوکے۔ ہم چیک کرتے ہیں۔ اوور۔" زانگ تاؤ نے جواب دیا۔ جارو اس کے کہنے پر پہلے ہی حرکت میں آچکا تھا اور امید تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں آس پاس کی مکمل صورت حال سامنے آجائے گی۔ صورت حال سامنے آنے تک وہاں جاری ناٹک دیکھنا ان کی مجبوری تھی۔ عورت کی گل خان سے چھیڑ چھاڑ اور اٹھکیلیاں مسلسل جاری تھیں جس کے باعث اس کے ہراس میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔

"اچھا ایک بات بتاؤ خان! اگر ابھی یہاں کوئی بڑا چیتا آجائے تو تم مر کر اس کے پیٹ میں جانا پسند کرو گے یا جان بچانے کے لیے کھائی میں چھلانگ لگا دو گے؟"

"کھائی میں چھلانگ لگانے سے جان کیسے بچے گا؟ تم نے ابھی تو ام کو بتایا تھا کہ کھائی اتنا گہرا اور خطرناک ہے کہ گرنے والا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔" خوف کے باوجود خان کا جواب اس کی شخصیت کے عین مطابق تھا جسے سن کر عورت زور سے ہنسی اور پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"واقعی، میرا سوال غلط تھا۔ مجھے تم سے پوچھنا چاہیے تھا کہ تم بھوکے چیتے کے ہاتھوں مرنا پسند کرو گے یا کھائی میں گر کر؟"

"ام کو تو لگتا اے کہ ام ان دونوں باتوں سے پہلے سردی سے جم کر ای مر جائے گا۔" خان کے دانت باقاعدہ بجنے لگے تھے اور لہجے میں محسوس کی جانے والی بے بسی تھی۔ اس کی بے بسی نے عورت کو کسی لطیفے کی طرح لطف دیا اور وہ زور سے کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی ہنسی پر معاذ کا خون کھول اٹھا۔

"دنیا کی کوئی عورت ہنستی ہوئی اتنی بری بھی لگ سکتی ہے، آج مجھے پہلی بار معلوم ہوا ہے۔" وکی نے بھی یقیناً وہی کچھ محسوس کیا تھا جو اس نے۔ اس لیے تلخ لہجے میں بڑبڑایا۔ اسی وقت ایئرپیس پر اطلاع موصول ہونے لگی۔

"آل از کلیئر۔ اوپر ایک آدمی تھا جسے ہم نے خاموش کر دیا ہے۔ اوور۔" زانگ تاؤ کی آواز آتے ہی اس نے قدموں میں پڑی زنجیریں کھول دیں۔ وہ یکدم اوٹ سے نکل کر عورت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی اور اپنے بھاری اونی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔

"ہاتھ اوپر۔" معاذ اپنی گن کا رخ اس کی پیشانی کی طرف کرتے ہوئے غرایا۔ وہ ساکت ضرور ہوئی لیکن ہاتھ اوپر نہیں کیے۔

"میری بات ماننے میں ایک سیکنڈ بھی لگایا تو تم خود اوپر چلی جاؤ گی۔" اس کے لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ وہ مزید مزاحمت نہیں کر سکی اور جلدی سے دونوں ہاتھ اوپر کر دیے لیکن ساتھ ہی اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ بلند آواز میں گل خان کو پکارنے لگی۔

"خان...... خان...... او دیکھو یہ دشمن آگیا ہے۔ مجھے اس سے بچاؤ۔"

"ام کیسے بچائے؟ ام اس پتھر سے اترے گا تو کھائی میں گر جائے گا۔" خان کے معصومیت سے دیے گئے جواب پر معاذ کا زوردار قہقہہ لگانے کا دل چاہا جبکہ وہ عورت برانگیختہ ہوگئی اور طیش سے بولی۔

"کچھ نہیں ہوگا اسٹوپڈ! میرا حکم مانو ہر حال میں......" ابھی اس کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ معاذ نے گولیاں چلا دیں۔ خاموش ہتھیار سے نکلی ہوئی بے آواز گولیاں سن کرتی عورت کے دونوں کانوں کے پاس سے گزریں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور خوفزدہ نظروں سے معاذ کی طرف دیکھنے لگی۔ وکی جو اب تک آڑ میں ہی کھڑا رہا تھا، اس مرحلے پر باہر نکل آیا اور پتھر پر متذبذب کھڑے خان کا ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے اتارا۔ وہ قدم زمین پر پڑتے ہی پہلے چیخا پھر حیرت سے یوں اردگرد دیکھنے لگا جیسے گمان کر رہا ہو کہ وہاں موجود کھائی کسی معجزے کے اثر سے غائب ہوگئی ہو۔

"یہاں کوئی کھائی نہیں ہے میرے بھائی! وہ عورت تم سے جھوٹ بول رہی تھی۔" وکی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ہمدردی سے سمجھایا۔ اس کی بات پر گل خان نے پہلے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا پھر عورت اور معاذ کی طرف متوجہ ہوا۔ معاذ عورت کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ رہا تھا۔

"کیا کرتی اے تم لوگ؟ یہ امارا لارا میم کو کیوں باندھتی اے تم؟" وہ اس منظر کو دیکھ کر بدک ہی گیا اور ان دونوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ وکی نے جھپٹ کر اس کی بغلوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے پشت سے جکڑ لیا۔ گل خان خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے کے لیے اپنا پورا زور لگانے لگا۔ وکی کے لیے اسے سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ اگر مقابل کوئی دشمن ہوتا تو اسے ایک آدھ ضرب لگا کر قابو کیا جاسکتا تھا۔ گل خان کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کو اس کا دل بھی نہیں مان رہا تھا۔ اس کی یہ مشکل جارو کی آمد پر آسان ہوئی۔

"خاموش۔ اگر اب آواز نکالی یا کوئی اور الٹی سیدھی حرکت کی تو پہلی گولی تمہاری اس میڈم کو ماروں گا اور دوسری تمہیں۔ اگر اپنی اور اپنی میڈم کی سلامتی چاہتے ہو تو چپ ہو جاؤ۔" جارو کی کنپٹی پر گن رکھ کر دی گئی یہ دھمکی پُراثر ثابت ہوئی۔ گل خان نے ٹھٹک کر لارا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ خود مشکل میں پڑی ہوئی تھی اس لیے سر کی جنبش سے گل خان کو بات مان لینے کا اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ ملتے ہی گل خان نے کسی پالتو جانور کی طرح گردن جھکا دی۔

"لگتا ہے میڈم نے خان کی گھومی ہوئی کھوپڑی کو بالکل ہی گھما دیا ہے۔ ظالم ہم میں سے کسی کو پہچان تک نہیں پایا ہے۔" وہ لوگ لارا اور گل خان کو ہتھیاروں کی زد میں لے کر ایک طرف بڑھے تو وکی نے دھیرے سے جارو کے کان میں سرگوشی کی۔

"مجھے تو بے چارے پر رحم آرہا ہے۔ بے چارہ پٹھان اپنی آن پر جان دینے کا حوصلہ رکھتا تھا اور ظالموں نے اسے مداری کا بندر بنا کر رکھ دیا ہے۔" جارو متاسف تھا۔

"اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وکی ہمیشہ پُرامید رہنے والا بندہ تھا اور شاید یہ اس جیسے خوش امیدوں کی امید قائم رکھنے کا سلسلہ تھا کہ اللہ تعالیٰ بدترین حالات میں بھی آسانی کا کوئی نہ کوئی انتظام کر دیتا تھا۔ اب بھی زانگ نے معاذ کو اطلاع دی کہ اس کے ساتھیوں نے ایک ایسا قدرتی غار تلاش کر لیا ہے جہاں کچھ افراد آسانی سے روپوش رہ سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس قیام کے لیے خیمے موجود تھے لیکن اب جبکہ وہ دشمنوں کے کیمپ سے اس قدر قریب تھے، خیمے لگانا مناسب نہ ہوتا۔ خصوصاً معاذ اور اس کے ساتھیوں کا سامنے آنا بالکل مناسب نہیں تھا کہ اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ ان کی تصاویر پہلے ہی وہاں ارسال کر دی گئی ہوں۔

زانگ کی راہنمائی میں مذکورہ غار میں پہنچ کر ان سب کو ہی خوشگوار حیرت کا احساس ہوا۔ غار اندر سے صاف ستھرا بھی تھا اور وہاں درجہ حرارت بھی واضح طور پر باہر کے مقابلے میں مختلف تھا۔ اگرچہ وہ لوگ پہلے سے اس برف زار میں مقیم تھے اور انہیں مناسب گرم لباس بھی فراہم کر دیے گئے تھے لیکن شدت کی سردی مزاج پر اثرانداز ہوتی تھی اور کبھی کبھی توانائی کی کمی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ ہاں، زانگ اور اس کے ساتھیوں کی بات مختلف تھی۔ ان کے جسم برسوں سے اس علاقے میں قیام کے باعث موسم اور ماحول سے ہم آہنگ ہو گئے تھے اور سردی اس طرح سے نہ ستاتی تھی جیسے معاذ اور اس کے ساتھیوں کو۔ ان کے حساب سے اس غار کا ایک مثبت پہلو یہ بھی تھا کہ اس کا دہانہ مختصر تھا اور بوقت ضرورت ایک بڑے پتھر سے بند کیا جاسکتا تھا۔

"میرے ساتھی آس پاس پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ یہاں کی نگرانی کا کام بھی کریں گے اور ان کے کیمپ کے بارے میں ضروری معلومات کا حصول بھی۔ تم اس دوران اس عورت سے جتنی کام کی باتیں اگلوا سکتے ہو، اگلوا لو۔" وہ سب غار میں پہنچ کر ریلیکس ہو گئے تو زانگ نے معاذ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سب سے پہلے تو ہمیں اس کی تلاشی لینا ہوگی۔" معاذ نے پُرخیال نظروں سے لارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس کے پاس ہتھیار کے علاوہ کوئی ایسا آلہ بھی ہو سکتا ہے جو اس کے ساتھیوں کو اس کی لوکیشن سے آگاہ کر دے۔

"بالکل تلاشی۔ یہ تو سب سے ضروری کام ہے۔" زانگ نے اس کے خیال کی تائید کی۔

"سوال یہ ہے کہ یہ کام کرے گا کون؟" معاذ نے اصل مسئلہ بیان کیا۔ وہ عورت دشمنوں کی ساتھی سہی لیکن اس میں اور اس کے ساتھیوں میں ایک فطری جھجک تھی جو ایک عورت کی جامہ تلاشی لینے میں حائل تھی۔

"یہ کوئی ایسے وچار کی بات نہیں۔ میرا کوئی بھی ساتھی کر دے گا یہ کام۔" زانگ اس کا مسئلہ سمجھ کر اطمینان سے بولا اور اپنے ساتھ موجود ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔

"میرے ساتھ یہ سلوک تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ تم زیادہ دیر تک اپنے اس بل میں چھپے نہیں رہ سکو گے۔" لارا، زانگ کے ساتھی کو تلاشی کے لیے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

”ہم اب تک سارے سودے ہی کرتے رہے ہیں۔ چلو ایک اور سہی۔ بس تم خیال رکھنا کہ تم کوئی ایسی حرکت نہ کرو کہ مجھے تم پر گولی چلانا پڑے۔ مجھے ایک عورت کی جامہ تلاشی لینے میں بے تکلف ہونا ہے لیکن میری گن تمہارے وجود میں روشن دان کھولنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرے گی۔“ معاذ کا لہجہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہو گیا۔ لارا ایک ماہر نفسیات تھی اور اچھی طرح اس لہجے کو پہچان سکتی تھی کہ وہ جو کہہ رہا ہے، اس پر عمل کرنے کا پورا پورا ارادہ بھی رکھتا ہے۔ جان کی سلامتی کے لیے وہ طوعاً و کرہاً لب بھینچ کر خاموشی اختیار کر گئی لیکن اچانک ہی وہاں چھوٹا سا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ابھی ڈکی کے ساتھی نے اس کا کوٹ اتارنے کے بعد بندشوں کو کاٹا ہی تھا کہ گل خان کسی بگولے کی طرح اس سے جا کر ٹکرایا۔

”دور ہو خانہ خراب۔ امارے ہوتے تم امارا میڈم کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔“ وہ بڑی بیدردی سے تلاشی کا ارادہ رکھنے والے آدمی کو رگید رہا تھا۔ اس آدمی نے بھی زچ ہو کر اس پر ہاتھ اٹھا دیا۔

”اسے مارنا نہیں۔ یہ ہمارا ساتھی ہے لیکن اس وقت بہکا ہوا ان لوگوں کے کنٹرول میں ہے۔“ گل خان کو پہلی ضرب لگتے ہی جاوا نے بے قراری سے چلایا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب لارا نے محسوس کیا کہ اس کی توجہ اس پر سے ہٹ چکی ہے۔ اس نے موقع کا فائدہ اٹھانے کا سوچا اور اپنی گن نکالنے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ معاذ کو فوری طور پر اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے لارا کے متحرک ہاتھ کو دیکھا اور بلا تکلف گولی چلا دی۔

لارا کا ہاتھ ابھی کوٹ کی جیب سے فاصلے پر ہی تھا کہ اس کی کلائی میں ایک سوراخ ہو گیا اور خون کی سرخی تیزی سے اس کی آستین پر پھیلنے لگی۔ اس سرخی کے نمودار ہونے سے قبل اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ برآمد ہو چکی تھی۔ اس کی چیخ اور خون کی سرخی نے گل خان کو مزید برانگیختہ کر دیا اور اس نے گالیاں دیتے ہوئے معاذ پر حملہ آور ہونا چاہا۔ اب اسے مزید ڈھیل دینے کی گنجائش نہیں تھی۔ جاوا اور ڈکی بیک وقت حرکت میں آئے اور اس کے معاذ تک پہنچنے سے قبل ہی اسے چھاپ لیا۔ وہ جس جنون میں مبتلا تھا، اس کے تحت ان دونوں پر بھی تابڑ توڑ گھونسے برسانے کی کوشش کی لیکن ڈکی اور جاوا بہرحال لڑنے بھڑنے کے فن میں اس سے زیادہ ماہر تھے۔ ان دونوں نے مل کر جلد ہی اسے قابو کر لیا اور مجبوری کے تحت ہی سہی، اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ اسے بے بس کرنے کے ساتھ منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا گیا۔

ادھر لارا اپنی زخمی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے تھامے کراہ رہی تھی۔ اس کا سارا اعتماد ایک گولی کھا کر ہی ختم ہو گیا تھا۔ اسے اپنے اندازے کی درستگی کا ثبوت مل چکا تھا کہ دو رام کا اپنی ہر دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی نیت بھی رکھتا ہے۔

”اپنا کوٹ اتار کر پھینک دو۔“ معاذ نے اس کی کراہوں کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں حکم دیا۔ تکلیف میں مبتلا ہونے کے باوجود لارا نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی لیکن یہ عمل اس کے لیے شدید تکلیف دہ ثابت ہوا اور کوٹ کے جسم سے الگ ہونے تک کراہوں اور خون کے اخراج میں مزید تیزی آ گئی۔

”اس کا کوٹ چیک کر لو اور تم اس کی جامہ تلاشی لو۔“ معاذ نے ڈکی کے ساتھ ساتھ گل خان کی مداخلت کے باعث تلاشی لینے سے رک جانے والے آدمی کو بھی حکم دیا۔

”پہلے میرے زخم کی بینڈیج تو کروا دو۔ اگر اس طرح خون بہتا رہا تو میں مر جاؤں گی۔“ لارا نے کراہتے ہوئے احتجاج کیا۔

”تلاشی کا عمل پورا ہونے سے پہلے تمہیں کوئی رعایت نہیں دی جائے گی۔ اب تم فیصلہ کر لو کہ تم کتنی دیر تک اپنے زخم سے خون بہانا افورڈ کر سکتی ہو۔“ معاذ اسے کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ وہ ان لوگوں کی ساتھی تھی جنہوں نے اس سمیت کئی لوگوں کی زندگیاں برباد کر کے رکھ دی تھیں۔ دوسرے یہ کچھ دیر قبل وہ جس سفاکانہ انداز میں گل خان کا استحصال کر رہی تھی، وہ منظر بھی پوری طرح اس کے ذہن میں تھا اور وہ نہیں سمجھتا تھا کہ ایسی سفاک عورت کسی رو رعایت کی حقدار ہو سکتی ہے۔

”او کے۔“ لارا کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ کچھ دیر بعد اس کی جامہ تلاشی کا عمل مکمل ہوا تو ایک چھوٹا لیڈیز پسٹل اور پنڈلی سے بندھا چمکیلی دھار کا خنجر مزید برآمد ہو گیا۔ ہتھیاروں کے علاوہ انہوں نے اس کے جسم پر موجود چند ایک زیورات بھی اتروا لیے تھے۔ کوٹ کی جیبوں سے برآمد ہونے والی اشیا الگ تھیں۔ ان اشیا میں ایک سیل فون، پسٹل اور ٹریکنگ ڈیوائس قابل ذکر تھیں۔

”اس سارے سامان کو یہاں سے لے جاؤ اور لے جا کر کسی کھائی یا گڑھے میں پھینک دو۔“ ڈکی کو حکم دیا تو اس کا ساتھی فوراً حرکت میں آ گیا۔ ٹریکنگ ڈیوائس

یہاں موجود رہنا سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ اگر دشمنوں کو اس کی وجہ سے ان کی لوکیشن پتا چل جاتی تو ان کے ہاتھ سے اتنا محفوظ مقام نکل جاتا۔ اس کام کے ساتھ دوسرا کام لارا کی زخمی کلائی پر بینڈیج کرنے کا کیا گیا۔

”مجھے کوئی پین کلر بھی دو۔ میرے زخم میں شدید تکلیف ہو رہی ہے۔“ بینڈیج ہو چکنے کے بعد لارا نے کراہتے ہوئے مطالبہ کیا۔

”اس کے لیے تمہیں قیمت ادا کرنا پڑے گی۔“ معاذ نے مسکراتے ہوئے ایسے اسے جواب دیا جیسے کوئی کاروباری معاہدہ کر رہا ہو۔

”کیسی قیمت؟“ وہ سن کر بڑبڑائی۔

”تمہیں میرے سوالوں کے جواب دینا ہوں گے۔“ اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

”تم پوچھو، میرے لیے جس سوال کا جواب دینا ممکن ہوا دے دوں گی۔“ اس کی رنگت زردی مائل ہو رہی تھی۔ ایک طرف تکلیف شدید تھی تو دوسری طرف خون بھی اچھا خاصا بہہ گیا تھا تو نقاہت تو ہونی تھی۔

”ناممکن کو ممکن بنانا میری ذمے داری ہے۔ مجھے اچھی طرح سکھایا گیا ہے کہ جب کسی زخم کو بالخصوص اگر وہ گولی سے لگا ہو اور اس نے ہڈی کو متاثر کیا ہو تو کہاں اور کیسے ضرب لگائی ہے کہ آبجیکٹ کو زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچے اور وہ بلبلا اٹھے۔“ سرد لہجے میں دیے گئے اس کے جواب نے لارا کا چہرہ دھواں دھواں کر دیا۔

”اپنا مکمل تعارف کرواؤ۔“

”میرا نام لارا ہے اور میں ایک ماہر نفسیات ہوں۔ میں امریکن [illegible] ہولڈر ہوں اور پہاڑوں میں گھومنا پھرنا پسند کرتی ہوں۔ یہ شخص جسے تم نے باندھ رکھا ہے، اسے میں نے بطور پورٹر اپنے لیے ہائر کر رکھا ہے۔“

”صرف اپنے بارے میں بات کرو۔ یہ شخص کون ہے، اسے ہم تم سے بہتر جانتے ہیں۔“ معاذ نے اس کے جھوٹ پر اسے ٹوکا تو وہ تھوڑی سی کھسیانی ہو گئی لیکن اپنے بیان میں کوئی ترمیم نہیں کی۔

”ڈیوڈ نے تمہیں اور گل خان کو کیپ کیوں بھجوایا ہے؟“ معاذ نے بھی باقی ساری باتیں چھوڑ کر اس سے براہ راست یہ اہم سوال کیا۔ لارا نے جس قدر گرم لباس پہن رکھا تھا، اسے دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس ماحول اور موسم کی عادی نہیں ہے اور اسے یہاں آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے۔

”ک۔۔۔ کون ڈیوڈ؟“ وہ شاید فوری طور پر اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی اس لیے تھوڑی سی بڑبڑا گئی مگر اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی۔ مجروح کلائی پر معاذ کی جوتے کی نوک سے لگائی گئی ٹھوکر نے اسے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ حقیقتاً وہ زندگی میں پہلی بار ایسی تکلیف سے گزر رہی تھی۔

”میں اس ڈیوڈ کی بات کر رہا ہوں جو بھارت میں تمہاری شیطانی تنظیم کا نمائندہ ہے اور اپنی شیطانی تنظیم کے لیے وہاں سے چیلے جمع کرتا رہتا ہے۔ اگر اب بھی اس کے سلسلے میں تمہاری یادداشت واپس نہ آئی ہو اور اس کی مزید سروس کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں تمہارا مکمل علاج کر دوں گا۔“ اس نے اپنی ٹانگ کو جنبش دی تو لارا خوفزدہ ہو گئی۔

”نہیں۔۔۔ پلیز نہیں۔“

”تو میرے سوالوں کا فوری اور درست جواب دو۔“ معاذ کے لہجے کی سختی کم نہیں ہوئی۔

”میں اس شخص کو اچھی طرح نہیں جانتی۔ مجھے حال ہی میں امریکا سے ہائر کر کے یہاں لایا گیا ہے۔ معاوضہ اتنا پُرکشش تھا کہ میں انکار نہیں کر سکی۔ پہلی اسائنمنٹ کے طور پر اس شخص کو میرے حوالے کیا گیا تھا اور مجھے اس کے دماغ میں ہر چیز کے خلاف خوف پیدا کرنا تھا۔ ایسا خوف جو اس کی قوت عمل کو ختم کر دے۔ کچھ دیر پہلے شاید تم نمونہ دیکھ ہی چکے ہو۔“ اس نے معاذ کو وہ منظر یاد دلایا جسے وہ بھولا ہی نہیں تھا اور جس نے پہلی بار میں ہی اس کے دل میں لارا کے لیے نفرت بھر دی تھی۔

”تم سچ نہیں بول رہی ہو۔ تم مجھ سے اپنی حقیقت چھپا رہی ہو۔“ وہ شدید طیش کے عالم میں اس کی طرف بڑھا۔ لارا نے بے ساختہ ہی اپنا مجروح کلائی والا ہاتھ پیچھے کیا۔ حرکت کرنے سے اسے ہاتھ میں شدید تکلیف محسوس ہوئی لیکن یہ تکلیف بہرحال کلائی پر ٹھوکر کھانے کے مقابلے میں کم تھی۔ مگر اس بار معاذ کا نشانہ اس کا ہاتھ تھا ہی نہیں۔ اس نے بالکل اچانک جھپٹ کر لارا کے جبڑوں کو اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لے لیا تھا کہ ایک طرف سے انگلیوں اور دوسری طرف سے انگوٹھے نے اندر تک کھب کر اس کا منہ کھول ڈالا تھا۔ اس کھل جانے والے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس نے باہر نکالا تو اس کی انگلیوں کی گرفت میں ایک چھوٹا سا کیپسول دکھائی دے رہا تھا۔

”کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ امریکا میں پریکٹس کرنے والی

ایک عدد سی سادی ڈاکٹر کی ڈاڑھ میں تیز زہر کا کیپسول کیوں موجود تھا؟'' اس نے کیپسول کو لارا کی آنکھوں کے سامنے نچایا۔

''میں.... میں نہیں جانتی۔'' اس کے پاس نظریں چرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

''لیکن میں جانتا ہوں۔ یہ کیپسول تمہاری شیطانی تنظیم کے لیے کسی مشن پر جانے والے ہر شخص کے دانت میں رکھا جاتا ہے اور حکم ہوتا ہے کہ جب تم مخالفین کے قبضے میں خود کو بالکل بے بس پاؤ تو اس کیپسول کو چبا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لو۔ تمہاری یقیناً ابھی یہ امید باقی تھی کہ کچھ دیر میں کیمپ سے کوئی تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آ جائے گا اور تم بچ جاؤ گی اس لیے تم نے اس کیپسول کے استعمال میں تاخیر کر دی۔'' معاذ کی ہر بات ٹھیک تھی۔ لارا نے کسی قسم کی تائید یا تردید نہیں کی اور شکست خوردہ انداز میں سر جھکا لیا۔

''تو پھر اب.... تم میرے سوالوں کے جواب دو گی یا مجھے اس کے لیے مزید محنت کرنا ہوگی؟'' معاذ نے طنز سے پوچھا۔

''تم مجھے گولی مار دو۔'' لارا نے جواب دیا۔ ابھی اس کا جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ معاذ نے گولی چلا دی۔ اس بار گولی نے اس کی دوسری کلائی کو نشانہ بنایا تھا۔ لارا کی چیخ نے غار کی محدود فضا کو لرزا کر رکھ دیا۔ یہ اچھا تھا کہ غار کے دہانے کو پتھر سے بند کر دیا گیا تھا ورنہ چیخ دور تک جا کر اس کے ہمدردوں کو اس کی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔

''میں تمہاری فرمائش پوری کرنے کے لیے تمہیں اتنی گولیاں ماروں گا کہ تمہارے ہاتھ پیروں میں شہد کے چھتے کی طرح سوراخ ہو جائیں گے لیکن پھر بھی تم موت کو ترسو گی۔'' وہ اتنی بے رحمی سے لارا کو اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کر رہا تھا کہ غار میں موجود اس کے ساتھی بھی جھرجھری لے کر رہ گئے۔

''پلیز! مجھے جان سے مار دو۔'' وہ گڑگڑائی۔

''میرے سوالوں کے جواب دو پھر مر جانا۔'' اس کا لہجہ بے لچک تھا۔

''نہیں دے سکتی۔ میں نے مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھائی تھی۔'' وہ درد سے تڑپ رہی تھی لیکن قسم توڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''قسم کا کفارہ آسان ہوتا ہے لیکن اپنے ہاتھ پیر کھونے کے بعد کی زندگی بہت مشکل ہوتی ہے۔'' ماہر نفسیات وہ بھی تھا لیکن اس وقت وہ اسے نفسیاتی دباؤ میں لے چکا تھا۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے دوسری کلائی سے نکلتے خون کو دیکھ رہی تھی۔

''ڈریسنگ کرو میڈم کے زخم کی۔'' [illegible] پہلے زخم کی ڈریسنگ کی تھی، اسے حکم دیتے ہوئے معاذ کے لہجے میں تھوڑا بدلاؤ آیا۔ شاید اسے لارا پر رحم آ گیا تھا لیکن پھر نظریں زمین پر پڑے گل خان سے جا ٹکرائیں۔ بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا لیکن مستقل بچھے جا رہا تھا کہ کسی طرح اپنی بندشیں کھول کر لارا کی مدد کے لیے میدان میں اتر جائے۔ دوستوں کو چھوڑ کر دشمن سے ہمدردی کرنے جیسا انقلابی کام کرنا اس عورت کا کارنامہ تھا جو اس وقت اس کے سامنے قابلِ رحم حالت میں موجود تھی۔

''تو پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟'' ڈریسنگ کا عمل مکمل ہو گیا تو وہ ایک بار پھر لارا کے سامنے جا ڈٹا۔ اب تک زانگ سمیت کسی نے بھی اس کے کام میں مداخلت نہیں کی تھی اور صبر سے نتیجہ برآمد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

''تم کیا جاننا چاہتے ہو؟''

''سچ.... بغیر کسی جھوٹ کی ملاوٹ کے۔''

''ڈیوڈ نے مجھے اس لیے یہاں بھیجا تھا کہ جیسے ہی تم لوگوں کو گرفتار کر کے کیمپ پہنچایا جائے، ویسے ہی میں گل خان کی طرح تمہارے دماغوں کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لوں۔ تمہارے دماغوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد تمہاری مخصوص انداز میں تربیت کی جاتی اور پھر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا۔'' یقیناً اس کے لیے تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی اس لیے مزید مزاحمت کیے بغیر سچ بولنا شروع کر دیا۔

''اس کا مطلب ہے تم مجھے اور میرے ساتھیوں کو پہچانتی ہو۔''

''مجھے تم لوگوں کی تصاویر دکھائی گئی تھیں۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''یقیناً کیمپ میں اس بات کا انتظار ہو رہا ہوگا کہ تمہارے ساتھی ہم لوگوں کو گرفتار کر کے لے آئیں؟''

''ہاں بلکہ اب تھوڑی پریشانی بھی شروع ہو گئی تھی کہ اس کام کے لیے جانے والی ٹیم لیٹ کیوں ہو گئی ہے۔ کل ڈیوڈ سے اس سلسلے میں بات بھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک دو دن انتظار کرنے کو کہا کیونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ پہاڑوں میں موسم طے شدہ شیڈول کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ کیمپ میں اب اتنے لوگ نہیں بچے ہیں کہ

انہیں پہلی ٹیم کی تلاش میں بھیجا جا سکے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو یہاں کی حفاظت اور نگرانی کے لیے لوگوں کی کمی ہو جاتی۔''

''بھیجی جانے والی ٹیم سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا؟''

''یہاں سیٹلائٹ فون ہی رابطے کا واحد ذریعہ ہے۔ کیمپ میں موجود دو میں سے ایک سیٹ خراب پڑا ہوا تھا اور باقی بچ جانے والا ایک سیٹ ڈیوڈ سے رابطے کے لیے لازمی تھا اس لیے جانے والی ٹیم کو ایسے ہی جانا پڑا۔ کیا تم بتاؤ گے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا؟'' اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ہی لارا نے تجسس سے پوچھا۔

''سارے کے سارے جہنم چلے گئے۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا تو لارا کو چپ لگ گئی۔ اپنے جانبازوں کی موت کی خبر فطری طور پر اس کے لیے دکھ کا باعث تھی۔

''یہ بتاؤ کہ ساری دنیا چھوڑ کر تم لوگوں نے اپنا تربیتی کیمپ اس سرد جہنم میں کیوں قائم کیا جہاں آمد و رفت بھی مشکل ہے اور رہنا بھی؟''

''میری معلومات کے مطابق ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ جگہ کسی کی بھی عملداری سے بہت دور بالکل الگ تھلگ ہے اور اسی خوبی کی وجہ سے ابھی تک کسی کی نظر میں نہیں آئی ہے۔ ڈیوڈ غیر معمولی خصوصیات رکھنے والا شخص ہے۔ جوانی میں اس نے ان پہاڑوں میں بہت سفر کیا ہے۔ کیمپ کا علاقہ اس کی ذاتی دریافت ہے۔ پہلے اس نے میدانی علاقے میں ہی کیمپ بنا رکھا تھا لیکن وہاں تک کوئی نہ کوئی رسائی حاصل کر لیتا تھا یا پھر زیرِ تربیت افراد میں سے بھی کسی کو بھاگنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس نے یہ جگہ دریافت کی تو اس کے دل کو بھا گئی۔ یہاں سے کسی کے بھاگ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہر ایک جانتا ہے کہ اس نے ایسی کوشش کی تو پہاڑوں میں بھٹک کر سردی اور بھوک سے ہی مر جائے گا۔'' اس نے معاذ کے سوال کا اچھا خاصا تفصیلی جواب دیا۔ اس کے بعد وہ اس سے کیمپ میں موجود افراد کی تعداد، سہولیات اور دیگر تفصیلات کرید کرید کر معلوم کرتا رہا۔ ان معلومات کو زانگ سمیت ان سب نے ذہن نشین کر لیا۔

''ہمیں حیدرآباد کے مضافاتی علاقے میں ڈیوڈ کے جس بنگلے میں بے ہوش کیا گیا، وہاں ہمارے ساتھ ایک بچہ بھی موجود تھا۔ تم اس بچے کے بارے میں کچھ جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے؟'' معاذ ضروری معلومات حاصل کرنے کے

جب اس نے لارا سے اعظم کے متعلق سوال کیا تو اس نے فوری جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔

"کہاں ہے وہ بچہ؟ کہیں تم لوگوں نے اسے قتل تو نہیں کر دیا؟" اسے لارا کی خاموشی چبھی اور جذبات میں اس کا بازو پکڑ کر زور سے ہلایا۔ یوں بازو ہلانے سے اس کی کلائی کے زخم میں درد کی ٹیسیں اٹھیں تو وہ کراہنے لگی پھر آہستہ سے بولی۔

"وہ زندہ ہے۔ پہلے ڈیوڈ کا ارادہ اسے خود پالنے اور تربیت دینے کا تھا لیکن پھر اسے پاکستان بھجوا دیا۔"

"پاکستان..... پاکستان میں کس کے پاس؟" وہ بیتاب ہوا۔

"میڈم ایکس کے پاس۔"

"مگر کس لیے؟"

"میڈم ایکس کو زیر بار کرنے کے لیے اور تنظیم کے بڑوں کو یہ باور کروانے کے لیے کہ وہ تنظیم سے اتنا مخلص ہے کہ تنظیم کے مفاد میں کسی سے اپنی مسابقت کو بھی اہمیت نہیں دیتا۔"

"مطلب اس کی میڈم ایکس سے مسابقت ہے؟"

"ہاں۔" لارا نے محض ایک لفظی جواب دیا۔

"میڈم ایکس، اعظم کا کیا کرے گی؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا پتا ہے کہ پاکستان میں اس کے لیے حالات زیادہ موافق نہیں ہیں۔ کچھ انتظامی مسائل ہیں اور کچھ مخالفین سے ٹکراؤ۔"

"کون مخالفین؟" معاذ حیران ہوا۔

"میں نہیں جانتی۔ مجھے ہر بات کی تفصیل معلوم نہیں ہوتی ہے۔" اس نے بیزاری سے جواب دیا اور پھر التجائیہ لہجے میں بولی۔

"پلیز! مجھے کوئی پین کلر دو۔ میرے لیے یہ تکلیف ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔"

"اوکے، دیکھتے ہیں۔" وہ پیچھے ہٹ گیا اور زانگ کو اشارہ کیا کہ لارا کو پین کلر دے دی جائے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ حقیقتاً بہت تکلیف میں ہے اور اسے باقاعدہ علاج کی ضرورت ہے۔ یہاں اس کے زخموں پر جو بینڈیج کی گئی تھی، وہ محض ایک عارضی انتظام تھا۔

ابھی لارا کو پین کلر دیا ہی جا رہا تھا کہ ہلکے ہلکے دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہاں موجود ہر شخص ہی چونک اٹھا۔ اس لیے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ گولیاں چلنے کی آوازیں تھیں جو بند غار میں ہونے کے باعث مدھم سنائی دے رہی تھیں۔ زانگ تاؤ جلدی سے باہر موجود اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرنے لگا۔ گفتگو چینی زبان میں تھی۔ زانگ بات کر کے فارغ ہوا تو سب کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھی ہوئی دیکھیں۔

"ایک ٹولی شاید ان دونوں کی تلاش میں نکلی تھی جس کی ہمارے آدمیوں سے مڈبھیڑ ہو گئی ہے اور اب ان کے درمیان فائرنگ ہو رہی ہے۔" اس نے لارا اور گل خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صورت حال سے آگاہ کیا۔

"ہمیں ان کی مدد کے لیے جانا چاہیے۔ میں اور جارو جائیں گے۔" معاذ نے فوری فیصلہ سنایا۔

"میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔" وکی کی بے چینی بڑی بے قرار ہوئی۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہیں رکو۔" معاذ نے تحکمانہ لہجے میں اس سے کہا اور ساتھ ہی آنکھ سے خفیف سا اشارہ کیا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔" وکی مایوسی کی اداکاری کرتے ہوئے ڈھیلا پڑ گیا لیکن اس نے معاذ کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ وہ گل خان اور لارا کو زانگ اور اس کے ساتھی کے ساتھ تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے کی ہامی بھر لینے کے باوجود وہ معاذ تھا اور کسی بھی معاملے میں ان پر اندھا اعتماد نہیں کرتا تھا۔

"اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔ یہ تمہاری مدد کرے گا۔" زانگ نے اپنے ساتھی کو بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ وہ لوگ غار کا پتھر ہٹا کر باہر نکلے اور ایک بار پھر راستے کو بند کر دیا۔ باہر نکلتے ہی فائرنگ کی آوازیں تیز ہو گئی تھیں جس سے انہیں سمت کا اندازہ کرنے میں آسانی رہی۔ دونوں گروہ بڑے پتھروں اور چھوٹی چٹانوں کی آڑ لیے ایک دوسرے کے مقابل ڈٹے ہوئے تھے اور دونوں ہی طرف سے شدت سے فائرنگ کی جا رہی تھی۔

"ہم وہاں اوپر چڑھ کر دیکھتے ہیں۔ یہاں سے تو کچھ اندازہ ہی نہیں ہو رہا کہ ہمارے ساتھی کس طرف ہیں اور مخالفین کس طرف؟" جارو نے تجویز پیش کی جو معاذ کو پسند آئی۔ ان دونوں نے تیز لیکن محتاط قدموں سے قریب موجود ایک نسبتاً اونچی پہاڑی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ان کا تیسرا ساتھی بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ وہ چھوٹی سی پہاڑی زیادہ دشوار گزار نہیں تھی اس لیے وہ جلد ہی اوپر پہنچ گئے۔ اوپر پہنچ کر معاذ اپنی رائفل پر فٹ دوربین سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ کھلے میں مقابلے کے پیش نظر اس

نے دور مار رائفل کے استعمال کا فیصلہ کیا تھا اور چھوٹی گن ہولسٹر میں رکھ لی تھی۔

"ہمارے ساتھی دائیں طرف ہیں اور دشمن بائیں طرف۔ میرے خیال میں ہم یہاں سے انہیں بہ آسانی نشانہ بنا سکتے ہیں۔" جارو نے جو اس کے ساتھ ہی جائزہ لینے میں مصروف تھا صورت حال واضح ہوتے ہی پرجوش سے بول پڑا۔ معاذ نے زانگ کے ساتھی کے بازو پر ہاتھ مار کر اسے بھی اشارے سے بتایا کہ کس سمت فائر کرنا ہے اور پھر شست باندھتے ہوئے اللہ کا نام لے کر پہلا فائر کیا۔ اس کا نشانہ ایک بڑے پتھر کے پیچھے موجود اونی ٹوپی والا سر تھا۔ گولی نے سائیں کی آواز کے ساتھ کسی طائر برق رفتار کے مانند اس سر تک کا سفر طے کیا اور سر یکدم ہی نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ سفید برف پر گرتے خون کی سرخی نے نشانہ بننے والے کے اس کا نشانہ بنا ہونے کی نوید دی۔ باقی دو نشانچیوں کے نشانے بھی خطا نہیں گئے تھے۔ اچانک گرنے والی تین لاشوں نے مخالفین کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ بوکھلاہٹ میں ان سے غلطیاں ہو گئیں۔ دو افراد نے شاید اپنی موجودہ کمین گاہ کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے پوزیشن بدلنے کی کوشش کی اور صرف اسی وجہ سے نظروں میں آ گئے۔ ایک نے فائرنگ کی سمت کا تعین کیے بغیر سوچے سمجھے جوش میں اپنی رائفل کا رخ اس طرف کر کے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ان غلطیوں کا انہیں بھاری خمیازہ بھگتنا پڑا۔ پوزیشن تبدیل کرنے کی کوشش کرنے والوں کو معاذ اور جارو کی رائفل سے نکلی گولیوں نے دوسری پوزیشن تک پہنچنے سے پہلے ہی چاٹ لیا۔ دوسری طرف جب دائیں جانب موجود ان کے ساتھیوں کو مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا تو وہ دلیری سے آگے بڑھے اور منٹوں میں ہی وہاں کا نقشہ بدل کر رہ گیا۔ وہ تینوں اوپر سے نیچے اترے تو دشمن کی لاشیں گری پڑی تھیں اور ایک زندہ بچ جانے والے شخص کی مشکیں کسی جا رہی تھیں۔ انہوں نے اس شخص کو بھی اپنے ساتھ غار میں لے جا کر اس سے پوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ غیر متوقع طور پر دریافت کیا گیا وہ غار ان کے لیے نعمت ثابت ہوا تھا اور کسی آپریشن کنٹرول روم جیسی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

"بہت بڑھیا۔ تمہاری دور اندازی نے یدھ کا فیصلہ منٹوں میں کر دیا۔" وہ قیدی کے ساتھ غار میں پہنچے تو زانگ نے سراہا۔ یقیناً اسے باہر موجود اس کے ساتھی نے پہلے ہی اپڈیٹس پر رپورٹ دے دی تھی۔

"میرے خیال میں اب ہمیں کیمپ پر فیصلہ کن حملہ کرنے میں بھی تیزی دکھانا ہوگی۔ اس جھڑپ نے ہماری یہاں موجودگی کا راز پوری طرح کھول کر رکھ دیا ہے۔ ہم نے حملے میں دیر کی تو انہیں اپنے دفاع کے لیے بہتر حکمت عملی طے کرنے کا موقع مل جائے گا۔" معاذ کے لیے موجودہ کامیابی سے زیادہ اصل ٹارگٹ کی اہمیت تھی۔ زانگ بھی اس بات کو سمجھ گیا اور ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کو احکامات جاری کرنے لگا۔ معاذ کو اس کی چینی بات سمجھ آئی، اس سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ انہیں آگے بڑھنے کے لیے تیار رہنے اور اسلحہ بارود کو سنبھالنے کی تاکید کر رہا ہے۔

"اس کا کیا کرنا ہے؟" اپنے کام سے فارغ ہو کر زانگ نے ساتھ آئے قیدی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ چھوٹے قد کا سانولا سا آدمی تھا اور ایک تنگ بندھی ہوئی حالت میں پڑے گل خان اور زخمی لارا کو گھور رہا تھا۔

"اس کی بات نہ مان کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ اگر تم بات مان لیتیں اور کیمپ سے باہر نہ نکلتیں تو ہم سب اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے۔" اس نے اپنے متعلق زانگ کے سوال کو نظر انداز کیا اور نفرت بھرے لہجے میں لارا سے مخاطب ہوا۔ اس کا طعنہ سن کر لارا کے پاس نظریں جھکا لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"عورت ہمیشہ اپنے ساتھ مصیبت لاتی ہے۔ میں اس کی آمد کے ساتھ ہی کسی مصیبت کا انتظار کرنے لگا تھا۔" اس شخص کے الفاظ اس کی تنگ نظری کا اظہار کر رہے تھے۔ بہرحال وہاں کسی کو اس کی ذاتی سوچ سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے کسی نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ البتہ معاذ ایک نتیجے پر پہنچ گیا اور گلا کھنکھارتے ہوئے اس شخص سے مخاطب ہوا۔

"تم مجھے خاصے عقلمند آدمی لگتے ہو اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ اس میڈم کی طرح اپنا سر مصیبت بنا کر جان کھونے کے بجائے آرام سے ہمارے ساتھ تعاون کرو گے اور ہمیں ہماری مطلوبہ معلومات فراہم کرو گے۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" اس نے بالآخر کچھ سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہاں سے کیمپ تک کا مختصر ترین راستہ اور کیمپ پر موجود تمہارے ساتھیوں کی تعداد؟"

"اس کے بدلے مجھے کیا ملے گا؟" وہ باقاعدہ سودے بازی کی کوشش میں تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" معاذ نے الٹا اسی سے پوچھا۔

"اپنی زندگی کی ضمانت اور کسی محفوظ مقام تک پہنچنے

کے لیے زادِ راہ۔" اس نے اپنا دو نکاتی مطالبہ پیش کیا تو معاذ نے زانگ تاؤ کی طرف مشورہ طلب نظروں سے دیکھا۔ اس نے سر کی خفیف سی جنبش سے اسے ہامی بھر لینے کا اشارہ دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم راضی ہیں۔ اب تم بتاؤ جو بتا سکتے ہو۔"

"اس وقت کیمپ کی حفاظت کے لیے صرف پانچ بندے موجود ہیں۔ رہی کیمپ تک کے مختصر فاصلے کی بات تو وہاں تک میں خود تمہاری راہنمائی کروں گا۔" اس کا اس قدر تعاون بھی انہیں مشکوک کر رہا تھا۔

"کتنے گھٹیا ہو تم جو اپنے مفاد کے لیے اتنی آسانی سے بک گئے ہو۔" سب حتیٰ کہ لارا کا ضبط جواب دے گیا تو اس نے اس شخص کو لتاڑ دیا۔

"تمہارے آگے تو چھوٹ کر زبان کھولنے والوں کو بھی اعلیٰ ہونے کا سرٹیفکیٹ نہیں دیا جاسکتا۔" شرمندہ ہونے کے بجائے اس نے لارا پر جوابی وار کیا اور جتا دیا کہ کیسے بھی سہی زبان اس نے بھی کھولی ہے۔

"مجبوری اور مفاد پرستی میں بہت فرق ہوتا ہے۔" لارا تڑخی۔

"مجبور ہو کر گھٹنے ٹیک دینے کے مقابلے میں سے پر سودے بازی کر لینا دانائی ہے۔ تم جسے مفاد پرستی کہہ رہی ہو میرے نزدیک وہ دانائی ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ لارا نے جواب میں کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن زانگ تاؤ نے بلند آواز میں اسے روک دیا۔

"بند کرو تم دونوں اپنی بک بک۔ ہمارے پاس یہ ساری بکواس سننے کا وقت نہیں ہے۔" اس نے دونوں کو سختی کے ساتھ ڈانٹ پلائی پھر قیدی کی طرف رخ کر کے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"رادھے.... رادھے موہن۔"

"ٹھیک ہے رادھے! تم ہمیں کیمپ تک مختصر اور محفوظ راستے سے لے کر جاؤ گے۔ یہ بتاؤ کہ کیا اس راستے کو طے کرنے کے لیے کسی خاص تیاری کی ضرورت پڑے گی؟"

"نہیں۔ بس بندے فٹ اور ایکٹیو ہوں تو کافی ہے۔" رادھے کا جواب ان کے لیے اطمینان بخش تھا۔ ان سب میں ایک جارو ہی تھا جس کا بازو ڈاول اینڈ ہم کے حملے میں کچھ مجروح ہوا تھا لیکن اس نے ریکور کر لیا تھا اور اس سارے سفر کے دوران کسی تکلیف کی شکایت نہیں کی تھی۔

"پھر کیا سوچنا ہے، سفر شروع کریں؟" اس بار زانگ معاذ سے مخاطب ہوا۔

"بالکل۔ بغیر کوئی وقت ضائع کیے۔" معاذ نے جواب دیا تو وہاں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ زانگ نے اپنے ساتھیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کی ہدایت کی۔ معاذ اور اس کے ساتھیوں کی ترجیح اپنے لیے موزوں اسلحہ بارود کا انتخاب تھا۔

"لارا اور گل خان کا کیا کریں گے؟ انہیں چھوڑ کر جانا ہے یا اپنے ساتھ لے جائیں گے؟" دستی بموں کو اپنی جیکٹ کی جیبوں میں منتقل کرتے ہوئے وکی نے سرگوشی میں معاذ سے دریافت کیا۔

"تم کیا کہتے ہو؟" معاذ نے اسی کی رائے طلب کی۔

"اگر ان لوگوں کو یہاں چھوڑا تو ہم میں سے کسی ایک کو لازماً یہاں رکنا پڑے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا آگے کے ساتھ جانا زیادہ ضروری ہے۔" وکی نے کھل کر اپنی رائے دی۔

"ٹھیک ہے، میں زانگ سے بات کرتا ہوں۔" معاذ نے اس سے کہا اور خود زانگ کی طرف بڑھ گیا۔

"ساتھ لے جانے میں یہ دونوں ہمارے لیے مسئلہ بن جائیں۔ لارا زخمی ہونے کی وجہ سے نقاہت کا شکار ہے اور یہ آدمی کسی بے تھے بیل کی طرح بدکا ہوا ہے۔" زانگ نے اس کی بات سن کر تشویش کا اظہار کیا۔

"ان دونوں کی نگرانی کے لیے کسی کو یہاں چھوڑ کر اپنی افرادی قوت کم نہیں کر سکتے۔ رادھے نے ہمیں کیمپ پر پانچ آدمیوں کی موجودگی کا بتایا ہے لیکن یقین نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ ایسے میں ہماری اپنی نفری پوری ہونی چاہیے۔" اس کی دلیل بھی زانگ کے نزدیک درست تھی۔

"لارا اور گل خان کے مسئلے کا حل میں نکالتا ہوں۔" اس نے زانگ کو تسلی دی اور خود لارا کی طرف بڑھ گیا۔ نڈھال سی غار کی ایک دیوار سے پشت ٹکائے نیم دراز وہ اپنے اردگرد جاری سرگرمی کو دیکھ رہی تھی۔

"ہم تمہیں اور گل خان کو بھی اپنے ساتھ کیمپ تک لے کر جائیں گے اس لیے خود کو چلنے کے لیے ذہنی طور پر تیار رکھو۔" اس نے لارا کو اطلاع دی۔

"میں بہت کمزوری فیل کر رہی ہوں۔ مجھ سے اب اتنا نہیں چلا جائے گا۔ بہتر ہے تم لوگ مجھے یہیں چھوڑ دو۔" لارا کا جواب اس کے لیے خلاف توقع تھا۔

"اس صورت میں تمہیں یہاں اکیلا رہنا پڑے گا اور حالات کا کچھ پتا نہیں ہے کہ ہم لوٹ کر اس طرف آ بھی

سکیں یا نہیں۔ ایسی صورت میں تم یہاں بھوکی پیاسی مر جاؤ گی اور یقیناً یہ ایک دردناک موت ہو گی۔" اس نے ایک اور رخ پیش کیا کہ لارا کانپ کر رہ گئی پھر مایوسانہ لہجے میں بولی۔

"میرا کوٹ تم لوگوں نے پھنکوا دیا ہے۔ اتنی خراب جسمانی حالت میں، میں گرم کوٹ کے بغیر اس علاقے میں کیسے سروائیو کروں گی؟"

"تمہیں طاقت کا انجکشن اور گرم کوٹ فراہم کر دیا جائے گا لیکن اس کے بدلے تمہیں بھی ایک کام کرنا ہوگا۔" معاذ نے مشروط پیشکش کی۔

"کیسا کام؟"

"تمہیں گل خان کو یقین دلانا ہوگا کہ وہ میری ہدایات پر عمل کرے اور ایسی کوئی حرکت نہ کرے جو ہمارے لیے مسئلہ پیدا کرے۔"

"وہ تو ایک دماغ کا بندہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی گارنٹی کیسے دی جاسکتی ہے۔" چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں۔ لارا نے بھی خود کو انجان اور معصوم ظاہر کر کے معاذ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی۔ معاذ کو اس کی اس حرکت پر اتنا شدید غصہ آیا کہ اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا اور دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

"مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ تمہارا معمول ہے اور اس وقت صرف تم ہی ہو جو اس کے دماغ میں کوئی بات بٹھا سکتی ہو۔"

"تمہارے اس سلوک کے بعد میں تمہاری بات ماننے سے انکار بھی کر سکتی ہوں۔" زیادہ تر لوگ غار سے باہر نکل چکے تھے لیکن جو چند رہ گئے تھے، ان کی موجودگی میں اپنے ساتھ اس سلوک پر لارا کو غصہ آ گیا۔ شاید یہی کھل جانے کے بعد وہ پرسکون تھی اس لیے اتنے سر اٹھانے کی ہمت بھی آ گئی تھی۔

"تمہارے انکار پر کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔ میرے پاس تمہیں یہاں بے یار و مددگار چھوڑ جانے اور خان کو باندھ کر اپنے ساتھ لے جانے کا آپشن موجود ہے۔ میرے پاس تھوڑا مشکل سہی، حل موجود ہے لیکن تمہارے پاس اس حالت میں یہاں اکیلے سروائیو کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔" معاذ نے اس کے بال چھوڑ دیے اور نہایت ٹھنڈے لہجے میں حالات کی سنگینی کا احساس دلایا۔

لارا خود بھی کوئی جذباتی اور نا سمجھ عورت نہیں تھی چنانچہ فوراً ہی صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی اور مری ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے لیکن اس کام کے لیے مجھے تنہائی کی ضرورت ہو گی۔"

"نو پرابلم۔ ابھی یہ غار مکمل خالی ہو جاتا ہے۔" معاذ نے اسے جواب دیا۔

زانگ آگے کی حکمت عملی طے کرنے اور اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے کے لیے پہلے ہی رادھے سمیت باہر جا چکا تھا۔ وکی بھی اس کے پیچھے ہی گیا تھا اس لیے وہاں اب صرف جارو اور زانگ کے دو آدمی موجود تھے۔ وہ تینوں اس کی ایما پر باہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

"جانے سے پہلے اس کا منہ کھول دینا۔" لارا کی یہ فرمائش گل خان کے لیے تھی۔ اس کی بات پر عمل کرتے ہوئے جیسے ہی گل خان کے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالا گیا، پہلے تو وہ تھوڑا سا کھانسا پھر مغلظات بکنے لگا۔ اتنی دیر بے بسی سے بندھے رہنے کے بعد اس کے اندر جو غصہ جمع ہو گیا تھا، اس کے اخراج کے لیے گالیوں سے بڑھ کر کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ معاذ نے خود بھی ان گالیوں کے لیے اپنے کان لپیٹ لیے اور باقیوں کو بھی ایسا ہی کرنے کا اشارہ کیا۔ ویسے بھی چینیوں کے لیے وہ گالیاں قابل فہم نہیں تھیں اور وہ صرف خان کے تاثرات سے ہی اندازہ لگا سکتے تھے کہ وہ انہیں برا بھلا کہہ رہا ہے۔ ایک ایک کر کے وہ سب غار سے باہر نکل گئے اور دہانے کو پتھر سے بند کر دیا۔ باہر نکلنے کے بعد معاذ نے چینیوں کو زانگ کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک تو چلا گیا لیکن دوسرا وہیں رکا رہا جیسے وہ ان پر مکمل اعتماد نہیں کر رہے تھے، وہ بھی ان پر مکمل اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ معاذ نے رکنے والے سے کوئی تعرض کرنے کے بجائے جارو کا ہاتھ پکڑ کر اس پر دباؤ ڈالا اور سرگوشی میں اس سے بولا۔

"دھیان سے سنو کہ لارا، گل خان کو کیا مشورے دے رہی ہے۔" جارو نے سر کو اثبات میں جنبش دی اور اپنی توجہ اس جانب مبذول کر لی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی اس کیفیت سے باہر آیا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

"بہت تیز عورت ہے۔ ان حالات میں بھی اپنی طرز سے باز نہیں آئی ہے۔ اس نے گل خان کو ہدایت دی ہے کہ کیمپ تک پہنچنے تک وہ بالکل پرسکون رہے گا اور چاہے کوئی بات ناگوار بھی گزرے تو رد عمل ظاہر نہیں کرے گا لیکن جیسے ہی فائرنگ اور ہنگامہ شروع ہو اسے موقع کا فائدہ

اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی ہتھیار حاصل کر کے ہم لوگوں کو چن چن کر ٹھکانے لگاتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے خان کو اپنی خصوصی حفاظت کا خیال رکھنے کی بھی ہدایت کی ہے۔"

"ناٹ بیڈ۔ میرے لیے اتنا بھی کافی ہے کہ خان راستے میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرے گا۔ باقی ہم کارروائی شروع کرنے سے پہلے اس کا انتظام کر دیں گے۔" معاذ کو لارا سے کسی شر پسندی کی امید تھی اس لیے جارو کی اس رپورٹ نے زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد لارا نے وہانے کے قریب آ کر پکارا تو وہ لوگ پتھر ہٹا کر دوبارہ غار میں آ گئے۔

"کام ہو گیا؟"

"چیک کر لو۔ اب وہ تمہیں دیکھ کر بھونکے گا نہ حملہ کرنے کی کوشش کرے گا۔" لارا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے خلاف ایک سازش تیار کر لینے پر اس کا خوش ہونا بنتا بھی تھا۔

"ہیلو گل خان!" معاذ گویا اس کے کہے کو چیک کرنے کے لیے گل خان تک جا پہنچا۔ گل خان نے اس کی آواز پر ردعمل ظاہر نہیں کیا اور سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"تمہیں میڈم نے بتا دیا ہے نا کہ اب تم اور ہم ایک ٹیم ہیں اور ساتھ مل کر کام کریں گے۔ کیا تم میری ہدایات پر عمل کرنے کو تیار ہو؟" گل خان کی طرف سے ردعمل نہ دیے جانے کے باوجود وہ اس سے مخاطب رہا اور بالآخر ایک ایسا سوال کیا جس کے جواب میں خان بے نیازی کو قائم نہ رکھ سکا اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ لب اب بھی خاموش تھے لیکن نگاہوں میں اس کے لیے نفرت اور حقارت لکھی تھی۔ معاذ کے دل کو دھچکا پہنچا۔ معصوم سی فطرت رکھنے والا گل خان جو کبھی اس سے بہت محبت کرتا تھا، آج نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ویلکم بیک... تم نے اپنا کہا پورا کیا۔ اب ہماری وعدہ پورا کرنے کی باری ہے۔ تمہارے لیے طاقت کا انجکشن اور گرم جیکٹ فراہم کی جا رہی ہے۔" وہ مزید گل خان کو نفرت بھری نظروں میں نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے رخ موڑ لیا اور چہرے پر جبری مسکراہٹ سجا کر لارا سے کہا۔ جواباً وہ بھی خوش دلی سے مسکرا دی۔

اس معاملے سے نمٹ کر وہ سب باہر زانگ اور اس کے ساتھیوں کے درمیان پہنچے تو وہ لوگ تیار ہو چکے تھے اور ان کے بیگ ان کے شانوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک ایک بیگ رادھے کے شانوں پر بھی دکھائی دے رہا تھا جنھیں حسب وعدہ اسے زاد راہ فراہم کر دیا گیا تھا۔

"ہم نے مجھے اور کھانے کا اضافی سامان ایک بیگ میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ بیگ میں کیول تھوڑے سے انرجی بسکٹس رکھے گئے ہیں جو ایمرجنسی سچویشن میں کام آئیں گے۔ کامیابی کی صورت میں ہم اپنا محفوظ ذخیرہ نکال کر واپسی کا سفر آرام سے طے کر سکتے ہیں۔" معاذ کے قریب پہنچتے ہی زانگ تاؤ نے اسے اب تک کی کارگزاری سے آگاہ کیا۔

"بہترین۔ میرے خیال میں اب ہمیں سفر کا آغاز کر دینا چاہیے۔" معاذ نے اسے سراہنے کے ساتھ ہی اگلی بات کی۔

"پہلے تم لوگ کچھ کھا پی لو۔ ہم سب نے کچھ نہ کچھ لے لیا ہے۔ صرف تم لوگ رہ گئے ہو یا تمہارا یہ ساتھی۔" زانگ نے اپنے ساتھ موجود وکی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم راستے میں ہی کھا لیں گے۔ اب مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔" اسے فکر تھی کہ دن نہ ڈھل جائے۔ اس صورت میں زانگ اور اس کے ساتھیوں کو ان راستوں کے شناور ہونے کی وجہ سے زیادہ دشواری نہیں ہوتی لیکن وہ اور اس کے ساتھی مشکل میں پڑ جاتے۔

"ٹھیک ہے، جیسے تم کہو۔" زانگ نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا اور رہ جانے والوں میں ان کے حصے کا کھانا تقسیم کرنے کی ہدایت کی۔ یہ کھانا ڈبل روٹی اور گوشت کے بے چند پیک کیا ہوا مشتمل تھا جنھیں بے شک گرم نہیں کیا جا سکا تھا لیکن اس حالت میں بھی خوش ذائقہ محسوس ہو رہے تھے۔ شاید اس لیے بھی کہ انہیں خاصے طویل وقفے کے بعد کھانا میسر آیا تھا۔ رادھے کی راہنمائی میں آگے بڑھتے وہ اپنے اس کھانے سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔ لارا اپنے زخمی ہاتھوں کی وجہ سے خود کھانا کھانے کے قابل نہیں تھی اس لیے معاذ نے وکی کو ذمے داری سونپ دی کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی کھلاتا رہے۔ گل خان بھی لارا کے قریب ہی چل رہا تھا اور سر جھکائے خاموشی سے کھاتا جا رہا تھا۔ اس پر نظر رکھنے کے لیے جارو اس کے بالکل پیچھے تھا۔

"خوب ہینڈل کیا ہے تم نے ان دونوں کو۔" زانگ نے لارا اور گل خان کی شرافت کو دیکھتے ہوئے معاذ کو سراہا۔

"یہ پوری دنیا سودے بازی پر چل رہی ہے۔ ہم لوگوں سے ان کی شرائط پر سودا طے کر لیں تو وہ ہم سے خوش بھی رہتے ہیں اور ہمارے فرمانبردار بھی۔"

"بالکل ٹھیک۔ پر تو ایک اچھا بزنس مین سودا طے

کرتے ہوئے اپنے فائدے کو ہمیشہ اوپر رکھتا ہے۔" زانگ نے جتایا۔

"وہ بھی اس انداز میں کہ اگلی پارٹی کو پتا ہی نہیں چل پاتا کہ وہ کس میں اس سے کیا کیا فائدہ اٹھا چکا ہے۔ وہ صرف اس بات پر خوش رہتے ہیں کہ ڈیل ان کی شرائط پر ہوئی ہے۔" معاذ نے گویا اس کی بات مکمل کی۔

"بہت بڑھیا۔ یوان منگ کی رائے تمہارے بارے میں غلط نہیں تھی۔ تم سچ مچ ایک ہیرا ہو۔" زانگ کو اس کے جواب نے خوش کر دیا۔

"تم نے اس شخص کی شرائط جتنی آسانی سے قبول کر لیں، وہ میرے لیے حیرت انگیز ہے۔ میں ایک دشمن کو صحیح سلامت جانے کی اجازت دینے کی شرط قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا۔" اس کا اشارہ راہنمائی کے لیے آگے چلنے والے رادھے کی طرف تھا۔ بظاہر رادھے آزادانہ چل رہا تھا لیکن زانگ نے اس کے ساتھ اپنے بہترین شوٹر لگا رکھے تھے جو اس کی طرف سے ذرا سی گڑبڑ کی صورت میں اس کا کام تمام کر سکتے تھے۔

"میں نے اسے صحیح سلامت جانے دینے کی ڈیل کی ہے۔ یہ وچن بالکل نہیں دیا ہے کہ وہ آگے بھی صحیح سلامت رہے گا۔" زانگ معنی خیزی سے مسکرایا۔

"مطلب؟" معاذ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"اسے کھانے کا جو سامان دیا گیا ہے، وہ زہریلا ہے۔ ہم سے الگ ہو کر جوں ہی وہ کچھ کھائے گا وہ اس کے جیون کا آخری کھانا ہوگا۔" زانگ نے سرگوشی نما آواز میں اسے آگاہ کیا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ چینی واقعی بہت تیز اور چالاک تھے۔

"فائرنگ کے ردعمل میں جس طرح کوئی ایکٹیویٹی دکھائی نہیں دی اور کوئی نہیں آیا، اس سے مجھے رادھے کی یہ بات سچ لگتی ہے کہ کیمپ کی نگرانی کے لیے صرف پانچ لوگ رہ گئے ہیں اور ان پانچ افراد نے کیمپ چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔"

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ پھر بھی سفر کی تیاری کے دوران میں نے دو تین اونچے پوائنٹس پر نگرانی کے لیے بندے بٹھا کر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے بھی کسی نے آس پاس کسی کو نہیں دیکھا۔" زانگ نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اسی وقت آگے چلتا رادھے رک گیا۔

"کیا بات ہے؟" زانگ لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ اس نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے انگلی سے اشارہ کیا۔ پہلی نظر میں کچھ محسوس نہ ہوا پھر احساس ہوا کہ سامنے غاروں کا وہ سلسلہ ہے جسے کیمپ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ غاروں کا یہ طویل سلسلہ ان لوگوں کے لیے ایسی قدرتی پناہ گاہ ثابت ہوا تھا جہاں وہ کئی برسوں کے قیام کے باوجود کسی کی نظر میں نہیں آ سکے تھے اور خاموشی سے اپنے کام کو جاری رکھے ہوئے تھے۔

"جارو! گل خان کو سوئچ آف کر دو۔" معاذ دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔ اس حکم کو دینے کے لیے اس نے جارو کو اپنی آواز پر دھیان رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ ویسے جارو کی یہ خصوصیت جتنی کارآمد تھی، اتنی خطرناک بھی تھی۔ اس سے کوئی راز، راز میں رکھنا بہت مشکل تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ وہ مخلص اور وفادار آدمی تھا۔

"میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، اب مجھے یہاں سے جانے دو۔" پیچھے اگر جارو کی طرف سے گل خان کو قابو میں کرنے کی کارروائی جاری تھی تو یہاں کھڑا رادھے زانگ کو اس کا وعدہ یاد دلا رہا تھا۔

"تم جا سکتے ہو لیکن خیال رہے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی غلطی نہ کرنا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میرا شوٹر تمہیں شوٹ کر دے گا۔" زانگ نے اسے اجازت دینے کے ساتھ سخت لہجے میں تنبیہ کی۔

"نہیں کرے گا... بالکل نہیں کرے گا۔" اس نے خوشامدانہ وعدہ کیا اور اس بات سے بے خبر کہ اس کی موت اس کے ساتھ اس کے بیگ میں بند ہو کر جا رہی ہے، تیزی سے وہاں سے دور ہٹتا چلا گیا۔

"اب...؟" کچھ پل خاموشی سے گزرے پھر معاذ نے زانگ سے پوچھا۔

"رادھے نے جو جانکاری دی تھی، اس کے انوسار کیمپ کے چار داخلی راستے ہیں لیکن اس سمے ہر راستے پر کیول ایک ہی پہرے دار ہو سکتا ہے۔ باقی یا تو آرام کر رہا ہوگا یا کیمپ کے دوسرے معاملات دیکھ رہا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے ہنگامی حالات کے پیش نظر انہوں نے زیر تربیت افراد میں سے بھی کچھ کو اپنے ساتھ شامل کر لیا ہو۔ جن لوگوں کی برین واشنگ کر کے وہ انہیں دنیا کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں، انہیں کیمپ کی حفاظت کے لیے کیوں نہیں استعمال کر سکتے؟" معاذ نے نکتہ اٹھایا۔

"کیمپ کا ماحول اتنا سخت ہے کہ ہر فرد یہاں سے فرار چاہتا ہے۔ وہ یہاں جو کچھ سیکھتے ہیں وہ صرف اس لیے سیکھتے ہیں کہ انہیں باور کرایا گیا ہے کہ اسے سیکھ کر جنت کی

راہ دی جاسکیں گے لیکن یہاں رہنا کوئی نہیں چاہتا اور جہاں آدمی رہنا نہ چاہتا ہو، اس جگہ کی حفاظت کیوں کرے گا؟" زانگ نے راہ دکھانے والے سے خاصی معلومات حاصل کرلی تھیں اس لیے مطمئن تھا کہ مقابلہ صرف پانچ سے کرنا ہے لیکن معاذ کا دل پوری طرح مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔

"حملے کے لیے تمہارے ذہن میں کیا حکمت عملی ہے؟"

"ہم اگر دو سے تین آدمی بھی ایک راستے کے لیے بھیجیں تو وہ کافی ہوں گے۔ اندھا دھند فائرنگ اور دستی بموں کی برسات کسی پہرے دار کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دے گی۔" زانگ کا منصوبہ بالکل سادہ تھا۔

"میرے خیال میں اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے ہمیں دن کے ڈھلنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ پہرے داروں کی تعداد کم سہی لیکن وہ بلند اور محفوظ جگہ پر ہیں۔ ہمارے ساتھی کھلے میں فوراً نشانہ بن جائیں گے۔" دوربین آنکھ سے لگائے اس نے زانگ کو مشورہ دیا۔ وہ جس جگہ کھڑے تھے وہ نسبتاً بلند تھی اور یہاں سے صرف ایک داخلی راستہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ باقی تین راستے پہلو میں تھے لیکن ان تک پہنچنے کے لیے بھی سامنے سے گزرنا تھا۔ کہیں اور سے گھوم کر جانے کی کوئی راہ ہی نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم اندھیرا ہونے کا انتظار کرلیتے ہیں۔ ہمارے آدمیوں کے پاس نائٹ ویژن گاگلز ہیں۔ انہیں رات میں حملہ کرنے سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" زانگ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"میں کچھ اور اقدامات بھی کرنا چاہتا ہوں لیکن معلوم نہیں ہمارے پاس اس کے لیے انتظامات ہیں یا نہیں؟" معاذ کا اضطراب کسی طور ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"تم بتاؤ، ہوسکتا ہے کہ ہم تمہاری ڈیمانڈ پوری کرسکتے ہوں۔" زانگ نے سرسری سے لہجے میں اسے جواب دیا تو معاذ نے اسے اپنی ضرورت سے آگاہ کردیا۔

"کوئی مشکل نہیں، یہ بھی سب ہو جاتا ہے۔" زانگ نے اسے جواب دیا اور قریب کھڑے ایک ساتھی کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ اس شخص نے اس کی بات سن کر سر کو اثبات میں جنبش دی اور پیچھے کی طرف چلا گیا۔ یقیناً وہ کسی تک زانگ کا پیغام لے کر گیا تھا۔ کیمپ کے قریب آنے کے بعد سے زانگ نے وائرلیس کا استعمال نہیں کیا تھا۔ یقیناً اسے خدشہ ہوگا کہ فریکوئنسی پکڑے جانے کی صورت میں ان کا کوئی راز، راز نہیں رہے گا۔

"کیمپ میں سٹلائٹ فون موجود ہے۔ یہاں والوں نے اب تک ڈیوڈ کو اس بگڑی صورتحال کی خبر دے دی ہوگی۔" ایک کام مرضی کے مطابق ہونے کے باوجود تو معاذ کو دوسری فکر لاحق ہوگئی تھی۔

"خبر ہو بھی گئی ہوگی پر وہ کیا کرسکے گا؟ جب تک اس کی طرف سے کوئی کمک آئے گی، ہم اپنا کام پورا کرکے نکل چکے ہوں گے۔" زانگ کا استدلال ٹھیک تھا۔ اس کا کیمپ ہونے سے جہاں ڈیوڈ کو یہ فائدہ تھا کہ دنیا کی کیمپ تک رسائی نہیں تھی، وہیں یہ نقصان بھی تھا کہ خود کو فوری وہاں تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

"آپ کے لیے دو اہم اطلاعات ہیں۔"

"گڈ۔ میں سننا چاہوں گا۔" لالہ عیسیٰ نے طاہر بیگ کی کال سن کر خوشی محسوس کی۔

"عرفان اللہ کے لیے نئی پی اے بھرتی کی جارہی ہے اور اس لڑکی کا جو ریکارڈ میرے سامنے آیا ہے وہ بہت انٹرسٹنگ ہے۔"

"تم کہہ رہے ہو تو یقیناً ہوگا۔"

"لڑکی کا باپ ایک سابق فوجی ہے۔ اس نے زمانہ طالب علمی میں ایک یہودی لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی۔ اسے اپنے ساتھ پاکستان لے آیا تھا۔ اہل کتاب عورت سے شادی کی اجازت کا فائدہ اٹھا کر اس کو دائرہ اسلام میں لانا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ سارا شادی کے ڈھائی تین سال تک پاکستان میں ہی رہی تھی لیکن پھر ایڈجسٹ نہ ہونے کا بہانہ بنا کر واپس امریکا چلی گئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ایک سالہ بچی صوفیہ بھی تھی۔ صوفیہ کی ساری تعلیم تربیت ماں کے زیر نگرانی امریکا میں ہی ہوئی لیکن دونوں ماں بیٹی کا وقتاً فوقتاً پاکستان آنا جانا رہتا تھا۔ کچھ سال پہلے سارا کی موت کے بعد صوفیہ باپ کی خواہش پر مستقل طور پر پاکستان منتقل ہوگئی اور بے اینڈ بے کمپنی میں ملازمت کرنے لگی۔"

"اوہ..." تفصیلات سن کر لالہ کے منہ سے بے اختیار ہی نکلا۔

"جی ہاں... اور اب بے اینڈ بے کی ملازمہ صوفیہ کا عرفان اللہ کی پی اے کی حیثیت سے انتخاب ہو گیا ہے۔"

"یہ تم نے واقعی بہت دلچسپ خبر دی ہے۔"

"اس خبر نے آپ کے اس خیال کو بھی کنفرم کردیا ہے کہ اس روز ہوٹل میں عرفان اللہ سے خفیہ ملاقات کرنے والی عورت بے اینڈ بے کمپنی کی سی ای او راشیل ہی تھی اور

عرفان اللہ کے پاس کی کیمرے نے جو ایک دم اسپیڈ پکڑی ہے، اس کے پیچھے راشیل کا ہی ہاتھ ہے۔ یقیناً اس نے عرفان اللہ کو اپنے زیر اثر رکھنے کے لیے صوفیہ کو اس کے پاس ایڈجسٹ کروایا ہے۔"

"صوفیہ کا مذہبی اسٹیٹس کیا ہے؟"

"بظاہر تو مذہب کے خانے میں اسلام ہی لکھا ہوا ہے لیکن واضح طور پر کچھ کہنا اس لیے مشکل ہے کہ اس کے باپ زاہد کی فیملی ایک الٹرا ماڈرن فیملی ہے اور ایسی فیملیز میں ویسے بھی مذہب کا زیادہ عمل دخل دکھائی نہیں دیتا۔ صوفیہ کی تو پرورش ہی خاندان سے ہٹ کر یہودی ماں کے ہاتھوں ہوئی ہے۔" طاہر بیگ نے اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ اپنا تجزیہ بھی پیش کیا۔

"یہودی عورتوں کے ذریعے مسلمان مردوں کے دماغ کو اپنے قابو میں رکھنا اور انہیں اپنی مرضی کے کام لینا یہودیوں کا پرانا ہتھکنڈا ہے۔ عرفان اللہ کے نزدیک صوفیہ کی موجودگی کو قطعی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔" لالہ نے تشویش کا اظہار کیا۔

"یہ تو ہے لیکن فی الحال ہم کچھ نہیں کرسکتے۔" طاہر کے لہجے میں بھی مایوسی تھی۔

"اچھا چھوڑو اس بات کو اور یہ بتاؤ کہ دوسری اہم اطلاع کیا ہے؟" لالہ نے موضوع بدلا۔

"دوسری اطلاع حاصل کرنے میں میری کوشش کے بجائے قسمت کا دخل ہے اور معلومات کے حصول کا سارا کریڈٹ میری بہن کو جاتا ہے۔"

"ارے واہ... وہ کیسے؟" لالہ نے دلچسپی ظاہر کی۔

"میری بہن کی ایک ہی بچی ہے جو اللہ نے اسے شادی کے بارہ سال بعد دی ہے۔ بچی کے بارے میں بہن اتنی حساس ہے کہ اسے چھینک بھی آجائے تو ڈاکٹر کی طرف بھاگتی ہے۔ کچھ دنوں سے بچی کی طبیعت خراب ہو رہی تھی تو بہن نے فیصلہ کیا کہ اس کے سابقہ ڈاکٹر کو چھوڑ کر کسی دوسرے اچھے چائلڈ اسپیشلسٹ کو دکھایا جائے۔ اس کی کسی سہیلی نے اسے ڈاکٹر مجاہد کمال کا نام بتا دیا۔ آپ جانتے ہوں گے مجاہد کمال کو؟" تفصیلات بتاتے بتاتے طاہر بیگ نے لالہ سے سوال کیا۔

"ہاں، نام سنا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ بہت نخریلا ڈاکٹر ہے۔ کبھی کسی مریض کو اس کے گھر دیکھنے نہیں جاتا اور کلینک پر چاہے وزیراعظم کا بچہ بھی علاج کے لیے آجائے تو اسے اصول کے مطابق اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔" لالہ کو شہر کے ہر مشہور شریف اور بدمعاش آدمی کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل تھیں۔

"جی، جی۔ اسی مجاہد کمال کی بات کر رہا ہوں میں۔ بہن کے اصرار پر نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے ساتھ اس کی بچی کو دکھانے مجاہد کمال کے کلینک لے گیا تھا اور اتفاق کی بات وہاں مجھے سائیں صداقت شاہ کا نواسا دکھائی دے گیا۔" طاہر بیگ کی اتنی لمبی تفصیل میں سے آخر کار کام کی بات نکل ہی آئی۔

"میں نے بچے کو دیکھا تو بہن کی ڈیوٹی لگا دی اس کے بارے میں کھوج لگانے کی۔"

"بہت خوب۔" لالہ نے اسے داد دی۔ اسے اپنے ہاں کی دیسی خواتین کا مزاج معلوم تھا کہ ویٹنگ روم میں بیٹھ کر دوسرے مریض کے ساتھ آنے والوں کا شجرہ نسب بھی اس خوبی سے کھنگال ڈالتی ہیں کہ انہیں پتا بھی نہیں چلتا۔

"اعظم کو جو عورت چیک اپ کے لیے کلینک لے کر آئی تھی، وہ اسے آذر کے نام سے پکار رہی تھی۔ میری بہن کے مطابق بچہ بیمار ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا چڑچڑا بھی دکھائی دے رہا تھا۔"

"تم وہاں کہاں تھے؟"

"میں باہر پارکنگ ایریا میں ہی رکا ہوا تھا۔ ڈاکٹر مجاہد کے بہت سے اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ مریض بچے کے ساتھ صرف ایک شخص کو اندر آنا الاؤ کرتے ہیں۔ ہاں اگر ضرورت محسوس ہو تو بچے کے باپ کو کال کرایا جاتا ہے۔ اتنے نخروں اور اصولوں کے باوجود لوگ اپنے بچوں کو اس کے پاس لے جانا صرف اور صرف اس لیے منظور کر لیتے ہیں کہ اللہ نے اس کے ہاتھ میں کمال کی شفا دی ہے۔ بڑے سے بڑے اسپتال کے علاج سے مایوس ہو جانے والے بچے کو اس کے ہاتھ سے شفا مل جاتی ہے۔" طاہر نے ایک لمبی تفصیل سے جواب دیا۔

"اعظم اور وہ عورت کس کے ساتھ اسپتال آئے تھے؟" لالہ نے پوچھا۔

"گاڑی میں ڈرائیور اور دو گارڈز تھے۔ میں نے چپکے سے نمبر پلیٹ سمیت گاڑی اور گارڈز وغیرہ کی تصویریں اتار لی تھیں۔ ابھی آپ کو سینڈ کرتا ہوں۔"

"ہاں، کرو۔" لالہ نے بے دلی سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ثبوت بے کار ہیں۔ اس بات کا علم اسے تو کیا صداقت شاہ کو بھی تھا کہ بچہ کن لوگوں کے پاس ہے لیکن اس کے حصول کے لیے کوئی قدم اٹھانا ممکن نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

"سب سے اہم بات تو میں نے آپ کو ابھی تک بتائی ہی نہیں۔" اس بار طاہر بیگ کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔

"وہ کیا؟" لالہ چونکا۔ جواب میں طاہر نے جو کچھ بتایا اور جو مشورہ دیا اسے سن کر لالہ کھل اٹھا۔

"جیو میرے شیر! یہ تو تم نے بہت ہی زبردست کام کر دکھایا ہے۔" اپنی خوشی کے اظہار میں لالہ نے کسی کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

"لیکن خیال سے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی بے قصور کو کوئی نقصان پہنچے۔" طاہر کو خود کو سراہے جانا اچھا لگا لیکن ساتھ ہی تنبیہ کرنا نہیں بھولا۔

"فکر مت کرو۔ مجھے احتیاط کا علم ہے، ہماری طرف سے ضرور کی جائے گی۔" لالہ نے اسے تسلی دی پھر بولا۔

"میں تمہاری بہن کو اس تعاون پر انعام دینا چاہتا ہوں۔ تم انکار مت کرنا۔"

"انعام کیا؟ اس نے یہ کام آپ کے لیے نہیں، میرے لیے کیا تھا اور میں کہہ چکا ہوں کہ میں اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ اخراجات کے لیے تو ابھی وہی رقم کافی ہے جو آپ نے مجھے دی تھی۔ وہ ختم ہو گئی تو اور مانگ لوں گا۔" طاہر کا لہجہ پکا تھا۔

"بہت ضدی ہو یار! ٹھیک ہے خود نہ لو لیکن بہن بیٹیوں کا تو حق بنتا ہے۔" اسے معلوم تھا کہ طاہر کا تعلق سفید پوش گھرانے سے ہے اس لیے کسی نہ کسی طور اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

"آپ کا بہت شکریہ لیکن یقین جانیے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میری بہن کا شوہر ایک خوشحال آدمی ہے اور وہ اپنے گھر میں ہم سے زیادہ آسودہ زندگی گزار رہی ہے۔" طاہر کو اس کی نیت سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئی اور جانب طور پر جتا دیا کہ اسے اس کی طرف سے کوئی مدد قبول نہیں ہے۔

"چلو جیسی تمہاری مرضی۔" لالہ کو مزید بحث مناسب معلوم نہ ہوئی اور چند اختتامی الفاظ کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا۔ فون سے فارغ ہونے کے بعد اسے اصغر کی کمی کا احساس ہوا۔ کافی دیر سے وہ اسے دکھائی نہیں دیا تھا۔ اسے ڈھونڈتے ہوئے وہ کمپیوٹر روم میں جا پہنچا۔ اصغر اتنا مصروف تھا کہ اسے اس کی آمد کی خبر ہی نہیں ہو سکی۔

"کیا کر رہا ہے اصغر؟" لالہ نے پوچھا تو اس کا استغراق ختم ہوا اور چونک کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"آپ کیوں آگئے لالہ! کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا یار اور ویسے بھی چلتے پھرتے رہنے سے آدمی کے بدن کی چربی پگھلتی ہے۔" لالہ نے اسے جواب دیا اور پھر اسکرین پر نظر آنے والے [illegible] کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تو کر کیا رہا ہے؟"

"غدار کی تلاش۔" اصغر نے ہونٹ بھینچتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" لالہ کی سوالیہ نظریں اصغر [illegible]

"ادھر شفٹ ہونے سے پہلے میں نے اڈے پر کیمرے لگوائے تھے۔ اپنے کو شک تھا کہ کوئی اپنا ہی بندہ ہے جو باہر خبریں پہنچا رہا ہے۔ وہ حرام کا جنا [illegible] بس اس کی قسمت اچھی تھی کہ کیمرے لگوانے کے بعد کچھ ایسی گڑبڑ رہی کہ اپنے کو اس طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ آج تھوڑی فرصت ملی تو وہاں سے ریکارڈ نکلوایا اور یہ خبیث نظر میں آ گیا۔"

اصغر یوں تو لالہ کے سامنے اپنی گالی دینے کی عادت پر قابو رکھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن جب شدید غصے میں ہوتا تھا تو اس کا خود پر سے کنٹرول ختم ہو جاتا تھا۔

"دیکھ لیں گے اس کا حساب بھی۔ دوسرے دسترخوان سے کھانے والے کی زندگی [illegible] شرمندگی ہے۔ نکال دینا اسے اس شرمندگی سے۔" لالہ نے [illegible] میں غدار کے لیے حکم صادر کیا اور پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "مجھے تجھ سے ایک اہم کام تھا اسی لیے یہاں آیا تھا۔"

"حکم کرو لالہ!" اصغر فوراً قدموں میں بچھنے کے لیے تیار ہو گیا۔ لالہ نے اسے طاہر بیگ سے حاصل شدہ معلومات اور اپنے پروگرام سے آگاہ کیا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اتنے دنوں سے نقصانات اٹھاتے اٹھاتے ایک فتح کی صورت دکھائی دی تھی تو اس کا خوش ہونا بنتا بھی تھا۔

☆☆☆

"مجھے بخار ہو رہا ہے۔" وہ ٹہلتا ہوا پیچھے موجود ساتھیوں تک پہنچا تو لارا نے اس سے شکایت کی۔

"زخموں اور خون کی کمی کی وجہ سے بخار تو ہونا ہی ہے۔ میں تمہارے لیے درد اور بخار کی کوئی دوا منگوا دیتا ہوں۔"

"مجھے اینٹی بائیوٹک دو۔ اس کے بغیر میرے زخم خراب ہو جائیں گے۔" لارا نے مطالبہ کیا۔

"سوری! ہمارے پاس اینٹی بائیوٹکس کی محدود مقدار ہے اور انہیں اپنے ساتھیوں کے لیے سنبھال کر رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہم یہاں پکنک منانے کے لیے تو آئے نہیں ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں جلد ایک معرکہ ہونے

والا ہے اور معرکے میں ہار جیت جس کی بھی ہو، نقصان تو بہرحال دونوں طرف ہوتا ہے۔" معاذ نے اسے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"اس بیچارے کو اس طرح باندھ کر کیوں ڈال دیا ہے؟ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ اب یہ تمہاری مکمل فرمانبرداری کرے گا۔" ایک معاملے میں انکار سن کر لارا اس سے دوسرے معاملے میں الجھ گئی۔

"آدمی جب حالت جنگ میں ہو تو اسے کسی پر بھی مکمل اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ میں بھی نہیں کر سکتا۔" اس کی طرف سے ایک بار پھر صاف گوئی کا مظاہرہ ہوا۔ لارا محض منہ بنا کر رہ گئی۔

"ویسے تم عجیب ہو کہ اس ویرانے میں خان کو اپنے ساتھ لے کر اتنی دور چلی آئی تھیں۔"

"تو مجھے کیا معلوم تھا کہ وہاں تم لوگ ٹپک پڑو گے۔" وہ معاذ کے پوچھنے پر چڑ گئی۔ تکلیف اور نقاہت دھیرے دھیرے اس پر غالب آتے جا رہے تھے اور اسے اس وقت اس کے سوال جواب اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

"میرے خیال میں تم اس امید پر اتنی دور تک چلی گئی تھیں کہ تمہیں امید تھی کہ آج ہماری گرفتاری کے لیے جانے والے ہاڈل اور اس کے ساتھی ہمیں واپس لے کر لوٹ آئیں گے اور تم ہمیں خان کی بے بسی کا تماشا دکھا کر ذہنی اذیت دے سکو گی۔"

"تمہاری مرضی ہے جو چاہے سمجھتے رہو۔ میں تمہیں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔" اس نے بیزاری کا اظہار کیا۔

"اچھا یہ تو بتا دو کہ جب تمہیں اور خان کو یہاں پہنچایا گیا تو اس وقت تم دونوں کے ساتھ اور کون کون آیا تھا؟"

"کیا مطلب، کون کون آیا تھا؟ بس ہم دونوں ہی تھے۔" وہ پہلے سوال سن کر چونکی پھر کسی اور کے ساتھ آنے سے صاف انکاری ہوئی۔

"میں نہیں مان سکتا۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے اچھا خاصا خرچہ کرنا پڑتا ہے تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ صرف دو بندوں پر ڈیوڈ اتنا خرچ کرے۔"

"ہم سامان رسد کے ساتھ آئے تھے۔" لارا نے بحالت مجبوری جواب دیا۔

"اور اس سامان کو کیمپ تک کیسے لے جایا گیا؟ کیا یہ کارنامہ بھی تم دو بندوں نے انجام دیا؟" معاذ نے طنز سے پوچھا۔

"نہیں، اس کے لیے ایک خاص پوائنٹ پر کیمپ سے بندے آئے تھے۔"

"میں اب بھی بہت الجھن میں ہوں کہ ڈیوڈ نے اس علاقے میں اپنا کیمپ کیوں بنایا۔ ٹھیک ہے یہ جگہ محفوظ ہے لیکن اس سب کو مینیج کرنا بہت مشکل ہے۔ اس جگہ کیمپ کو چلانے کے لیے مالی وسائل اور افرادی قوت دونوں کی ضرورت ہے۔ جن دنوں موسم خراب ہو جب تو کھانے پینے کا سامان پہنچانا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہو گا۔ ایسے میں اتنے لوگوں کا کھانا پینا کیسے چلتا ہو گا؟" وہ اپنے ذہن میں موجود سوال لارا کے سامنے اٹھا رہا تھا۔

"میں کیا بتا سکتی ہوں۔ میں تو خود حال ہی میں یہاں آئی تھی۔" اس نے تنک کر جواب دیا۔ معاذ کو مزید سوال اٹھانے کا موقع اس لیے نہیں ملا کہ اسے زاگ کا ایک آدمی بلانے آ گیا تھا۔

"رات ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ اندھیرا پھیلتے ہی زاگ حملے کا فیصلہ سنا دے گا۔ تم دونوں نے گل خان کی حفاظت کرنا ہے۔ بہتر ہے اسے کسی محفوظ آڑ میں پہنچا دو۔ خود تم دونوں کے لیے بھی میری یہ نصیحت ہے کہ حملہ آوروں کی پہلی صف میں شامل نہیں ہونا۔ میں زاگ سے بھی اس سلسلے میں بات کر لوں گا۔"

"لیکن یہ بہت عجیب بات ہے معاذ بھائی کہ ہم ان کے ساتھ ہوتے ہوئے اس طرح پیچھے رہ کر بزدلی کا مظاہرہ کریں۔" وکی کو اس کا حکم بہت عجیب لگا تھا۔

"اس میں بزدلی کی کوئی بات نہیں ہے۔ عقب کا خیال رکھنے کے لیے کسی کو موجود ہونا چاہیے۔ سارے لوگ آگے لڑنے کے لیے چلے جائیں اور پیچھے کوئی گڑبڑ ہو جائے تو پھر کیا کرو گے تم لوگ؟" معاذ نے ذرا سخت لہجے میں سمجھایا اور اس کا شانہ تھپک کر آگے بڑھنا چاہا۔

"معاذ بھائی!" وکی کی آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ "آپ خود کیا کرنے جا رہے ہیں؟" اس نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب، کیا کرنے جا رہا ہوں؟ میں بھی تم سب کی طرح اس جنگ کا حصہ ہوں۔"

"لیکن آپ کے انداز سے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ ہم سب سے الگ کچھ کرنے جا رہے ہیں۔" وکی کو اس کے جواب نے مطمئن نہیں کیا۔

"تم خوامخواہ ٹینشن لے رہے ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ وکی کو ٹال کر آگے بڑھ گیا۔ جارو بھی وہاں موجود تھا لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

''تمہارا مطلوبہ سامان آ گیا ہے۔ ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کا وقت ہوگا تمہارے پاس۔ اس کے بعد ہم حملہ کر دیں گے۔'' وہ زانگ کے پاس پہنچا تو وہ ایک بیگ لیے اس کا منتظر تھا۔

''بے فکر رہو۔ اس وقت تک میں اپنی پوزیشن سنبھال چکا ہوں گا۔'' اس نے اپنے سامنے پھیلے پہاڑوں پر نظر دوڑائی۔ کیمپ والا سارا حصہ ان بلند و بانگ پہاڑوں سے اس طرح گھرا ہوا تھا کہ کسی کی نظر میں آنا مشکل تھا۔ ان پہاڑوں کے درمیان سے صرف ایک ڈرّے نما راستہ ہی کیمپ تک جاتا تھا۔ وہ لوگ اس وقت اسی راستے پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

''تمہارا خدا تمہیں کامیاب کرے۔'' زانگ نے اسے دعا دی۔ وہ شانوں سے بیگ لٹکائے مسکراتا ہوا اس سے ہاتھ ملا کر تیز تیز قدموں سے اس جگہ سے دور ہوتا چلا گیا اور جب سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو اس پہاڑ کے قریب ہوتا چلا گیا جو بلندی کے اعتبار سے تو شاید کسی شمار میں نہ آتا ہو لیکن اس کی بناوٹ کی وجہ سے اس پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اس پہاڑ پر چڑھ کر اوپر سے اپنے ساتھیوں کی حفاظت کرے گا۔ پہاڑ کی مشکل چڑھائی کی وجہ سے اس نے زانگ سے کوہ پیمائی کے سامان کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ سامان ان کے ساتھ موجود تھا۔

پہاڑ پر چڑھتے ہوئے ابتدا میں اسے اس سامان کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی لیکن تھوڑا سا اوپر جا کر ہی پہاڑ اپنا رنگ دکھانے لگا اور اسے اوپر چڑھنے کے لیے باقاعدہ سامان کا استعمال کرنا پڑا۔ کہیں چھوٹی دتی کلہاڑی برف میں دھنسا کر اپنے آپ کو اوپر لے جانے کے لیے سہارا بنانا پڑتا تو کہیں باقاعدہ میخیں ٹھوک کر ان پر اپنے قدم جمانا پڑ رہے تھے۔ ایک بار تو وہ بری طرح پھسل ہی گیا لیکن جسم سے بندھی رسی کی وجہ سے بچت ہو گئی۔ اس کے پاس ایک آدھ بار تفریحاً ہی کہیں کہیں چڑھنے کا تجربہ ضرور تھا لیکن وہ کوئی تجربہ کار کوہ پیما نہیں تھا اور اس وقت خود کو بے حد خطرے میں ڈالے صرف اس لیے اوپر جا رہا تھا کہ اپنے ساتھیوں کو اس خطرے سے بچا سکے جس کا اس کی چھٹی حس مسلسل اسے اشارہ دے رہی تھی۔ بیگ میں پڑی چھوٹی سی اسٹین گن کا وزن اس کے کام کو مزید مشکل بنا رہا تھا لیکن وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ مستقل مزاجی سے مسلسل آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا لیکن روشنی کے غائب ہونے کی رفتار اس سے بھی زیادہ تھی۔ آخر کار منظر دھندلے ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہی ہو گئے اور مجبوراً اسے اپنی ہیڈ ٹارچ جلانا پڑی۔

دل میں ایک اندیشہ سا بھی تھا کہ کہیں اس ٹارچ کی روشنی کسی کو اس کی طرف متوجہ نہ کر دے لیکن یہ خطرہ مول لیے بغیر گزارہ بھی نہیں تھا کیونکہ دوسری صورت میں تاریکی اس کے لیے بھی بڑی قاتل ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے اس وقت سب سے اہم بات یہی تھی کہ آہستہ آہستہ ہی سہی، منزل قریب آتی جا رہی تھی۔ محض چند قدم کا فاصلہ ہی رہ گیا تھا جب اس کے کانوں نے ہتھیار چلنے کی آوازیں سنیں۔ یعنی زانگ اپنے پلے کے مطابق ٹھیک وقت پر حملہ کروا چکا تھا۔ اس نے اپنی رفتار مزید بڑھا دی۔ اوپر پہنچ کر وہ ابھی اپنی رائفل کے حصے جوڑ ہی رہا تھا کہ اس کے حساس کانوں نے نیچے جاری ہنگامے سے ہٹ کر گولیاں چلنے کا شور سنا۔ ماضی میں شاید اس سے اس آواز کو شناخت کرنے میں کوئی غلطی ہو جاتی لیکن اتنا عرصہ ہتھیاروں کے ساتھ گزارنے کے باعث اسے ہیوی مشین گن کی آواز پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اس گن کی تباہ کاری سے واقف تھا اور اندازہ لگا سکتا تھا کہ کہیں بلندی پر موجود اس گن نے گولیوں کی بوچھاڑ کی صورت نیچے موجود افراد کی زندگیاں چاٹنا شروع کر دی ہیں۔

☆☆☆

''ہمارا بندہ سامنے والی بلڈنگ میں پوزیشن لیے ہوئے ہوگا۔ اسے اچھی طرح بریف کر دیا ہے کہ کب اور کس کس پر گولی چلانا ہے۔ پارکنگ میں دو گاڑیاں بالکل ریڈی کھڑی ہوں گی اور پہلے فائر کے ساتھ ہی اسٹارٹ ہو جائیں گی۔ دو آدمی اور مناسب پوزیشن سنبھال کر رہے ہیں۔ کسی گڑبڑ کی صورت میں وہ بھی فوراً حرکت میں آ جائیں گے۔'' لالہ کو بریفنگ دیتے اصغر کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی اتنی منصوبہ بندی کے باوجود لالہ پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔

''آپ کو کوئی کمی لگتی ہے تو بولو لالا!'' لالہ کو غیر مطمئن پا کر وہ زیادہ دیر خود کو روک نہ سکا۔

''سب ٹھیک ہے یار! بس مجھے اس لیے فکر ہو رہی ہے کہ اصل ذمے داری تیلی کے سر ہے۔ اسے بے حد پھرتی اور چالاکی سے کام لینا ہوگا۔ اگر اس سے ذرا سی بھی غلطی ہو گئی تو ہمارا منصوبہ ناکام ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔'' لالہ نے اپنے خدشات بیان کیے۔

''آپ فضول میں فکر کر رہے ہو۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ لڑکی تیز طرار اور پھرتیلی ہے۔ بھلا سرکس میں جتنے رہتے پر چلنے اور موت کے کنویں میں موٹر سائیکل پر چکر لگانے والی کی جرأت اور پھرتی پر بھی کوئی شک کر سکتا ہے؟'' اصغر بے فکر تھا۔

''تیلی تماشے کی جرأت مندی اور تیزی طراری کی اور بات ہے اصغر! یہاں سفاک و بے رحم مجرموں سے مقابلہ کرنا ہے۔ ذرا سی چوک ہو گئی تو اس کے ساتھ بُرا ہو جائے گا۔'' لالہ کو تیلی عرف نیلی کی فکر تھی۔ یہ وہی تیلی تھی جو دکی کے عزیز دوست معتبر عرف موی کی منگیتر ہوا کرتی تھی۔ موی، دکی کے دوستی نبھاتے نبھاتے اتنا شدید زخمی ہوا تھا کہ اسے سرکس کی دنیا کو خیرباد کہنا پڑا تھا۔ تیلی نے اس مشکل وقت میں موی کا ساتھ چھوڑنے کے بجائے اپنے رشتے کو مزید مضبوط کرتے ہوئے اس سے شادی کر لی تھی اور اب وہ دونوں ساتھ رہ کر زندگی کے سرد و گرم کا سامنا کر رہے تھے۔ موی کے سلسلے میں دکی کی خاص ہدایات رہی تھیں اس لیے اس کے پیچھے بھی موی اور تیلی کا مکمل خیال رکھا جاتا رہا تھا۔ اس خیال داری کے پیچھے کوئی غرض نہیں تھی لیکن اب چونکہ انہیں اپنے کام کے سلسلے میں ایک عورت کی ضرورت تھی تو دھیان خود بخود تیلی کی طرف چلا گیا تھا۔ تیلی نے بھی انکار نہیں کیا تھا اور فوراً ہی مدد کرنے کے لیے آمادہ ہو گئی لیکن لالہ کو اب بھی تحفظات تھے۔

''آدمی میں جان کی بازی لگانے کی جرأت ہو تو بڑے بڑے مجرموں کو پچھاڑ دیتا ہے۔ تیلی ساری زندگی جان کی بازی لگا کر رزق کماتی آئی ہے۔ وہ یہ کام بھی کر گزرے گی۔ آپ کی تسلی کے لیے میں یہ بھی بتا دوں کہ وہ وہاں اکیلی نہیں ہوگی۔ وہاں کوئی اور بھی اس کی مدد کے لیے اس کے ساتھ موجود ہوگا۔'' لالہ کو تسلی دیتے دیتے اصغر پراسرار انداز میں مسکرایا۔

''کون...... کون ہوگا...... کیا موی خود؟'' لالہ اس کے انکشاف پر چونکا اور پھر فوراً ہی اندازہ لگا لیا۔

''بالکل ٹھیک سمجھے آپ۔'' اصغر نے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔

''لیکن وہ کیسے؟ زنانہ ویٹنگ ایریا میں تو صرف خواتین ہی جا سکتی ہیں نا۔''

''اب سرکس کا بندہ اتنا سا بہروپ بھی نہ بھر سکے گا کیا؟'' مسکراہٹ اصغر کے ہونٹوں سے چپکی ہوئی تھی۔

''کسی نے اس کا بہروپ پہچان کر پہلے ہی سے گڑبڑ کو بھانپ لیا تو پھر......؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ موی دبلا پتلا اور تھوڑے چھوٹے قد کا لڑکا ہے۔ عبایا پہن کر، منہ پر نقاب لگائے مزے سے عورتوں کے حصے میں گھس جائے گا۔ پہلے اسے اس انداز میں استعمال کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس نے خود پیشکش کی ہے کیونکہ وہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ کسی مشکل کے وقت تیلی کی مدد کے لیے کسی کو وہاں موجود ہونا چاہیے۔'' اصغر نے مکمل تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''ان دونوں کا خصوصی خیال رکھنا۔ انہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو میں دکی سے نظریں نہیں ملا سکوں گا۔'' لالہ نے تاکید کی۔

''بالکل ایسا ہی ہوگا لالا!'' اصغر کے پاس بھی محض تسلیاں ہی تھیں۔ جانتے وہ دونوں تھے کہ ایسے معاملات میں کبھی بھی کنٹرول آپ کے ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔ یہ سارا کھیل اصل میں طاہر بیگ کی دی گئی رپورٹ کے بعد شروع کیا گیا تھا۔ طاہر نے انہیں اطلاع دی تھی کہ اعظم کا ڈاکٹر مجاہد کمال کے ہاں دوسرا وزٹ کس دن ہے اور لالہ نے طے کر لیا تھا کہ اس دن اعظم کو میڈیم ایکس کے قبضے سے نکال لیا جائے۔ اس طرح وہ ایک تو صداقت شاہ کو اس کا مہرہ بننے سے بچا سکتے تھے، دوسرے صداقت شاہ کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کر کے انہیں اپنے لیے مدد بھی مل سکتی تھی۔ اعظم کو کلینک میں داخل ہونے کے بعد اس کو لانے والی عورت سے چھینا تھا اس لیے انہیں تیلی کی مدد کی ضرورت پڑی تھی۔ پورا منصوبہ تیار تھا اور اعظم کے چیک اپ والے دن ہی دو بچوں کے لیے الگ الگ ڈاکٹر مجاہد سے وقت لے لیا گیا تھا۔ مریضوں کا احتیاطاً دیے گئے وقت سے قبل کلینک پہنچنا اور ویٹنگ ایریا میں اپنی باری کا انتظار کرنا ایک معمول کی بات تھی اس لیے تیلی اور موی کا اعظم کے طے شدہ وقت سے قبل وہاں پہنچ جانا کوئی چونکا دینے والی بات نہ ہوتی۔ اصغر اپنی منصوبہ بندی سے پوری طرح مطمئن تھا پھر بھی لالہ کی تسلی کے لیے اس نے تیلی اور موی کو پہلے سے اپنے پاس بلوا لیا تھا۔

''کسی طرح کی گھبراہٹ یا پریشانی تو نہیں ہے؟'' روانگی سے قبل اس نے تیلی سے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔'' تیلی نے بھرپور اعتماد سے جواب دیا اور گلابی رنگ کے بستر میں لپٹے بچے کے سر پر ٹوپی درست کی۔ ٹوپی کی ڈیزائننگ اور بچے کے کپڑوں کے نظر آنے

والے حصے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی ہے لیکن وہ لڑکی نہیں تھی۔ حقیقت میں وہ انسانی بچے کے روپ میں ایک گڑیا تھی جسے اتنی فنکاری سے بنایا گیا تھا کہ ایک نظر دیکھنے میں اس پر اصل بچے ہی کا گمان ہوتا تھا۔ ایسا ہی ایک مصنوعی بچہ موی کے پاس بھی موجود تھا۔ وہ اس بچے کو ایک جانب رکھے جدید تراش خراش کا سیاہ عبایا اپنے جسم پر سیٹ کرنے میں مصروف تھا۔ یہ عبایا اس انداز کا تھا کہ آنکھوں اور ہاتھ پیروں کے سوا اس میں سے اس کے جسم کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ ہاتھوں کا مردانہ پن چھپانے کے لیے اس نے ان پر باریک جالی کے سیاہ دستانے چڑھا رکھے تھے۔ پیروں میں بھی سیاہ جرابیں اور زنانہ طرز کے بند جوتے تھے۔ دور سے دیکھنے پر اس پر کسی خوشحال مذہبی گھرانے کی خاتون کا گمان ہوتا تھا اور اس تاثر کو مضبوط کرنے کے لیے اس کے پاس ایک عمدہ لیڈیز بیگ بھی موجود تھا۔

''کلینک میں گھسنے سے پہلے ہر شخص کو میٹل ڈیٹیکٹر کی مدد سے چیک کیا جاتا ہے اس لیے ہتھیار تم لوگ ساتھ لے جا نہیں سکتے۔ جو کچھ کرنا ہے، خالی ہاتھوں سے کرنا ہے۔ کر لو گے نا؟''

''یہ سب آپ ہمیں پہلے بھی بتا چکے ہیں اصغر بھائی! اب بار بار بتا کر ٹینشن دینے کا فائدہ؟'' نیلی نے اسے ٹوکا۔

''نہیں، نہیں.... ٹینشن نہیں دے رہا، بس سمجھا رہا ہوں۔'' اصغر اس کے ٹوکنے پر جھینپا۔

''سمجھنے سمجھانے کا وقت گزر چکا۔ اب تو بس آپ ہمارا ایکشن دیکھیے گا۔ ہم وکی کے دوست ہیں۔ اپنے ایکشن سے آپ کو وکی کی یاد نہ دلادی تو نام بدل دیجیے گا۔'' نیلی بہت ریلیکس تھی۔ اس نے کھلے پائنچوں کے ٹراؤزر کے ساتھ گھٹنوں سے اونچی اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے سنہری رنگ سے رنگے بال ایک جدید تراش کے ہیئر اسٹائل کے ساتھ اس کے شانوں اور پشت پر گول گول چھلوں کی صورت میں بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں بھی تقریباً بالوں کی ہم رنگ ہو رہی تھیں۔ اس نے نہایت نفاست سے نو میک اپ لک دینے والا میک اپ کر رکھا تھا اور ایک چھوٹے بچے کی جوان اور امیر ماں کے روپ میں جچ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے تو پھر اب نکل پڑو۔ تم دونوں کا ٹائم پر وہاں ہونا ضروری ہے۔'' اصغر کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ بلاوجہ کی الجھن میں گرفتار ہو رہا ہے۔ اس کا اشارہ ملتے ہی وہ دونوں حرکت میں آگئے۔ دونوں کو لے جانے کے لیے باہر ڈرائیور سمیت گاڑیاں موجود تھیں۔ گاڑیاں ایک ساتھ روانہ ہوئیں لیکن دونوں نے ڈاکٹر مجاہد کے کلینک پہنچنے کے لیے الگ الگ راستہ اختیار کیا۔ نیلی کی گاڑی کا راستہ مختصر تھا اس لیے وہ پہلے کلینک پر پہنچی۔ باوردی ڈرائیور نے پارکنگ میں گاڑی روکی اور پھرتی سے نیچے اتر کر پچھلی جانب کا دروازہ کھولا۔ نیلی نے نیچے اترنے سے قبل اس کو ایک کیری کوٹ تھمائی۔ خوبصورت جالی منڈھی کیری کوٹ میں سوئی ہوئی بچی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ جالی کی وجہ سے بچی اتنی صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی کہ اس کے اصلی یا نقلی ہونے کا اندازہ لگایا جا سکے۔

''ٹھیک ہے، اب تم واپس جاؤ۔'' پارکنگ سے نکل کر استقبالیہ تک ڈرائیور کیری کوٹ تھامے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ استقبالیہ پر پہنچ کر اس نے ڈرائیور کے ہاتھ سے کیری کوٹ لے لی اور اس سے تحکمانہ لہجے میں بولی تو ڈرائیور مؤدبانہ سر کو خم دے کر وہاں سے چلا گیا۔ جس وقت وہ پارکنگ میں پہنچا، موی والی گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ عبایا پوش موی نے نیلی کے برخلاف گاڑی سے اسٹرالر خود باہر نکالا تھا اور خود اسے دھکیلتا ہوا استقبالیہ تک پہنچا تھا۔ اس کی گاڑی کے ڈرائیور نے ڈرائیونگ سیٹ نہیں چھوڑی تھی اور وہیں بیٹھا اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔

''میم! بچے کا ویٹ کروالیں۔'' موی اسٹرالر کو دھکیلتا ویٹنگ روم میں داخل ہو رہا تھا جب اس نے پہلے سے نشست پر بیٹھی نیلی سے نرس کو بولتے ہوئے سنا۔

''ریڈی۔'' نیلی نرس کی بات کے جواب میں کوئی ردعمل ظاہر کرتی، اس سے قبل ان دونوں نے اپنے کان میں سرگوشی سنی۔ انہوں نے بے ساختہ ایک دوسرے پر نظر ڈالی۔ اس ایک لفظ کا مطلب تھا اعظم اپنی دیکھ بھال کرنے والی عورت کے ساتھ وہاں پہنچ چکا ہے۔

''میم! میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ بچی کا ویٹ کروالیں۔'' نرس نے نیلی کی طرف سے اپنی بات پر ردعمل نہ ظاہر ہونے پر اسے بلند آواز میں ٹوکا۔

''جی، میں لا رہی ہوں۔'' اس نے ساتھ والی نشست پر رکھے کیری کوٹ پر پھیلی جالی کو دھیرے سے ہٹانا شروع کیا۔ اسی وقت اس کے کانوں میں قدموں کی چاپ گونجی۔ یہ چاپ موی نے بھی سنی تھی۔ ان کے درمیان ایک بار پھر نظروں کا تبادلہ ہوا۔ عبایا پوش موی اسٹرالر کو ایک طرف کرتے ہوئے داخلی دروازے سے قریب ترین رکھی نشست پر بیٹھ گیا۔

''فائر۔'' آنے والی نے ویٹنگ روم میں پہلا قدم رکھا تھا کہ ان دونوں کے کان میں بیک وقت یہ لفظ گونجا۔ وہ دونوں اس لفظ کا مطلب سمجھتے تھے۔ باہر کام شروع ہو گیا تھا۔ وہ اعظم کو لے کر باہر نکلتے تو انہیں میدان صاف ملتا۔ دونوں ہی ایکشن میں آنے کے لیے اچھل کر اپنی نشستوں سے کھڑے ہوئے۔ ان کے انداز کا یہ غیر معمولی پن آنے والی نے محسوس کیا اور بھڑک کر واپس پلٹنے کی کوشش کی لیکن وہاں موی ایک عبایا پوش عورت کے روپ میں اس کی راہ روکے کھڑا تھا۔

''بچے کو میری ساتھی کے حوالے کر دو ورنہ جان سے جاؤ گی۔'' موی نے اپنی بیلٹ کے ساتھ لٹکا ایک کھلونا نما لکڑی کا ٹکڑا نکال کر اسے جھٹکا دیا تو اس کی تہیں کھلتی چلی گئیں اور ایک چھوٹی اسٹیل نما لاٹھی ترتیب پا گئی جس کا ایک سرا بالکل نیزے کی طرح تھا۔ کسی دھات کے استعمال کے بغیر بھی اس لکڑی کے نیزے کو اتنی مہارت سے تراشا گیا تھا کہ آرام سے انسانی جسم میں اتر سکتا تھا۔ موی نے اپنے اس نیزے کی انی کو سیدھا اعظم کو گود میں اٹھائے کھڑی عورت کے نرخرے پر رکھا تھا۔ وزن کرنے والی مشین کے قریب کھڑی نرس حیرت سے منہ کھولے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

''کون ہو تم؟'' کھال میں اترتی لکڑی کی تیز نوک کے باوجود عورت نے موی کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور سخت لہجے میں سوال کیا۔

''ہم اس کے سگے ہیں اور اسے تم جیسی ڈائن کے پنجے سے نکالنا چاہتے ہیں۔'' نیلی نے آگے بڑھ کر اسے دوہتڑ رسید کیا اور اعظم کو اس کی گود سے چھیننے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ گھبرا کر رونے لگا۔ نیلی کے درمیان میں آجانے کی وجہ سے موی کا دھیان بھی تھوڑا سا بٹ گیا۔ اس موقع کا اس عورت نے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو دو قدم پیچھے ہٹانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی نیلی کو نشانہ بنانے کے لیے اپنی ٹانگ بھی چلائی۔ ردعمل نیلی اور موی دونوں کی طرف سے آیا۔ موی کا ہاتھ خودکار انداز میں اس پر حملہ آور ہوا اور نیزہ نما لکڑی کے تیزے کی انی اس کے گلے میں پیوست ہو گئی۔ یہ جھٹکا اس لیے بھی زوردار تھا کہ عین اسی وقت نیلی نے بھی عورت کا بازو غصے سے کھینچا تھا۔ اس کھنچاؤ نے عورت کو آگے کی طرف جھکایا تو اس کے اپنے وزن نے بھی انی کو اندر تک پیوست ہونے میں مدد دی۔ تکلیف کی شدت کے باعث عورت کے ہاتھ کی گرفت اعظم پر کمزور ہوگئی اور وہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گیا۔ وہ پہلے ہی گھبرا کر رو رہا تھا۔ گرنے سے چوٹ لگی تو مزید حلق پھاڑنے لگا۔ ممکن تھا کہ اس شور پر کلینک کا عملہ متوجہ ہو کر صورت حال معلوم کرنے کے لیے اس طرف کا رخ کرتا لیکن اندر جاری ہنگامے سے زیادہ شدید ہنگامہ باہر برپا ہو چکا تھا۔ مسلسل فائرنگ کے ساتھ ڈرائیور اور گارڈز کی گرنے والی لاشوں نے ایک دہشت اور افراتفری کی صورت حال پیدا کردی تھی۔ حملہ آور کو کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن کلینک کے اپنے گارڈز نے بوکھلا کر خود فائرنگ شروع کردی تھی۔ اس فائرنگ نے آس پاس موجود لوگوں کو خوفزدہ کردیا تھا۔ کوئی پناہ کے لیے بھاگ رہا تھا تو کوئی لاشوں کو دیکھ کر ایسے ہی چیخے چلے جا رہا تھا۔

''تم لوگ جلدی نکلو۔ میں ایک گاڑی کو بہت تیزی سے اس طرف آتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ ان ہی کے مددگار ہوں۔'' کان میں ہدایات دینے والا چیخا تو وہ دونوں عورت کی خون اگلتی لاش کی وجہ سے لگنے والے جھٹکے سے سنبھلے۔ نیلی نے بچے کو اٹھایا اور باہنوں میں بھر کر تیزی سے باہر کی جانب لپکی۔ موی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ کلینک کی پوری فضا میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر سے بھی شور اندر آرہا تھا۔ ایسے میں کون غور کرتا کہ اندر سے برآمد ہونے والوں کی گود میں وہ بچے نہیں ہیں جنہیں وہ کچھ دیر قبل لے کر یہاں آئی تھیں۔ لوگوں کی اس حواس باختگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ دونوں تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔

''او بے، روکو انہیں۔ کہاں جا رہی ہیں یہ؟''

''بہن جی! کہاں جا رہی ہیں آپ دونوں؟ کیا سنائی نہیں دے رہا کہ باہر گولیاں چل رہی ہیں۔''

''لگتا ہے مرنے کا ارادہ ہے بیچاریوں کا۔'' گیٹ کے قریب پہنچنے پر انہیں پیچھے سے کئی آوازیں سنائی دیں لیکن انہوں نے اپنے قدم نہیں روکے۔ وہ صرف اس کی سن رہے تھے جو چھوٹے سے ائرفون کے ذریعے مسلسل ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔

''تم دونوں نیلی والی گاڑی میں بیٹھو۔ دوسری گاڑی تمہیں کور دینے کے لیے پیچھے رہے گی۔'' باہر نکلتے ہی انہیں اپنے ہی خون کے تالاب میں پڑی گارڈز اور ڈرائیور کی لاشیں اور ٹوٹے بکھرے شیشے دکھائی دیے۔ وہ ہدایت کے مطابق پارکنگ کی طرف لپکے تو پہلے ہی سے اسٹارٹ گاڑی غرا کر ان کی طرف لپکی۔ وہ اس کے کھلے ہوئے دروازوں سے اندر گھسے تو گاڑی ایک پل کی بھی تاخیر کیے بغیر ہوا کی رفتار سے آگے بڑھ گئی۔

موی کو یہاں لانے والی گاڑی ان کے پیچھے ہی تھی۔

دونوں پہلی بار قدرے اطمینان محسوس کرتے ہوئے سکون سے بیٹھے اور نیلی نے روتے ہوئے اعظم کو چوم کر سینے سے لگا لیا۔ سہا ہوا بچہ اس کے وجود کی گرمی سے تھوڑا پُرسکون ہوا لیکن پھر فضا میں گونجنے والی فائرنگ کی آواز نے اعظم سمیت ان دونوں کو بھی ہلا ڈالا۔

''میرا شک درست تھا۔ گاڑی مجاہد کمال کے کلینک کی طرف ہی آرہی تھی اور اب تم لوگوں کے پیچھے ہے لیکن فکر نہ کرو، ہم ان سے نمٹ لیں گے۔'' انہیں تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا۔ ساتھ ہی گاڑی کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ کچھ لمحوں میں وہ اس سارے ہنگامے سے دور نکل چکے تھے۔ نیلی کی محبت بھری تھپکیوں نے اعظم کو بھی پُرسکون کر دیا تھا اور وہ اسے سینے سے لگائے سکون سے نشست گاہ سے پشت ٹکائے بیٹھی تھی۔

''کیا تھک گئی ہو؟'' موی نے اسے یوں بیٹھے دیکھ کر محبت سے پوچھا۔ وہ عبایا کا اوپر والا حصہ اتار کر ایک طرف رکھ چکا تھا اور اب ہاتھ میں پہنے دستانے کھینچ کر اتار رہا تھا۔

''اونہوں۔'' نیلی نے دھیرے سے گردن کو نفی میں جنبش دی اور چمکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آج بہت دنوں بعد اس سرور کو محسوس کیا ہے جو موت کے کنوئیں میں تمہارے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا۔'' جواباً موی اسے دیکھ کر رہ گیا۔ سرکس سے دوری کو صرف وہی نہیں، نیلی بھی محسوس کرتی تھی۔

☆☆☆

ہیوی مشین گن کی آواز سنتے ہی اس نے اپنی ہیڈ ٹارچ بجھا دی تھی اور اب اندھیرے میں کسی شکاری درندے کی طرح ساکت بیٹھا اپنی حسیات سے ماحول کو پڑھتے ہوئے سارے حساب کتاب لگا رہا تھا۔ دوسرا راؤنڈ شروع ہوتے ہی اس کے دماغ نے سمت اور فاصلے کا تعین کرنا شروع کر دیا اور وہ بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ حملہ آور اس کے دائیں جانب موجود پہاڑ پر موجود ہے۔ بہت جلد اس کی نائٹ ویژن نے اسے سبز دھبے کی صورت تلاش کر لیا۔ وہ مشین گن کو اسٹینڈ پر لگائے پورے ردھم کے ساتھ فائرنگ کر رہا تھا۔ معاذ نے اپنی اسنائپر گن کا رخ اس کی طرف کیا اور بدن کو بالکل ساکت کر کے نشانہ باندھنے لگا۔ ہوا کی رفتار، روشنی، درجۂ حرارت، درمیانی فاصلہ...... یہ سارے حساب کتاب اس وقت صرف جبلت کے سہارے ہو رہے تھے اور وہ بھی کسی سپر کمپیوٹر کی رفتار سے زیادہ تیزی سے۔ پتھر کی طرح ساکت ہوئے جسم کی صرف ایک انگلی کو حرکت کا اذن ہوا۔ ٹریگر دبا اور گولی نکل کر سیدھی اس سبز دھبے کی طرف بڑھی جو نیچے موجود اس کے ساتھیوں میں موت بانٹ رہا تھا۔ بس ایک پل کی بات تھی۔ اس نے سبز دھبے کو ایک جھٹکے سے گرتے اور غائب ہوتے دیکھا۔ پتا نہیں وہ وہیں کہیں گرا ہوا تھا یا نیچے لڑھک گیا تھا۔ اس کے اطمینان کے لیے بس اتنا کافی تھا کہ موت کا قہقہہ لگاتی مشین گن غائب ہو گئی تھی۔ یقیناً یہ مشین گن ہی کیمپ والوں کے لیے ترپ کا پتا تھی اور انہیں اطمینان تھا کہ کم نفری کے باوجود وہ اپنا بہترین دفاع کر سکیں گے۔ ان کا یہ اطمینان غلط بھی نہیں تھا۔ اگر معاذ کی چھٹی حس اسے خطرے کا احساس نہ دلاتی اور وہ حملے کے دوران بلندی سے نگرانی پر اصرار نہ کرتا تو وہ شخص اس کی نظر میں ہی نہیں آتا۔ وہ جس پوزیشن پر تھا، وہاں اسے نیچے سے نشانہ بھی نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا وہ کچھ دیر یونہی سینے کے بل لیٹا سن گن لیتا رہا۔ امکان کم تھا لیکن پھر بھی اطمینان کرنا ضروری تھا کہ اس کا کوئی دوسرا ساتھی تو موجود نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ تسلی بھی ہو گئی۔ اس کے کان سن سکتے تھے کہ اوپر سے برستی گولیوں سے گھبرا کر پسپا ہو جانے والے اس کے ساتھی ایک بار پھر میدان میں اتر آئے ہیں اور اس بار ان کی کامیابی یقینی تھی۔ یقینی کامیابی کا اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے پہاڑ سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ یہ کام چڑھنے کے مقابلے میں مزید دشوار تھا۔ بار بار پاؤں پھسل رہے تھے لیکن وہ کسی جلد بازی کا مظاہرہ کیے بغیر دھیرے دھیرے اترتا چلا گیا۔ اترنے کا یہ مرحلہ طے ہونے میں اتنی تھکن ہو گئی تھی کہ وہ فوراً باقی لوگوں کے درمیان جانے کے بجائے کچھ دیر وہیں لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے اس کی نظر آسمان پر پڑی۔ وہاں باریک سا چاند چند تاروں کے جھرمٹ میں کچھ اداس سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا ذہن خود بخود دگل کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی یونہی اداس تھی اور آہستہ آہستہ گھلتی جا رہی تھی۔ ایک طرف بیماری اس کے جسم میں سے زندگی کو نچوڑ رہی تھی تو دوسری طرف بیٹے کی جدائی نے زندہ رہنے کی لگن کو بجھا دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر کسی طرح اعظم کو اس تک پہنچا دیا جاتا تو وہ اپنی بیماری سے لڑ سکتی تھی۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

محبت گزیدہ

احمد سلیم سلیمی

دولت کی چکاچوند ہو یا آنکھوں کو حیران کرنے والا حسن... اور اس کے ساتھ ہی اگر لاابالی پن بھی اپنے عروج پر ہو تو شکاری جال لیے سایہ بن جاتے ہیں مگر بدقسمتی، عقل پر پردے ڈال کر ایسے گمراہ کرتی ہے کہ نہ دولت کی طاقت کام آتی ہے، نہ ہی حسن اپنی خوبصورتی برقرار رکھ پاتا ہے... کیونکہ محبت کے نام پر شکاری خوبصورت دھوکا دینے کے لیے دلوں میں جو اتر جاتے ہیں مگر... انجام کار دلوں سے ہی اتر جاتے ہیں۔

عشق کے پردوں میں چھپے حسن کی دلخراش تباہی

کا پُراثر احوال

لاہور کی سڑکیں تنور کے مانند دہک رہی تھیں۔

افشین اپنے اسٹاپ پر یونیورسٹی بس سے اتری تو پسینے سے جسم شرابور تھا۔ ہاتھ میں تھامی ہوئی پانی کی بوتل گرم ہو کر پینے کے قابل نہیں رہی تھی۔

وہ بس اسٹاپ کے ساتھ اس ذیلی سڑک پر سے ہوتی ہوئی اپنے فلیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی اسے مزید پندرہ بیس منٹ پیدل چل کر اپنے فلیٹ تک جانا تھا۔ فلیٹ میں افشین کے ساتھ تین اور بھی لڑکیاں تھیں۔ تین کمروں کے

اس فلیٹ میں کل ملا کے وہ چار لڑکیاں تھیں۔ دو کمرے رہائش کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ تیسرا چھوٹا کمرا کچن کے طور پر استعمال میں آتا تھا۔

وہ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ دو اور لڑکیاں بھی اسی یونیورسٹی میں تھیں۔ صرف ایک لڑکی ایسی تھی جو ایک پرائیویٹ کمپنی میں معمولی سی ملازمت کرتی تھی۔ ان چاروں کا تعلق ملتان سے تھا۔

افشین اپنے فلیٹ کے قریب پہنچی تھی کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے ہینڈ بیگ کے اندر سے موبائل نکالا۔ اس کی اسکرین پر جو نام چمک رہا تھا اسے دیکھ کر زیرِ لب مسکرائی۔ دوسری طرف اشعر تھا۔ اشعر اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ وہ دونوں الگ الگ ڈیپارٹمنٹ کے اسٹوڈنٹ تھے۔ ان کے درمیان تعلق کو ایک سال ہوا تھا۔ اب بات صرف یونیورسٹی لیول تک نہیں رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اشعر کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔

اس نے بٹن دبا کے ہیلو کہا۔ اشعر نے کہا۔ "افشین! آج یونیورسٹی میں تم سے مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ بعد میں بہت تلاش کیا۔ تمہارا موبائل بھی بند تھا۔ تم خیریت سے ہو نا؟"

وہ بولی۔ "اس لیکچر کے دوران اپنا موبائل آف رکھتی ہوں۔ بس میں بیٹھ کر یاد آیا تو ابھی کچھ دیر قبل آن کیا تھا۔"

"تم یونیورسٹی سے چلی گئی ہو؟ تم سے ضروری بات کرنا تھی۔"

اس نے کہا۔ "میں فلیٹ کے راستے میں ہوں۔ تیز دھوپ نے برا حال کیا ہوا ہے۔ زیادہ بات نہیں کر سکتی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں شام کو بائیک لے کر آؤں گا۔ کسی پرسکون جگہ بیٹھ کر بات کریں گے۔"

"کوئی خاص بات ہے کیا؟ کچھ اشارہ ہی کر دو۔ تجسس دور ہو گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ "خاص بات کے لیے ابھی وقت نہیں آیا۔ فی الحال ایک دوسری اہم بات ہے۔ اگلے ہفتے گرمیوں کی تعطیلات کی وجہ سے یونیورسٹی بند ہو رہی ہے۔ اس موقعے پر شمالی علاقے کی سیر پر جانے کا پروگرام بن رہا ہے۔ یہ بات میں نے تمہیں پہلے بھی بتائی تھی۔ اب شام تک اچھی طرح سوچ لو اور فیصلہ کر لو۔" یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

افشین کچھ دیر بعد فلیٹ میں آئی۔ اس کی ساتھی لڑکیاں ابھی پہنچی نہیں تھیں۔ اس نے شاور لیا۔ ایک ذرا تازہ دم ہو کے اپنے لیے چائے بنائی۔ کمرے میں اپنے بیڈ پر نیم دراز ہو کر ایک رسالہ دیکھتے ہوئے چائے پینے لگی۔ اس دوران باقی لڑکیاں بھی پہنچ گئیں۔ ان کی روم میٹ لڑکی کا نام مائرہ تھا۔ ملتان میں دونوں ایک ہی علاقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ گریجویشن تک پڑھا بھی ایک ہی کالج سے تھا۔ مائرہ انگلش لٹریچر میں ایم اے کر رہی تھی۔

شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ اس اثنا میں افشین کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ وہ بے تابی سے اشعر کی کال کا انتظار کر رہی تھی اور افشین تیار بھی ہو چکی تھی۔ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کے باہر نکلی۔ گھر سے بہت دور تھی۔ ماں باپ اور بھائیوں کی نظروں سے اوجھل تھی۔ کسی طرح کی روک ٹوک نہیں تھی۔

یہ صرف افشین کی ہی بات نہیں تھی۔ فلیٹ کی ساتھی لڑکیاں بھی اس آزادی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

ان کا فلیٹ ایک چھ منزلہ بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کے نیچے آئی۔ اشعر نے اسے دیکھ کے سگریٹ نیچے پھینک کر جوتے سے مسل دیا۔ اس نے بائیک اسٹارٹ کی تو افشین آ کے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اشعر نے بائیک آگے بڑھائی۔

دن بھر کی سخت گرمی کے بعد شام کے اس لمحے ایک ذرا خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں آ گئے جس کی بالائی منزل پر بھی بڑی رونق لگی رہتی تھی۔ یہاں خاص قسم کی محفلیں سجتی تھیں۔ وہاں متعدد کیبن بنے ہوئے تھے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں ان کیبنوں میں سگریٹ، شیشہ اور شراب کے شوق پورے کرتے تھے۔

وہ دونوں ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ ایک میز کے گرد بیٹھ کر آئس کریم کا آرڈر دیا۔

اشعر نے کہا۔ "افشین! میں نے جس ٹور کی بات کی تھی تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

وہ بولی۔ "تم نے ٹور کے بارے میں کچھ تفصیل نہیں بتائی تھی۔ اس لیے میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔"

اس نے کہا۔ "یار! ایک ہفتے کا ٹور ہے۔ ناران کاغان سے ہوتے ہوئے گلگت بلتستان کی طرف جانا ہے۔ وہاں استور، اسکردو اور ہنزہ نگر کی وادیاں اس تفریحی ٹور میں شامل ہیں۔"

افشین پرشوق لہجے میں بولی۔ "میں ان علاقوں میں کبھی نہیں گئی ہوں۔ ہمیشہ سے ہی وہاں جانے کا شوق رہا تھا۔ اب تمہاری وجہ سے مجھے موقع مل رہا ہے تو ظاہر ہے، میں انکار کر کے کفرانِ نعمت نہیں کر سکتی۔"

وہ جوش سے بولا۔ "ہمارے گروپ میں دس بارہ لوگ شامل ہیں۔ زیادہ تر نوجوان لڑکے لڑکیاں ہیں۔ ٹور کمپنی کے منتظم شوکت علی سیلانی صاحب اور ان کی بیگم ہیں۔ ایسے میں مجھے امید ہے، ہم بہت انجوائے کریں گے۔"

افشین بجھے بجھے سے انداز میں بولی۔ "وہ سب تو ٹھیک ہے اشعر! لیکن ایک مسئلہ ہے۔ میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں۔ میں نے ابھی چند دن پہلے گھر سے پیسے منگوائے تھے۔ میرے گھر کے حالات ایسے ہیں کہ اتنی جلدی پیسے نہیں منگوا سکتی۔ جبکہ ان دنوں شمالی علاقے میں ٹورسٹ سیزن ہے۔ میں نے سنا ہے وہاں بہت مہنگائی ہے۔ ایسے میں، میں شاید تمہارے ساتھ اس ٹور میں نہیں جا سکوں گی۔"

اشعر ہنس پڑا۔ "بے وقوف لڑکی! میرے ہوتے ہوئے تم اخراجات کے بارے میں فکر کیوں کرتی ہو۔ تمہاری چاہت میں آسمان سے چاند ستارے توڑ کر لانے کو تیار ہوں۔ ایک ہفتے کے ٹور کے اخراجات کیا برداشت نہیں کر سکتا؟"

اس دوران ویٹر نے ان دونوں کے سامنے آئس کریم لا کے رکھ دی۔

افشین آئس کریم کھاتے ہوئے ایک ذرا پریشانی سے بولی۔ "تمہارے پاس بھی کوئی خزانہ نہیں۔"

وہ ہنستے کے انداز میں بولا۔ "اے لڑکی! بس یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ مجھ پر بھروسا کرو۔"

افشین نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ٹھیک ہے اشعر! ان خوب صورت علاقوں میں جانے کا خواب تمہاری وجہ سے پورا ہو رہا ہے۔ میرے پاس بھی کچھ پیسے ہیں۔ ان سے بھی تھوڑی بہت مدد ملے گی۔"

آئس کریم کھا کے اشعر نے کہا۔ "افشین! اوپر چلتے ہیں۔ کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔"

اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ استقبالیہ کے قریب سیڑھیوں پر سے ہوتے ہوئے وہ بالائی منزل پر آئے۔ وہاں مخصوص کیبن بنے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ایک ہوٹل بوائے کی راہنمائی میں ایک کیبن میں آ گئے۔

اشعر اپنے ساتھ چرس بھرے سگریٹ لے آیا تھا۔ اس نے یہ خاص سگریٹ سلگا کے ایک افشین کو پیش کیا۔ وہ بھی کبھار یہ خاص قسم کے سگریٹ پیتی تھی۔ ملتان سے لاہور آنے کے ابتدائی عرصے میں جب وہ یونیورسٹی کی لڑکیوں کو چرس بھرے سگریٹ پیتے اور ڈرنک کرتے ہوئے دیکھتی تو اسے شدید حیرت ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ نہ صرف حیران ہونا بھول گئی بلکہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ ایک متوسط طبقے کے شریف خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کے خاندان میں لڑکے سگریٹ پیتے ہوئے بڑوں کے غصے سے خائف رہتے تھے۔

وہ بڑے شہر میں آ کے وہاں کے رنگ ڈھنگ کی ایسی عادی ہو گئی تھی کہ اسے یاد نہیں رہا تھا کہ اس طرح کے چونچلے اس جیسی لڑکی کے لیے شامتِ اعمال بن سکتے تھے۔

اشعر بھی ایک متوسط طبقے کا لڑکا تھا مگر تھا بڑا چلتا پرزہ قسم کا نوجوان۔ وہ سارے حربے اور طریقے جانتا تھا جن کی مدد سے بڑے شہر کے رنگ روپ اور تقاضوں میں سر اٹھا کے جیا جا سکتا تھا۔ وہ برائے نام یونیورسٹی آتا تھا۔ افشین کے پوچھنے پر اکثر اپنی مصروفیات کا بہانہ کرتا تھا۔ اس نے افشین کو لاہور کی ایسی ایسی رونقوں اور جنتوں سے آشنا کرایا تھا کہ جن کے بارے میں وہ فلموں اور ناولوں کی حد تک جانتی تھی۔ ان میں سے ایک عادت چرس بھرے سگریٹ اور کبھی کبھار کی ڈرنک تھی۔

ہوٹل بوائے ان کے لیے اسنیکس اور مشروبات لے آیا۔ اشعر نے افشین سے پوچھا تو اس نے معذرت کر لی۔ اس نے اپنے لیے [illegible] لیا۔

ریسٹورنٹ کے اس مخصوص مقام پر بنائے گئے کیبن بھی موجود تھے جہاں لڑکے لڑکیوں کو خاص خلوت فراہم کی جاتی تھی۔ ان کیبنوں کے الگ سے چارج لیے جاتے تھے۔

یہ غنیمت تھا کہ متعدد مرتبہ یہاں آ کے سگریٹ اور بیئر پینے کے علاوہ ابھی تک اشعر نے اس سے خلوت والے کیبن میں وقت گزارنے کا تقاضا نہیں کیا تھا۔

بہت دیر بعد وہ دونوں ریسٹورنٹ کی بالائی منزل کے خصوصی ماحول سے اتر کر نیچے آئے۔ اشعر نے بھرے سگریٹ اور بیئر کا زیادہ استعمال کیا تھا۔ اس کے قدم اک ذرا لڑکھڑا رہے تھے۔

افشین کا سر بھی تھوڑا گھوم رہا تھا مگر دل خوب جھوم رہا تھا۔ اشعر کے ساتھ بائیک کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ ایک تو سگریٹ کے نشے کا اثر تھا۔ دوسرا شمالی علاقے کی سیر کے خیال سے اس پر مستی چھائی ہوئی تھی۔

فلیٹ میں آئی تو مائرہ اکیلی کمرے میں موجود تھی۔

باقی دونوں لڑکیاں موجود نہیں تھیں۔ مائرہ بہت کم غیر نصابی شوق رکھتی تھی۔ یونیورسٹی سے آکر فلیٹ کے اپنے کمرے میں ہی بند رہتی تھی۔ انگلش اور اردو ادب کی کتابیں پڑھتی تھی۔ مختلف چینلز اور میگزینز کے لیے انگریزی اور اردو میں آرٹیکلز لکھتی تھی۔ یونیورسٹی میں بھی وہ سب سے الگ تھلگ بیٹھا کرتی تھی۔ انشین کے علاوہ کوئی اس کی دوست نہیں تھی۔ کئی لڑکے اس کی قربت کی تمنا میں قریب آئے تھے مگر اس کی سرد مہری اور بے اعتنائی سے پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

وہ انشین کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتی تھی۔ آئے روز جس طرح لڑکیوں کے استحصال اور ان کے ساتھ زیادتی کے جو واقعات رونما ہوتے تھے ان کا حوالہ دے کر لڑکوں سے غیر ضروری ملاقات سے پرہیز کی نصیحت کرتی تھی۔ انشین اس کی باتیں کبھی ہنس کے کبھی خاموش رہ کے ٹال دیتی تھی۔

انشین فلیٹ میں داخل ہوئی تو مائرہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "بہت دیر لگا دی تم نے۔ کیا اسی لڑکے کے ساتھ گئی تھیں جس کا نام اشعر ہے؟"

"ہاں ہاں۔ اس کی بائیک پر خوب گھومے پھرے۔ آئس کریم بھی کھائی۔" اس نے ریسٹورنٹ کی بالائی منزل کے مشاغل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

وہ اپنے لیپ ٹاپ پر نظر [illegible] "ویسے ہم ملتان میں اپنی آزاد خیالی نہیں تھیں [illegible] استعمال کرتی تھیں۔ کسی لڑکے کے ساتھ دوستی بھی نہیں تھی۔ لاہور آئے دوسرا سال ہے۔ تم اتنی بے باک ہو گئی ہو جینز پہنتی ہو کئی کئی گھنٹے لڑکے کے ساتھ بائیک پر گھومتی رہتی ہو۔"

انشین نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "زندگی اسی کا نام ہے۔ اس کے رنگ ڈھنگ بدلتے رہتے ہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں لاہور کی ان رونقوں میں ہی زندگی کا اصل مزہ ہے۔ آج کے رویے بدل گئے ہیں۔ جب تک سانس چلتی ہے اسے زندہ دلی سے گزارنا چاہیے۔"

مائرہ نے کہا۔ "یار انشین! میں بہت ڈرتی ہوں۔ روزانہ میڈیا پر خبریں گردش کرتی رہتی ہیں کہ فلاں جگہ لڑکی کے ساتھ ریپ ہوا۔ فلاں لڑکی کا قتل ہوا۔ کہیں لڑکی کے ساتھ لڑکا قابل اعتراض حالت میں پکڑا گیا۔ ان کی تصاویر اور ویڈیوز سوشل میڈیا پر وائرل ہو گئیں وغیرہ وغیرہ۔ ذرا سوچو! ہم شریف اور متوسط خاندانوں سے ہیں۔ خدانہ کرے ہمارے ساتھ کچھ برا ہو جائے تو ہمارے ماں باپ اور بھائیوں پر کیسی قیامت ٹوٹے گی؟ وہ ہم پر بھروسا کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے بڑے شہر بھیجتے ہیں۔ ہمیں ان کے بھروسے کی لاج رکھنی ہوگی۔"

انشین کے دماغ پر ابھی تک بھرے سگریٹ کے اثرات تھے۔ مائرہ کی ناصحانہ باتوں سے دل میں غبار سا اٹھا۔ وہ اک ذرا طنز سے بولی۔ "میں نے تمہارے آرٹیکلز نہیں پڑھے ہیں۔ باتوں سے لگتا ہے ایسی ہی بکی بکی زیر ناپ باتیں ہوں گی۔ یار انشین! تم ہر وقت کمرے میں بند رہتی ہو۔ میری مانو کل سے تم بھی میرے ساتھ باہر نکلو۔ ایک عدد لڑکے سے دوستی بھی فرما لو۔ پھر دیکھو گی یہ دنیا کتنی حسین ہے۔ یہ رونقیں، یہ ہلا گلا، یہ دوستیاں زندگی کے لیے کتنی لازم ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی واش روم کی طرف چلی گئی۔ پیچھے سے مائرہ اسے افسوس اور دکھ بھری نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

ان کے تفریحی ٹور کا آج چوتھا دن تھا۔ اس وقت وہ نگر کی وادی میں تھے۔ یہ ہنزہ سے پہلے مشہور وادی ہے۔ شاہراہ ریشم کے دائیں بائیں پھیلی ہوئی یہ وادی اپنے دلفریب مناظر اور خوش ذائقہ پھلوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ دنیا کی بلند ترین چوٹیوں میں سے ایک راکاپوشی اسی وادی میں واقع ہے۔

اپنے سفر کے پہلے پڑاؤ میں انہوں نے کاغان میں قیام کیا تھا۔ دن کے وقت ناران کاغان کی قریبی وادیوں کی سیر کی تھی۔ وہ رات گزار کے اگلی صبح آگے روانہ ہوئے تھے۔

ان کے گروپ میں ڈرائیور کو ملا کے کل پندرہ افراد تھے۔ چند شادی شدہ جوڑے تھے۔ کچھ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ اس گروپ کے منتظم شوکت علی سیلانی تھے۔ ان کی بیگم صفیہ بانو بھی ٹور میں شامل تھیں۔ شوکت علی سیلانی کی اپنی ٹور آپریٹنگ کمپنی تھی جس کے ذریعے وہ پورے پاکستان میں تفریحی ٹور کراتے تھے۔ اس دفعہ شمالی علاقے کے اس سفر میں دونوں میاں بیوی بھی شریک ہوئے تھے۔

ناران کاغان سے وہ سیدھے گلگت بلتستان روانہ ہوئے تھے۔ وہاں ان کی پہلی منزل استور وادی تھی جہاں راما جھیل کے دلکش سماں اور دیوسائی کے وسیع و عریض سبزہ زار کے بھرپور نظارے کرنے والے نظاروں میں ایک دن گزار کر اسکردو پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد گلگت روانہ ہوئے تھے۔

چھ سات گھنٹوں کے مشکل سفر کے بعد وہ گلگت پہنچ گئے تھے۔ گلگت شہر میں قیام کر کے [illegible] طرف روانہ ہوئے۔ جہاں تین دن مزید گزار کے واپس لاہور جانے والے تھے۔

سیلانی گروپ کے منتظم شوکت علی سیلانی بہت ہی اصول پسند انسان تھے۔ انہوں نے ٹور کے آغاز میں ہی نظم و ضبط کے حوالے سے لمبا چوڑا لیکچر دیا تھا۔ ان کے ڈسپلن میں شامل تھا کہ غیر شادی شدہ لڑکے لڑکیاں الگ الگ کمروں میں رات گزاریں گے۔ کمروں کے اندر کوئی سگریٹ نوشی نہیں کرے گا۔ رات بارہ بجے کے بعد کمروں کے دروازے بند ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

آج چوتھے دن ان کا قیام وادی نگر میں تھا۔ وہاں راکاپوشی کے دامن میں ایک گیسٹ ہاؤس میں ان کی رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ گیسٹ ہاؤس کھیتوں اور باغوں کے درمیان ایک اونچی سی جگہ بنا ہوا تھا۔ گیسٹ ہاؤس کے اندر اور باہر انگور، خوبانی، شہتوت اور چیری کے بہت سے درخت سایہ کیے ہوئے تھے۔ گیسٹ ہاؤس کے سامنے کھلا لان تھا جس پر نرم نرم گھاس ہرے مخمل کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ اس گیسٹ ہاؤس میں آ کے وہ سب بہت خوشی محسوس کر رہے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد گروپ کے اکثر لڑکے لڑکیاں گیسٹ ہاؤس کے لان میں کرسیوں پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ آسمان پر پورے دنوں کا چاند کسی روشن تھال کی طرح جگمگا رہا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں راکاپوشی کی برفیلی چوٹی سے ہم آغوشی کر رہی تھیں۔

انشین اور اشعر سب سے ہٹ کر لان چیئرز پر بیٹھے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

اچانک اشعر نے کہا۔ "یار انشین! مجھے خاص سگریٹ کی بہت طلب ہو رہی ہے۔ میرا ساتھ دو گی؟"

وہ چونک کر بولی۔ "یہاں گیسٹ ہاؤس میں؟ ان سب کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ارے نہیں۔ میں یہاں کی بات نہیں کر رہا۔ میرا ایک مقامی دوست آنے والا ہے۔ اس سے بات ہوئی ہے۔ یہاں قریب ہی ایک جگہ جا کے انجوائے کریں گے۔"

وہ ہنس پڑی۔ "بہت تیز ہو۔ مقامی دوست بھی بنا لیا ہے۔"

"شاہد کریم میرا گہرا دوست ہے۔ ہنزہ کا رہنے والا ہے۔ کئی سالوں سے اس سے تعلق ہے۔"

"ویسے مجھے بھی طلب ہو رہی تھی۔ بہت دن ہوئے پیے ہوئے۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا نا؟ میں نے سنا ہے یہاں کے لوگ منشیات کو پسند نہیں کرتے۔"

"فکر مت کرو۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ٹورسٹ سیزن میں یہاں سب چلتا ہے۔ ویسے بھی شاہد کریم بھروسے کا بندہ ہے۔ وہ اپنی گاڑی لے کر آ رہا ہے۔"

اسی وقت اشعر کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ وہ موبائل کی اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ اسی کی کال ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے کال ریسیو کی۔ مختصر سی بات کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔

"چلو اٹھو انشین! وہ گیسٹ ہاؤس کے باہر آیا ہے۔"

اشعر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

وہ متردد لہجے میں بولی۔ "دور تو نہیں جانا ہے نا۔ دیر ہو گئی تو شوکت علی صاحب اور ان کی بیگم کی ڈانٹ سننی پڑے گی۔"

"اس کے لیے ابھی دو گھنٹے سے زیادہ وقت ہے۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم وقت سے پہلے واپس آجائیں گے۔"

پارکنگ ایریا میں ایک سرخ رنگ کی ٹویوٹا کرولا سے ٹیک لگائے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی عمر پچیس سال کے قریب تھی۔ چہرے کے خطوط عام سے تھے۔ اس کا رنگ صاف تھا۔

اشعر اسے دیکھ کر اپنے بازو پھیلا کے اس کی طرف بڑھا۔ دونوں گرم جوشی سے بغل گیر ہو گئے۔

"انشین! یہ میرا دوست شاہد کریم ہے۔ بڑا زندہ دل اور یار باش انسان ہے۔"

انشین نے بھی اس سے ہیلو ہائے کیا۔ ذرا ہی دیر میں تینوں گاڑی میں بیٹھ کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔ گیسٹ ہاؤس بلندی پر تھا۔ ایک کچا راستہ نشیب کی طرف جاتا تھا جو بیس پچیس منٹ کے بعد شاہراہ ریشم سے جا کر ملتا تھا۔ اس وقت شاہد کریم انہیں لے کر شاہراہ ریشم کی سمت جا رہا تھا۔

وہ جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں سڑک کے ساتھ ایک ہوٹل تھا۔ ان دونوں کو لے کر شاہد کریم اس ہوٹل کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں آیا۔ انشین دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔ رات گئے ایک ہوٹل کے کمرے میں دو لڑکوں کے ساتھ بھرے سگریٹ پینے کے خیال سے اندر ہول اٹھ رہے تھے۔

اس کے چہرے پر منڈلاتے خوف کے سائے دیکھ کر اشعر نے قہقہہ لگایا۔ "اف انشین! اتنی خوف زدہ کیوں ہو؟ کچھ نہیں ہوگا۔ میں پہلے بھی یہاں آیا ہوں۔ یہ ہوٹل شاہد کریم کے ایک دوست کا ہے۔"

شاہد کریم بولا۔ "مس انشین! ریلیکس۔ فری ہو کے بیٹھ

جائے گا کوئی ہمیں نہیں ٹوکے گا۔"

ان دونوں کو کمرے میں چھوڑ کے وہ باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں سوفٹ ڈرنک کی بوتلیں تھیں۔ ساتھ میں ڈسپوزایبل گلاس بھی تھے۔ اس نے گلاس اور بوتلیں سامنے میز پر رکھ دیے۔ ایک طرف کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یار اشعر! تمہاری قسمت اچھی تھی کہ مجھے مال مل گیا۔ ٹورسٹ سیزن کی وجہ سے ڈیمانڈ بہت زیادہ ہے۔ اس لیے مال سپلائی کرنے والے بڑے نخرے کرتے ہیں۔ پولیس والے الگ سے تنگ کرتے ہیں۔"

اس نے میز پر سے ایک بوتل اٹھائی۔ اس کا ڈھکن کھول کے ڈسپوزایبل گلاسوں میں بھرنے لگا۔ تبھی افشین سمجھ گئی کہ بظاہر سوفٹ ڈرنک نظر آنے والی بوتلوں میں شراب بھری ہوئی تھی۔

شاہد کریم نے ایک گلاس اس کی طرف بھی بڑھایا۔ اس نے معذرت کرلی۔ اشعر نے ایک دوبار پینے کو کہا۔ اس کے انکار پر ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "چلو اچھا ہے۔ تم ڈرنک نہ کرو۔ ہم زیادہ پی کے بہک گئے تو تم سنبھال لوگی۔"

وہ بولی۔ "اشعر! میں تمہیں بہکنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ ہمیں واپس گیسٹ ہاؤس بھی جانا ہے۔ شوکت صاحب کا سامنا بھی کرنا ہے۔"

اشعر نے دوسرا پیگ لیتے ہوئے کہا۔ "ارے بھاڑ میں جائے سیلانی صاحب اور ہمارا باپ نہیں۔ وہ کون ہوتا ہے ہمیں پابند کرنے والا؟ تم ڈرنک نہیں کرنا چاہتی ہو تو نہ کرو۔ سگریٹ پیو۔"

اس نے اشارہ کیا۔ شاہد کریم نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اس میں سے چرس بھرے سگریٹ نکال کے ان دونوں کو دیے۔ ایک اس نے خود سلگایا۔

افشین خاص سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لینے لگی۔ دماغ پر ہلکا ہلکا سرور چھاتا جارہا تھا۔ جسم کا انگ انگ جیسے کسی کبوتر کی طرح جھوم جھوم کے فضاؤں میں تیر رہا تھا۔

ایک سگریٹ کے بعد اس نے مزید پینے سے پرہیز کیا۔ اسے رہ رہ کر سیلانی صاحب اور ان کی بیگم کا خیال آرہا تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوا کہ وہ نشہ کرکے آئے ہیں تو بہت غصہ ہوں گے۔

ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ سیلانی گروپ کے لیے مقررہ وقت ختم ہونے میں آدھا گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔ اشعر ڈرنک اور سگریٹ چھوڑنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

افشین نے کئی مرتبہ یاد دہانی کرائی لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے جب دیکھا اشعر اٹھنے کا نام نہیں لے رہا تو وہ جھنجلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ تیز لہجے میں کہنے لگی۔ "اشعر پلیز! اب بس بھی کرو۔ دیکھو تو ساڑھے گیارہ بج گئے ہیں۔ گیسٹ ہاؤس پہنچنے کے لیے بہت کم وقت رہ گیا ہے۔"

اشعر گلاس میں موجود آخری گھونٹ بھر کے لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ "ڈارلنگ! کیوں بار بار گیسٹ ہاؤس کا نام لے کر موڈ خراب کرتی ہو؟ میرا بس چلے تو اس سیلانی اور اس کی بیوی کو راکاپوشی کی چوٹی پر لے جاکے نیچے دھکا دے دوں۔ سالا ہمارے ٹور کا منتظم نہ ہوا، پروفیسر ہوا کہ پانچ منٹ لیٹ ہونے پر سب کے سامنے بھاشن دینے لگ جاتا ہے۔"

اس نے کہا۔ "ٹھیک ہی تو کر رہا ہے اشعر! ڈسپلن سے ہی تو چیزیں بہتر ہوتی ہیں۔ ویسے بھی یہ ان کی کمپنی کی پالیسی ہے۔ ہم اسے ماننے کے پابند ہیں۔"

شاہد کریم پر بھی نشہ غالب آگیا تھا۔ اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "اے مس افشین! یہ ڈسپلن وسپلن سب بکواس ہے۔ یہ جوانی، یہ مستی اور یہ آزاد زندگی بار بار نصیب نہیں ہوتی۔ اسے جی بھر کے انجوائے کرنا چاہیے۔ تمہارے سیلانی صاحب کے ڈسپلن کا قیدی بن کے نہیں۔" یہ کہہ کر وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

افشین کے کچھ کہنے سے پہلے اشعر نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو شاہد! ہم کچھ آزاد فضاؤں میں زندہ دلی کے لیے لاہور کی گرمی اور افراتفری چھوڑ کے آئے ہیں۔ ایسے میں اس کھڑوس بڈھے شوکت علی سیلانی کے احکامات کے تابع رہیں گے تو خاک ٹور سے لطف اٹھائیں گے۔"

شاہد کریم چرس کا نیا سگریٹ سلگا کے اسے دیتے ہوئے بولا۔ "اسی لیے میں کہتا ہوں الگ ہو جاؤ اس سیلانی گروپ سے۔ شوکت سیلانی صاحب کو خدا حافظ کہہ دو۔ آگے کا ٹور تم دونوں کو میں کرواتا ہوں۔"

اشعر چونکتے ہوئے بولا۔ "کیا سچ کہتے ہو شاہد! تم ہمیں ٹور کیسے کروا سکتے ہو؟"

"یار اشعر! تم جانتے ہو میرے پاس اپنی گاڑی ہے۔ آگے ہنزہ میں اچھے ہوٹل والوں سے میرے تعلقات ہیں۔ تم دونوں اس سیلانی گروپ سے زیادہ بہتر انداز میں ٹور انجوائے کرو گے۔"

افشین ابھی تک کھڑی تھی۔ اشعر اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم کیا کہتی ہو ڈارلنگ! شاہد کریم کی آفر بہت

پرکشش ہے۔ اسے آزمانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا میں۔"

وہ ایک ذرا تامل سے بولی۔ "چار پانچ دن سیلانی گروپ کے ساتھ گزار کر سب سے مانوس سی ہو گئی ہوں۔ اس کے علاوہ گروپ کی شکل میں ایک تحفظ کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ویسے بھی ذرا سے ڈسپلن کے علاوہ سیلانی گروپ سے کوئی اور پرابلم بھی نہیں۔"

اشعر نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "اسی نام نہاد ڈسپلن سے تو میں تنگ آگیا ہوں۔ شاہد میرا قابل بھروسا دوست ہے۔ ہمیں کسی مشکل میں نہیں ڈالے گا۔ اگلے تین چار دن ذرا آزادی سے موج مستی میں گزاریں گے۔"

افشین مجبور تھی۔ اس تفریحی ٹور پر وہ اشعر کے پیسوں سے آئی تھی۔ اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس نے با دل ناخواستہ سر جھکا کے اپنی رضامندی دے دی۔

وہ جب گیسٹ ہاؤس واپس آئے تو مقررہ وقت سے آدھا گھنٹا زیادہ ہو چکا تھا۔ اس دوران ان دونوں کے موبائل پر سیلانی صاحب کی متعدد کالیں آچکی تھیں۔ افشین نے ایک دفعہ کال اٹینڈ کرکے بتا دیا تھا کہ کسی ضروری کام سے ہائی وے کی طرف گئے تھے۔ اب واپس آرہے ہیں۔

اس کے باوجود گیسٹ ہاؤس پہنچنے تک دونوں کے موبائل پر وہ مسلسل کال کرتے رہے تھے۔ اب چونکہ انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ سیلانی گروپ سے اپنی راہیں جدا کرنی ہیں، اس لیے فون پر سیلانی صاحب کی جھڑکیاں سن کے موڈ خراب کرنے کے بجائے انہوں نے فون ہی اٹینڈ نہیں کیا تھا۔

گیسٹ ہاؤس کے لان میں سیلانی صاحب اپنی بیگم کے ساتھ ان دونوں کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر سخت لہجے میں کہا۔ "آتی رات گئے تم دونوں کہاں سے آرہے ہو؟ ڈسپلن توڑنے پر کیا مجھے کوئی ایکشن نہیں لینا چاہیے؟"

اشعر نخوت بھرے لہجے میں بولا۔ "افشین نے بتا تو دیا تھا ہم ایک دوست کے ساتھ ہائی وے کی طرف گئے تھے۔ وہاں گپ شپ میں پتا نہیں چلا۔ ویسے ہم آدھے گھنٹے ہی تو تاخیر سے آئے ہیں؟"

"بات آدھے گھنٹے کی نہیں۔ کمپنی کی پالیسی کی ہے۔" وہ برہمی سے بولے۔ "ہماری کریڈیبلٹی کی ہے۔ میں کئی برسوں سے یہ ٹور کمپنی چلا رہا ہوں۔ اس کی کامیابی کے پیچھے ڈسپلن ہی اہم فیکٹر ہے۔"

اشعر نے ناگواری سے کہا۔ "ہم کوئی بچے نہیں ہیں۔ پڑھے لکھے اور باشعور نوجوان ہیں۔ آدھے گھنٹے کی تاخیر پر کبھی ہماری یونیورسٹی کے پروفیسرز نے بھی یوں عدالت نہیں لگائی۔ آپ تو ان سے بھی سخت رویہ اختیار کر رہے ہیں۔"

"برخوردار! میں جانتا ہوں تم دونوں بچے نہیں ہو۔ تمہاری یونیورسٹی کے پروفیسرز تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟ مجھے اس سے بھی غرض نہیں۔ مجھے صرف اپنی کمپنی کی نیک نامی اور اخلاقی حدبندی سے سروکار ہے۔ ویسے جن سرخ سرخ آنکھوں اور لڑکھڑاتی زبان کے ساتھ تم میرے سامنے کھڑے ہو، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تم کسی محفل سے اٹھ کر آئے ہو۔ ایسے میں اگر ڈسپلن پر سختی نہیں کی جاتی ہے تو وہ سب یہاں بیٹھ کر بھی کرو گے۔ کسی اور گروپ میں ایسی آزادی ہو سکتی ہے مگر سیلانی ٹور کمپنی میں اس کی قطعاً اجازت نہیں۔"

افشین کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔ وہ خود کو چور محسوس کر رہی تھی۔ سیلانی صاحب کی تجربہ کار اور جہاں دیدہ نظروں نے ایک دم تاڑ لیا تھا کہ وہ نشہ کرکے آرہے تھے۔

اشعر نے اپنا جارحانہ رویہ برقرار رکھا۔ "سیلانی صاحب! ہم سے بڑی غلطی ہوئی کہ آپ کے ساتھ اس ٹور میں شامل ہو کر آگئے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا آپ تفریح کم کراتے ہیں، مارشل لا زیادہ لگاتے ہیں۔ بس کل سے ہم دونوں آپ سے الگ ہو رہے ہیں۔ اگر باقی دنوں کے چارجز واپس کرنا چاہتے ہیں تو مہربانی ہوگی۔ نہیں تو ہم اسے تاوان بھی نہیں۔ ہم کل صبح آگے ہنزہ کی طرف جا رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر سیلانی صاحب اور ان کی بیگم کو ہکا بکا چھوڑ کے، وہ افشین کا ہاتھ پکڑ کے اسے زبردستی کھینچتے ہوئے کمروں کی طرف لے چلا۔ اسے اس کے کمرے کے دروازے کے پاس چھوڑ کے واپس اپنے کمرے کی طرف آیا اور دروازہ کھول کے اندر جاکے دھڑاکے سے اسے بند کر دیا۔

☆☆☆

اگلے دن سیلانی گروپ کا پروگرام راکاپوشی بیس کیمپ تک پیدل چل کے جانے کا تھا۔ بیس کیمپ تک جا کے واپس آنے میں تین سے چار گھنٹے لگنے والے تھے۔

صبح ناشتے کے فوراً بعد ہی شوکت علی سیلانی صاحب نے سب کو تیار ہونے کی ہدایت کی۔

اشعر ناشتے کے لیے گروپ کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا۔ افشین ساتھی لڑکیوں کے ساتھ جاگ گئی تھی۔ وہ بہت بجھی بجھی سی تھی۔ اس گروپ کے ساتھ اس کا دل لگ گیا تھا۔ ساری ہی لڑکیاں خوش مزاج اور ہم خیال تھیں مگر اشعر کا حکم تھا کہ سیلانی گروپ سے علیحدہ ہو کے اپنے طور پر ٹور کرنا تھا۔

انہوں نے گروپ چھوڑنے کی بات کسی ساتھی لڑکی کو نہیں بتائی تھی۔ ناشتے کے بعد اس نے سر درد کا بہانہ بنایا اور راکاپوشی میں کیمپ کی طرف جانے سے معذرت کر لی۔
بیگم صفیہ جانے سے پہلے کمرے میں آ گئیں۔ وہ بیڈ پر دراز موبائل دیکھ رہی تھی۔
بیگم صفیہ اسے گھور کر دیکھتے ہوئے بولیں۔ "کیا تم دونوں نے واقعی گروپ چھوڑ کے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"
وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "یہ فیصلہ میرا نہیں ہے پھر بھی میں اس کی مخالفت بھی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میں اشعر کو چھوڑ نہیں سکتی۔"
بیگم صفیہ افسوس سے بولیں۔ "اشعر کی ضد اور ہٹ دھرمی تمہیں مصیبت میں ڈال دے گی۔ یہ مت بھولو تم اس کی بیوی نہیں ہو۔ پورے گروپ کے ساتھ تمہاری جان اور مال کے علاوہ عزت بھی محفوظ تھی لیکن اس کے ساتھ تنہا سفر کرو گی۔ اکیلے میں راتیں گزارو گی تو کیا خود کو محفوظ رکھ سکو گی؟"
اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اشعر کے ساتھ میرا تعلق ایک سال سے ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ ایک حد سے آگے نہیں بڑھے گا۔"
"جوانی دیوانی ہوتی ہے نادان لڑکی! اس عمر میں زبانی کلامی یقین سے کچھ نہیں ہوتا۔ بھٹکتے جذبوں کا سارا کھیل ہوتا ہے جس میں ہوش و حواس باقی نہیں رہتے۔ ایک بات یاد رکھو۔ تم اس کے ساتھ جا کے وقتی مسرتیں تو حاصل کر لو گی لیکن دائمی پریشانیاں بھی تمہارے ساتھ چپک جائیں گی۔"
یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئیں۔ انفشین شکستہ سے دل کے ساتھ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کا دل چیخ چیخ کر بیگم صفیہ کی باتوں کی تائید کر رہا تھا مگر دماغ روک رہا تھا۔
اشعر بیدار ہوا۔ ناشتے کے بعد اس نے انفشین کو بتایا کہ جانے کی تیاری کر لے۔ شاہد کریم گاڑی لے کر آنے والا ہے۔
وہ بجھے بجھے دل کے ساتھ اپنی چیزیں سمیٹ کر بیگ میں ڈالنے لگی۔ اشعر کے ساتھ اکیلے میں سفر کرنے اور راتیں گزارنے کے خیال سے اس کے دل میں کئی طرح کے اندیشے بھی جنم لے رہے تھے۔ ساتھ ساتھ ایک سنسنی خیزی بھی محسوس کر رہی تھی۔ آزاد فضاؤں میں اپنے محبوب کے ساتھ بے فکری اور بے خوفی سے گھومنے پھرنے اور موج مستی کرنے کا احساس بھی بڑا خوش گوار تھا۔
کچھ ہی دیر میں شاہد کریم پہنچ گیا۔ ان دونوں نے اپنے بیگ گاڑی میں رکھ دیے۔ اشعر اس بات پر بہت آگ بگولا تھا کہ سیلانی صاحب نے باقی پیسے واپس نہیں کیے تھے۔ وہ ہونٹ بھینچ کر انہیں بے نقط سناتے ہوئے گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔
شاہد کریم نے کار اسٹارٹ کی۔ اس نے بتایا کہ ایک گھنٹے میں وہ ...... ہنزہ پہنچ جائیں گے۔ وہاں اس کی جان پہچان والوں کے ہوٹل ہیں۔ بہت مناسب دام میں کمرا مل جائے گا۔

☆☆☆

شاہراہ ریشم پر بہت سبک رفتاری سے وہ ہنزہ کی سمت بڑھتے گئے۔ سیب، خوبانی، چیری اور شہتوت کے درختوں کے درمیان سے بل کھاتی، نہایت دل فریب منظر پیش کرتی شاہراہ پر سے ہوتے وہ ایک گھنٹے میں کریم آباد پہنچ گئے۔
کریم آباد ہنزہ کا سب سے مشہور سیاحتی مرکز ہے۔ ہائی وے سے ایک سڑک وادی کے اندر سے بلند ہوتی ہوئی اوپر جاتی ہے۔ وہاں بلندی پر جہاں بازار اور بلتت قلعہ ہے۔ جہاں تنگ سی سڑک کے اطراف بہت سے ہوٹل ہیں۔
شاہد کریم انہیں لے کر کریم آباد کے بازار میں آیا۔ ایک جگہ کار کھڑی کر کے کہا۔ "یہاں ہر طرح کے ہوٹل ہیں۔ بہت مہنگے بھی اور مناسب کرائے کے بھی۔ دو تین ہوٹل ایسے ہیں جہاں میرے تعلقات ہیں۔ میں وہاں جا کے معلوم کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کسی اچھے ہوٹل میں جگہ مل جائے گی۔"
یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ بہت دیر بعد اشعر کے موبائل پر اس کی کال آئی۔ اس نے بات سن کے انفشین سے کہا۔ "شاہد مجھے بلا رہا ہے۔ رش زیادہ ہونے کی وجہ سے ہوٹل میں کمرا نہیں مل رہا۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔"
اشعر بھی چلا گیا۔ انفشین بے دلی سے کار کے شیشوں سے باہر کریم آباد بازار کو دیکھنے لگی۔ چھوٹی سی سڑک پر بہت ہجوم تھا۔ مقامی لوگ بھی تھے۔ غیر مقامی سیاح بھی دکھائی دے رہے تھے۔ چند غیر ملکی سیاح بھی اس منظر میں رنگ بھر رہے تھے۔
انفشین نے ایک بات خصوصی طور پر محسوس کی۔ یہاں کی مقامی لڑکیاں اور عورتیں اسے باقی علاقوں کی نسبت زیادہ بے باک اور بے حجاب دکھائی دیں۔ استور، اسکردو اور گلگت میں بھی اسے عورتیں نظر آئی تھیں۔ ان میں خال خال اسکارف یا چادر کے بغیر ہوتی تھیں جبکہ ہنزہ میں اسے لڑکیاں جدید فیشن کے لباس، تنگ پاجامے، جینز اور بغیر چادر

کے بہت بے باکی سے بازار اور سڑکوں پر چلتی پھرتی دکھائی دی تھیں۔
تھوڑی دیر بعد اشعر اور شاہد کریم واپس آئے۔ اشعر نے کہا۔ "انفشین! ایک مسئلہ ہے۔ یہاں کسی ہوٹل میں کمرا نہیں ملا۔ سیاحوں کا اتنا رش ہے کہ ہوٹلوں کی چھتوں اور برآمدوں میں بھی خیمے لگا کے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک دو جگہوں میں کمرے مل رہے تھے مگر کرایہ بہت زیادہ بتا رہے تھے۔"
وہ دھیرے سے بولی۔ "یہ شاہد کریم بڑے دعوے کر رہا تھا۔ پہلی ہی بار میں ناکام ہو گیا کیا؟"
شاہد کریم کھسیانا سا ہو کے بولا۔ "مس انفشین! میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ ادھر کریم آباد میں ویسے بھی کمرے مہنگے ہوتے ہیں۔ کئی کئی دن پہلے بکنگ کی جاتی ہے۔ ہم نے گھر سے روانہ ہوتے ہوئے اس طرف توجہ نہیں دی۔ اس لیے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔"
"تو کیا ہم کسی اور علاقے کی طرف جائیں گے؟" اس نے پوچھا۔
"جی ہاں۔ ہم علی آباد جائیں گے۔ یہاں سے پندرہ بیس کلو میٹر نیچے مرکزی شہر ہے۔ ہنزہ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ وہاں بہت سے ہوٹل ہیں۔ میں نے ابھی فون پر بات کی ہے۔ وہاں کمرا مل جائے گا۔"
اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ کار ریورس کی۔ اسی بل کھاتی سڑک سے ہوتے ہوئے وہ نشیب کی طرف جانے لگے جہاں شاہراہ ریشم کے ذریعے وہ علی آباد پہنچ جاتے۔
علی آباد بڑا شہر تھا۔ اس کا بازار بھی بڑا تھا۔ اس لیے شور شل...... اور افراتفری بھی باقی علاقوں کی نسبت زیادہ تھی۔ شاہراہ ریشم کے اطراف میں متعدد ہوٹل تھے۔ شاہد کریم انہیں لے کر ایک تین منزلہ ہوٹل میں آیا۔ انفشین کو ڈائننگ ہال کی ایک میز پر بٹھا کے وہ دونوں استقبالیہ پر موجود شخص کے پاس گئے۔ سرگوشی میں اس سے بڑی دیر باتیں کرتے رہے۔
تھوڑی دیر بعد اشعر اس کے پاس آیا۔ چہرے پر فکر مندی کے آثار پیدا کر کے بولا۔ "انفشین! کمرا تو مل گیا ہے مگر ایک پرابلم ہے۔"
"کیا مسئلہ ہے؟"
"مجھے اندازہ نہیں تھا یہاں کمرے اتنے مہنگے ہوں گے۔ شاہد کریم کی سفارش کے باوجود ایک کمرا پانچ ہزار سے کم پر دینے کو تیار نہیں۔ آس پاس تو اس سے بھی زیادہ کرایہ ہے۔ اس لیے مجبوراً ایک ہی کمرا لیا ہے۔ تمہیں کوئی

"اعتراض تو نہیں ہے نا؟"
اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں سیلانی گروپ کے ساتھ بہت مانوس ہو گئی تھی۔ تم نے چھوڑ دینے کو کہا، میں نے بُرا مانے بغیر تمہاری بات مان لی۔ اب بھی مجبوری ہے تو میں اعتراض کرنے والی کون ہوتی ہوں؟"
وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے بولا۔
"میں نے تمہیں دل سے چاہا ہے۔ پچھلے ایک سال میں تم میرے لیے اتنی اہم ہو گئی ہو کہ تمہیں اپنے سے الگ نہیں سمجھتا۔ اس کے باوجود بھی تمہارے ساتھ ایک کمرے کی تنہائی میں رات نہیں گزاری ہے۔ حالات نے یہ دن دکھایا ہے تو ایسا تجربہ کر کے بھی دیکھتے ہیں۔"
انشین اس کے لہجے میں موجزن پیار کی حدت سے پگھلتے ہوئے بولی۔ "مجھے بھی پیار کا دعویٰ کہ پچھلی بار تم سے ملا ہے۔ اسی محبت کی زنجیروں میں بندھی میں تنہا تمہارے ساتھ اتنی دور آئی ہوں۔ میں نہیں جانتی یہ بھروسا ہے یا دھوکا۔ جو بھی ہے میں تمہارے ساتھ ایک کمرے کی تنہائی میں رہتے ہوئے کوئی پریشانی محسوس نہیں کرتی۔"
سیانے کہتے ہیں جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اس پر عشق کا بھی بھوت سوار ہو جائے تو سدھ بدھ نہیں رہتی۔ جو باقی رہتی ہے سوتے جاگتی ہے۔
انشین بھی اگر ایک لڑکے کے ساتھ تنہائی میں رات گزارنے کے عذاب سے بے خبر تھی [illegible] میں آنے والی [illegible] جانتے ہیں تیل سے آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ بھی جانتی تھی کہ اشعر کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے کا انجام جلتی ہوئی آگ پر تیل چھڑکنے جیسا تھا مگر اس کے دل میں ذرا سا بھی خوف نہیں تھا۔ اس کا دماغ بالکل بھی اس کی شدت کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔
ہوٹل کا کمرا دوسری منزل پر تھا۔ اس کی کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی۔ بازار کے پیچھے ذرا فاصلے پر دریا کے اس پار وادی نگر کے پہاڑ تھے جن کے دامن میں نگر کی بالائی آبادیاں اپنی ہریالی کی بدولت بہت دل کش منظر پیش کر رہی تھیں۔
کمرا درمیانے سائز کا تھا۔ دو بیڈ آمنے سامنے موجود تھے۔ ان دونوں نے اپنا سامان کمرے میں رکھا۔ منہ ہاتھ دھو کے تازہ دم ہوئے تھے کہ شاہد کریم آ گیا۔
وہ انشین سے مخاطب ہو کر ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ "میں جانتا ہوں نگر کے گیسٹ ہاؤس کی نسبت یہ کمرا چھوٹا ہے۔ یہاں کوئی سرسبز لان بھی نہیں مگر میں وعدہ کرتا ہوں ایک دو دن بعد آگے بالائی ہنزہ کی وادی گوجال کی طرف جائیں گے تو اچھے اور پُرفضا ہوٹل میں قیام کا انتظام کروں گا۔"
انشین نے دھیرے سے کہا۔ "سفر کے دوران ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ہوٹل اتنا اچھا نہیں مگر ایک دو دن کسی طرح گزر جائیں گے۔"
اشعر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "اس جھیلی سیلانی کے ساتھ فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی دم گھٹ جاتا۔ یہ ہوٹل بے شک بڑا نہیں لیکن سب سے بڑی بات آزادی ہے۔ جب جی چاہے سوئیں، جاگیں۔ کمرے کے اندر ہی سگریٹ سلگائے کریں۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی۔"
شاہد کریم نے کہا۔ "یار اشعر! تم دونوں ابھی کچھ دیر آرام کرو۔ میں شام کو آؤں گا۔ کریم آباد کی طرف جائیں گے۔"
اشعر بولا۔ "واپسی میں بوتل ضرور لے کر آنا۔ آج شب کو آزادی کی پہلی رات کا خوب جشن منائیں گے۔"
☆☆☆
دو راتیں اس ہوٹل میں گزار کر وہ گوجال کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ علاقہ پاکستان اور چین کے بارڈر کے قریب ہنزہ کی بالائی آبادیوں پر مشتمل ہے۔ عطا آباد جھیل، گلیشیئرز اور پھر خنجراب ٹاپ جیسا مشہور سیاحتی مقام یہیں واقع ہے۔
ان کی گاڑی جوں جوں شاہراہ ریشم پر آگے بڑھ رہی تھی، انشین کا دماغ اتنی ہی تیزی سے علی آباد میں گزاری [illegible] سوچ رہا تھا۔ ان گزری راتوں [illegible] نے اس کی زندگی کو نئے پہلوؤں سے آشنا کرا دیا تھا۔
مرد اور عورت کو خالقِ کائنات نے ایک دوسرے کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کی بناوٹ میں فرق بھی ہے۔ ایک دوسرے کے لیے بے انتہا کشش بھی۔ آج کی نوجوان نسل موبائل اور انٹرنیٹ کی وجہ سے بہت باخبر ہو گئی ہے۔ انشین بھی گزری راتوں میں ان نئے ذائقوں سے آشنا ہو گئی تھی۔ اس کے دل میں کہیں دور دور تک کوئی ملال یا پچھتاوا نہیں تھا۔ ایک سال تک اشعر نے بھی ان لطف آگیں وادیوں میں گھمایا تھا۔ ان راتوں میں وہ اس قدر سیر کرتی رہی تھی کہ بدن تھک کر چور چور ہو گیا تھا۔
عطا آباد جھیل اور اس کے طلسماتی ماحول کے پہلو بہ پہلو تقریباً سات کلو میٹر طویل سرنگوں میں سے گزر کر وہ گوجال وادی میں داخل ہوئے۔ مزید ایک گھنٹا سفر کر کے وہ سوست پہنچ گئے۔ سوست میں ایک گیسٹ ہاؤس میں شاہد کریم

نے کمرے کی بکنگ کرائی تھی۔
نگر میں وہ دو راتیں گزار کر علی آباد میں ایک ہی کمرے میں آئے تھے۔ گیسٹ ہاؤس میں الگ الگ کمرے لینے کی کسی نے بات نہیں کی۔ ایک خاموش سمجھوتے کے تحت ان دونوں نے ایک ہی کمرے میں رہنا پسند کیا۔ شاہد کریم نے اپنے لیے الگ بندوبست کر لیا تھا۔
لاہور سے روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے سات دنوں کا یہ تفریحی ٹور مقرر کیا تھا۔ یہ سات دن گزر گئے تھے۔ وہ دونوں اس فطری ماحول اور قدرتی جمال سے اس حد تک متاثر ہوئے تھے کہ واپس جانے کا ایک بار بھی ذکر نہیں کیا تھا۔
گیسٹ ہاؤس میں ان کا تیسرا روز تھا۔ صبح ناشتے کے بعد اشعر نے کہا۔ "انشین! میری جیب میں نقد روپے ختم ہو گئے ہیں۔ یہاں سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر سوست بازار ہے۔ یہ چین اور پاکستان کے درمیان تجارتی مرکز ہے۔ وہاں بہت سے بینک بھی ہیں۔ میں وہاں جا کے اے ٹی ایم سے پیسے نکال کے آتا ہوں۔ شاہد کریم میرے ساتھ جائے گا۔"
"سوست بازار کے بارے میں، میں نے بھی بہت سنا ہے۔ اس لیے میں بھی آ جاتی ہوں۔ یہاں اکیلی بیٹھ کر بور ہو جاؤں گی۔"
"تم مفت میں تھک جاؤ گی۔ میں واپس آؤں گا تو پورا دن جھیل جائیں گے۔ یہ جھیل یہاں قریب ہی ایک پہاڑی کے دامن میں ہے۔ [illegible] سوست بازار تک جائیں گے۔ پھر وہاں سے گزر کر خنجراب بارڈر تک ہو آئیں گے۔"
اشعر اور شاہد کریم کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کی [illegible] انشین [illegible] گیسٹ ہاؤس میں [illegible] ہاؤس کے لان میں بیٹھی رہی۔ وہاں [illegible] غیر ملکی سیاح بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ اسے خوف محسوس ہوا کہ ان میں سے کوئی اس کی جان پہچان کا نہ ہو۔ پھر مفت میں اشعر اور اس کے تعلق کی بہت سی گرہیں کھل جائیں گی۔
وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہاں کیبل کے ذریعے ٹی وی چلتا تھا۔ وہ ٹی وی کھول کے بیٹھ گئی۔
دوپہر کے وقت اشعر واپس آیا۔ اس کا چہرہ اترا اترا سا تھا۔ کمرے میں ایک کرسی پر دھپ سے بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کے سلگایا۔ خاموشی سے گہرے گہرے کش لینے لگا۔
انشین چند ثانیے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔ "اشعر! خیریت ہے نا؟ کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔"
اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "نہیں۔ کچھ نہیں ہوا ہے۔ بس سر درد کر رہا ہے۔"
وہ اس کے قریب گئی۔ اپنی انگلیوں سے اس کا سر دباتے ہوئے بولی۔ "سر درد ہو رہا ہے تو سگریٹ کیوں پی رہے ہو؟ میرے بیگ میں پیناڈول ہے۔ دو گولیاں کھا لو۔"
وہ کرسی سے اٹھا۔ کمرے کی کھڑکی کے پاس جا کے اس میں سے باہر دیکھنے لگا۔ وہاں سے دور بلند و بالا پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی چوٹیوں پر برف چمک رہی تھی۔
وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ "انشین! میرا سر جس وجہ سے درد کر رہا ہے۔ پیناڈول سے ٹھیک نہیں ہو گا۔ یہ کسی اور پریشانی سے درد کر رہا ہے۔"
"کیسی پریشانی؟ مجھے بھی کچھ بتاؤ نا۔"
وہ کھڑکی کے پاس سے پلٹ کر بولا۔ "میرے پاس پیسے ختم ہو گئے ہیں۔ اے ٹی ایم سے دس ہزار روپے نکالے تو بیلنس رسید دیکھ کر پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ میرے اکاؤنٹ میں کل پانچ ہزار روپے باقی بچے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کل پندرہ ہزار روپے موجود ہیں۔ ابھی ہم نے گیسٹ ہاؤس کا بل بھی ادا نہیں کیا ہے۔ کھانے اور رہائش کا بل پندرہ ہزار سے زیادہ ہی ہو گا۔ جبکہ ہمیں اتنا طویل سفر طے کر کے لاہور بھی واپس جانا ہے۔"
انشین کو بھی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ چند ثانیے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔ "یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے۔ پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ کسی سے ادھار مل جائے گا؟"
"[illegible] کوئی تدبیر کر لیتا ہوں۔"
"تم پریشان [illegible]"
[illegible] انتظام ہو جائے گا۔"
مجھے امید ہے [illegible]
وہ بولی۔ "تم پورا دن جھیل جانے کی بات کر رہے تھے۔ کیا اب یہ پروگرام کینسل سمجھوں؟"
"اس جھیل تک جانے کے لیے خصوصی جیپ بک کی جاتی ہے جس کا کرایہ تین ہزار روپے ہے۔ ایسی صورت میں یہ ایک اضافی خرچہ ہو گا۔ اس لیے میں پہلے کہیں سے روپوں کا بندوبست کر لیتا ہوں پھر یہاں کے مشہور مقامات کی سیر کریں گے۔"
وہ باہر چلا گیا۔ انشین سر جھکا کے متفکر بیٹھی رہی۔ پریشانی دور کرنے کے لیے اس نے بھی سگریٹ سلگایا اور ہلکے ہلکے کش لیتی ہوئی اس مسئلے کے بارے میں

ہوتی ہیں۔ تمہاری طرح شراب اور چرس کی عادی ہوتی ہیں۔ بغیر کسی جائز رشتے کے صرف دوستی کے نام پر کسی نوجوان کے ساتھ اتنی دور آنے والی لڑکیاں معصوم نہیں کہلاتی ہیں۔ ان کا حشر یہی ہوتا ہے۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "میں مانتی ہوں کہ میں گناہ گار ہوں۔ اس شیطان پر بھروسا کر کے بہت بڑی نادانی کی ہے پھر بھی میں آخری بار ایک کوشش کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے قدموں میں گر کر اس عذاب سے خود کو نکالنا چاہتی ہوں۔"

"اب ایسا ممکن نہیں۔ وہ پکا شیطان ہے۔ پہلے بھی لڑکیاں روتی دھوتی اور فریاد کرتی رہی ہیں مگر اس کے پتھر دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اب تو اس نے مرغا بھی پھانس لیا ہے۔ تم جب تک تین چار دن اس کی مرضی کے مطابق چند تجوری اسامیوں کے ساتھ رنگین لمحات نہیں گزارو گی، وہ تمہیں چھوڑنے والا نہیں۔"

اس کے پاس مزید کچھ سننے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کی پلیٹ میں ناشتا اسی طرح دھرا ہوا تھا۔ اس نے بس آدھی پیالی چائے پی تھی۔۔۔ وہ اٹھی۔ شدید پریشانی اور دکھ سے ڈگمگاتے قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں آئی۔ بیڈ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اس مصیبت سے نکلنے کی دعائیں مانگتی رہی۔

دوپہر کے قریب اشعر کمرے میں آیا۔ اس کے مکروہ چہرے سے جہاں بھر کی خباثت ٹپک رہی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگا کے اس کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔

اشعر چند ثانیے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک ذرا ملامت سے بولا۔ "افشین! تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ شاہد بتا رہا تھا تم نے ناشتا بھی ڈھنگ سے نہیں کیا۔ چلو اٹھو۔ ہاتھ منہ دھو کے میرے ساتھ باہر نکلو۔ اکٹھے لنچ کریں گے۔"

اس نے اپنی بھری بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک سسکی منہ سے خارج کر کے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میری بھوک کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ پر اگر ترس کھاتے ہو تو اپنے ناپاک ارادے سے باز آجاؤ۔ مجھے آزاد کر دو۔"

وہ بے رحمی سے بولا۔ "تم ابھی تک اسی ایک بات کی رٹ لگائے بیٹھی ہو۔ میں نے بتا دیا ہے کہ اب یہ فیصلہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھو تمہارے آنسو مجھ پر کوئی اثر نہیں کرنے والے۔"

وہ نفرت سے بولی۔ "تم ایک شیطان ہو۔ مجھ لاچار کی فریاد تم پر بے اثر ہے مگر اللہ ضرور سنے گا۔ تم اس کی گرفت سے بچ نہیں سکو گے۔"

وہ گرج کر بولا۔ "بکو مت! اب یہ آنسو بہانا بند کرو۔ اپنی حالت درست کرو۔ آج شام کو ایک خاص مہمان آنے والا ہے۔ بہت پیسے والا ہے۔ تم اسے خوش کر دو تو چند گھنٹوں کے عوض تمہیں مالا مال کر دے گا۔"

وہ چلا کر بولی۔ "میں اپنی جان دے دوں گی، تمہارے گندے عزائم کامیاب ہونے نہیں دوں گی۔"

اشعر غصے سے ایک دم کھڑا ہوا۔ جھپٹ کر اسے بالوں سے پکڑ کر بیڈ سے نیچے گھسیٹا اور اسے فرش پر گرا کے اس کے گالوں پر زور زور سے طمانچے مارنے لگا۔ ساتھ ہی گرجتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔ خود سوچو ایک تصویر بھی وائرل ہو گئی تو تمہارے خاندان کی عزت کا جنازہ کتنی دھوم دھام سے نکلے گا۔"

یہ کہہ کر وہ ہنستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے باہر سے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔

افشین بڑی دیر سسکتی ہوئی سوچوں کے ساتھ فرش پر پڑی رہی۔ وہ سمجھ گئی تھی، اس کی فریادیں اور اس کے آنسو اشعر کو اس کے شیطانی منصوبے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اسے عملاً کچھ کرنا تھا۔

وہ درد سہتی ہوئی سوچنے لگی کہ کس طرح اشعر کی دسترس سے خود کو آزاد کرائے۔ اس نے جاتے جاتے بتایا تھا کہ شام کو خاص مہمان آنے والا ہے۔ اسے خوش کرنا ہے۔ انکار کی صورت میں تصویریں اور ویڈیوز وائرل کرنے کی دھمکی دی تھی۔

وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی۔ آخر ایک بات وہ سمجھ گئی تھی کہ اشعر سے دور بھاگ کر امان نہیں مل سکتی کیونکہ اس کی کمزوری اشعر کے پاس تھی۔ یہ بھی اس کے بس کی بات نہیں تھا کہ ہوس کے پجاریوں کو اپنے جسم سے کھیلنے کی اجازت دے دے۔

اس نے بڑی دیر سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنی جان دے دے گی مگر اس طرح کہ اس کی لاش کسی کو نہ مل سکے گی۔ اس نے تین چار دنوں میں گیسٹ ہاؤس اور آس پاس کی جگہوں کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ گیسٹ ہاؤس سے ذرا فاصلے پر نشیب کی طرف دریا بہتا تھا۔ گرمیوں کا دریا خوب چڑھا ہوا تھا۔ اس کی لہروں کا شور گیسٹ ہاؤس تک سنائی دیتا تھا۔ اس نے اس دریا میں کود کر غرق ہونے کا عہد

کر لیا تھا۔

☆☆☆

شام کو اشعر کمرا کھول کے اندر آیا۔ وہ اپنا حلیہ درست کیے چہرے پر سکون کے تاثرات سجا کے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اشعر اسے نارمل حالت میں دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے گالوں پر ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھے! اب تم سمجھ گئی ہو۔"

تب وہ چبا چبا کر لہجے میں بولی۔ "تم نے مجھے جس دلدل میں دھکیلا ہے، اس سے نکلنا ممکن نہیں رہا۔ اس لیے مجبوراً تمہاری بات مان رہی ہوں۔ تم بھی وعدہ کرو بعد میں ساری تصویریں اور ویڈیوز ڈیلیٹ کر دو گے۔"

"اوہ ڈارلنگ! تم اس کی فکر مت کرو۔ میں تمہارے سامنے سب ڈیلیٹ کر دوں گا۔ بس تم تازہ دم ہو کر مہمان کا استقبال کرو۔ اپنے حسن اور جسم کی بجلیاں گرا کر اسے اتنا دیوانہ بنا دو کہ اپنی دولت کا منہ کھول دے۔"

اس کا دل اندر سے رو رہا تھا۔ اشعر کی بازاری باتوں سے تن بدن میں مزید آگ لگ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ مصلحت کا تقاضا تھا، وہ خود کو نارمل ظاہر کر رہی تھی۔ [illegible] اشعر [illegible] رات کے وقت جب وہ عیاش تاجر کمرے میں آئے گا، اس وقت اشعر مطمئن ہو کر کہیں دور ہو جائے۔ اس طرح اسے منصوبے پر عمل کرنے کا موقع مل جاتا۔

اشعر کچھ دیر بیٹھ کر باہر چلا گیا۔ بہت دیر بعد واپس آیا۔ اس نے کہا۔ "افشین! پروگرام تھوڑا سا تبدیل ہوا ہے۔ وہ مہمان یہاں نہیں آرہا۔ ہم اس کے پاس جا رہے ہیں۔ تم تیار ہو جاؤ۔ شاہد کریم گاڑی لے کر باہر موجود ہے۔ ہم ابھی دوسرے ہوٹل کی طرف چلے چلتے ہیں۔"

وہ خاموشی سے کسی روبوٹ کی طرح اس کا حکم بجا لائی۔ اپنی ضروری چیزیں سمیٹ کر ہینڈ بیگ میں ٹھونس لیں۔ کوئی ایسی چیز اس کمرے میں رہنے نہیں دی جس سے بعد میں اس کی پہچان ہو جاتی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اشعر کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔ رات کے تقریباً نو بج رہے تھے۔ شاہد کریم پارکنگ میں گاڑی لیے منتظر تھا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اسے صرف ایک بات کی فکر تھی کہ جس ہوٹل کی طرف جا رہی تھی وہ دریا سے زیادہ دور نہ ہو۔

دس منٹ میں وہ اس ہوٹل میں پہنچ گئے۔ یہ ہوٹل شاہراہ ریشم کے ساتھ ہی تھا۔ دریا بھی شاہراہ کے ساتھ ہی نشیب میں بہتا تھا۔ اس لیے وہ مطمئن ہو کر ہوٹل میں داخل ہو گئی۔ وہ دونوں اسے لے کر ایک کمرے میں آ گئے۔

اشعر شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم یہاں انتظار کرو۔ مہمان بس آنے والا ہے۔ خبردار! اسے کسی قسم کی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ ہم دونوں اسی ہوٹل میں موجود ہیں۔"

"فکر مت کرو۔ وہ زندگی بھر میری قربت یاد رکھے گا۔" وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔

وہ دونوں اسے چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ ذرا دیر بعد چالیس پینتالیس سال کا ایک شخص جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے سر کے بال آدھے سے زیادہ صاف تھے۔ جسم فربہ تھا۔ جیسے چہرے کی چمک سے اس کی خباثت اور امارت ٹپکتی تھی۔ وہ شخص مسکراتا ہوا قریب آیا۔ افشین ایک طرف کرسی پر پورے اعتماد سے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ شخص اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ کرسی بہت زور سے چرچرائی تھی۔

وہ شخص چند ثانیے جھجکتا ہوا سا اسے دیکھتا رہا۔ اس کی نظر افشین کے چہرے پر جمی رہی۔ پھر وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تمہارے بارے میں بتایا تھا بہت خوب صورت ہو۔ تم واقعی بہت حسین ہو۔"

کسی اور موقع پر شاید وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو جاتی۔ اس وقت تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

وہ طنز سے بولی۔ "جس نیت سے آپ کمرے میں آئے ہیں، وہ ہر جوان لڑکی حسین ہی لگے گی۔ دعا یہاں کریں، منافقت نہ کریں۔"

وہ کھسیانا سا ہو کر بولا۔ "اوہو! بہت بولتی ہو۔ حسین لوگ زبان کے بجائے جوان بدن سے ہی بجلیاں گراتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔ اس کے باوجود تمہاری بات مجھے بری نہیں لگی۔"

اس نے دکھ سے کہا۔ "تم جیسے لوگ اپنی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر کسی مجبور لڑکی کی جوانی کو شیرینی کے دام روندتے ہو۔ کبھی سوچا بھی ہے ایسا تمہاری بہو بیٹیوں کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے؟"

وہ شخص ناگواری سے بولا۔ "اے لڑکی! کچھ حد سے زیادہ بول رہی ہو۔ ہماری بہو بیٹیوں کا ذکر اپنی بازاری زبان سے مت لاؤ۔ وہ اپنے گھروں میں ہیں۔ تمہاری طرح بدن کی تجارت پر دوسرے مردوں کو نہیں بلاتی ہیں۔"

وہ زہر خند لہجے میں ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔

"میرے لیے کام کرنے والوں نے خدا جانے آپ کو میرے بارے میں کیا کیا نہ کہا ہوگا۔ اسی لیے آپ مجھے جسم فروش سمجھ رہے ہیں۔ آپ کا بھی قصور نہیں۔ یہ قسمت کا ہی پھیر ہے۔ مجھے اپنی بقا کے لیے آپ جیسے مردوں کو اپنی تنہائی میں برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔"

وہ شخص انگڑائی لے کر بولا۔ "چھوڑو ان باتوں کو۔ ہر دھندا کرنے والی اسی طرح اپنی مجبوریوں کی دہائی دیتی ہے۔ تم بھی ایسی تلخ باتیں کر کے کیوں دل کھٹا کرتی ہو؟ اپنے حسن اور جوانی کے سمندر سے میری پیاس بجھاؤ۔ لطافت پی لینے دو۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں اس طرح پیاس بجھاؤں گی کہ کبھی اس کی طلب نہ رہے گی۔ مجھے ایک منٹ دیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں کمرے سے باہر جا کے ذرا گہری گہری سانسیں لے کر آتی ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "جاؤ، چلی جاؤ۔ کھلی فضا میں تازہ دم ہو کر آ جاؤ۔ واپس آ کے اپنے جسم کی وادیوں میں مجھے گھما گھما کے بےدم کر دو۔"

وہ ہونٹ چباتے ہوئے [illegible] کے دروازے کے پاس گئی۔ اسے ذرا سا کھول کے باہر آ گئی۔ سامنے ایک طویل برآمدہ تھا جو اس وقت ویران تھا۔ دوسری طرف وسیع و عریض سبزہ زار تھا۔ رات کے اس پہر اس سبزہ زار پر دو چار مرد اور عورتیں دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے اچھی طرح دیکھا۔ اسے کہیں بھی اشعر یا شاہد کریم دکھائی نہیں دیے۔ وہ واپس کمرے میں آئی۔

اس شخص نے کہا۔ "تم کچھ پریشان سی لگتی ہو۔ مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے؟"

وہ بجھے بجھے دل سے بولی۔ "چوہدری صاحب! پھر آپ کہیں گے ہر دھندا کرنے والی لڑکی اپنی پریشانیاں بیان کرتی ہے۔ میں آپ کا موڈ خراب نہیں کروں گی۔ آپ منہ دوسری طرف کریں میں کپڑے چینج کرتی ہوں۔"

وہ شخص منہ بگاڑ کے ہنستے ہوئے بولا۔ "کپڑے باتھ روم میں بھی تبدیل کر سکتی تھیں مگر میری پیاس بھڑکانے کا یہ اچھا انداز ہے۔ تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔ میں منہ دوسری طرف کرتا ہوں۔"

انشین اس کی پشت کی طرف سے بیڈ کے پاس آئی۔ چادر کے نیچے ہاتھ ڈال کے ایک انچ موٹے سریے کا تین چار فٹ لمبا ٹکڑا باہر نکالا۔ سریے کا یہ ٹکڑا اسے گیسٹ ہاؤس کے باتھ روم میں ملا تھا۔ جانے کس شخص نے کس مقصد کے لیے وہاں رکھا تھا۔ اس وقت انشین کے کام آ رہا تھا۔ اس نے اس ٹکڑے کو اپنے کپڑوں میں چھپا لیا تھا۔ پھر اس نے اشعر سے آنکھ بچا کے بیڈ کے فوم کے نیچے رکھ دیا تھا۔

سریا ہاتھ میں اٹھا کے وہ مڑی۔ دو قدم چل کے اس شخص کی پشت پر آئی۔ وہ جذبوں کی شدت سے بار بار انگڑائیاں لیتے ہوئے دوسری طرف رخ کیے بیٹھا تھا۔

اس نے سریا مضبوطی سے پکڑا۔ اسے آہستہ آہستہ بلند کیا۔ پھر ہونٹ بھینچ کر پوری طاقت سے اس شخص کے سر پر دے مارا۔ ایک گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ وہ شخص آگے کو جھکا۔ انشین نے دوسری دفعہ بھی زور سے سریے کی ضرب لگائی۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح منہ سے آوازیں نکالتا کرسی سے لڑھک کر فرش پر گر پڑا۔

انشین چند ثانیے اس کی طرف غور سے دیکھتی رہی۔ وہ شخص بےدم ہو کر فرش پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا بیگ اٹھایا۔ آخری بار ایک طائرانہ نظر پورے کمرے پر ڈالی۔ اس کی شناخت کی کوئی چیز وہاں نہیں تھی۔ مطمئن ہونے کے بعد وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلی۔

برآمدہ ویران تھا۔ [illegible] مدھم روشنی میں چند مسافر یہاں وہاں اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ وہ برآمدے سے ہو کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ رات کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ طویل برآمدے کے آخر میں نیچے کی طرف سیڑھیاں تھیں۔ اس سے آگے ذرا سے کھلے صحن کے بعد بیرونی گیٹ موجود تھا۔

وہ سیڑھیوں کے پاس آئی۔ اچانک اپنے پیچھے ذرا فاصلے پر کسی دروازے کے کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے اضطراری طور پر پلٹ کر دیکھا۔ یکبارگی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ تقریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر شاہد کریم برآمدے میں کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کی حیرت نہیں پڑھ سکی تھی مگر اس کے منہ سے نکلنے والی حیرت آمیز آواز اس نے سنی۔ وہ چلا کے اس کا نام لے کے پکار رہا تھا۔

انشین کے پاس اب رکنے کی گنجائش بالکل نہیں تھی۔ وہ جھٹکے سے مڑی اور دوڑتی ہوئی سیڑھیاں اترتی ہوئی بیرونی گیٹ کی طرف بڑھی۔ آخری لمحوں میں اس نے دیکھا کہ شاہد کریم وہاں سے پلٹ کر واردات والے کمرے کی طرف تیز تیز جا رہا تھا۔

انشین گیٹ کے پاس آئی۔ اسی وقت دو افراد گیٹ کھول کر اندر آئے۔ انشین کو تیزی سے باہر نکلتے دیکھ کر ایک ذرا ٹھٹک سے گئے۔ لیکن انشین ٹھہری نہیں۔ ان سے ٹکرا کر گیٹ سے باہر نکل گئی۔

گیسٹ ہاؤس کے گیٹ کے باہر ایک ڈھلوانی راستہ تھا جو نیچے جا کر شاہراہ اور پھر نیچے سے مل جاتا تھا۔ انشین تقریباً دوڑتی ہوئی اسی ڈھلوانی راستے پر تیز تیز دوڑنے لگی۔ وہ شاہراہ پر آئی تو اپنے پیچھے اسے آوازوں کا شور سنائی دیا۔ دوڑتے بھاگتے قدموں کی چاپ بھی کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ہوٹل کے مین گیٹ پر موجود لائٹس کی روشنی ڈھلوانی راستے پر بکھری ہوئی تھی۔ اس ملگجی روشن راستے پر اسے دو شخص دوڑتے ہوئے اس طرف آتے دکھائی دیے۔ وہ سمجھ گئی کہ آنے والے یقیناً اشعر اور شاہد کریم ہوں گے۔ واردات والے کمرے میں جا کر صورت حال جان کے وہ اس کے تعاقب میں لگ گئے ہوں گے۔

وہ جھٹکے سے مڑی۔ بہت تیزی سے شاہراہ پر ایک طرف دوڑنے لگی۔ اس نے دن کے وقت دیکھا تھا شاہراہ نشیب کی طرف کھائی تھی جس کے آخر میں دریا بہتا تھا۔ وہ تیزی سے سڑک پر دوڑتے ہوئے اس ٹیلے کی طرف جانے لگی جہاں سے نیچے دریا کی طرف چھوٹا سا راستہ جاتا تھا۔ اس نے آدھا فاصلہ طے کیا تھا کہ وہ دونوں شاہراہ پر آ نکلے۔ اسے گالیاں دیتے ہوئے رکنے کا حکم دینے لگے۔

انشین کے لیے آگے موت تھی، پیچھے رسوائی تھی۔ اس نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ موت کا راستہ چن لیا تھا۔ اب اس کے پاس رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

شاہراہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اکا دکا گاڑیاں تیزی سے روشنیاں بکھیرتی ہوئی آگے پیچھے گزر رہی تھیں۔ انشین اندھا دھند اس ٹیلے کی طرف بھاگ رہی تھی۔ دل میں اضطراب تھا۔ پکڑے جانے کا خوف تھا مگر دریا کی پناہ میں جانے کی ایسی دھن سوار تھی کہ وہ اندھیری پگڈنڈی پہ جنون کے عالم میں دوڑ رہی تھی۔

وہ ٹیلے کے پاس پہنچ گئی۔ سڑک کی دوسری سمت دریا کو راستہ جاتا تھا۔ وہ تیزی سے سڑک پار کرنے لگی۔ پچیس تیس فٹ کی سڑک کے درمیان میں آئی تھی کہ اچانک ہی ٹیلے کے پیچھے سے ایک تیز رفتار گاڑی نمودار ہوئی۔ اس کی تیز روشنی نے ایک لمحے کو انشین کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ وہ ایک طرف ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ دوسری طرف ٹیلے کی اوٹ سے گاڑی یوں اچانک سامنے آئی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکی۔

یہ لمحوں کا کھیل تھا۔ ایک دم سامنے آنے والی گاڑی سے خود کو بچانے کے لیے اس کے پاس وقت بالکل نہیں تھا مگر اصل کھیل تو مقدر کا ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ انشین زندگی کی بازی گاڑی کے نیچے آ کر ہار جائے گی۔ اس نے اپنا داؤ کھیلا۔ گاڑی کے ڈرائیور نے اضطراری طور پر بریک لگائے۔ تارکول کی ہموار سطح پر اس کے ٹائر بہت زور سے رگڑ کھاتے ہوئے رک گئے۔ اسی دوران انشین گاڑی کے بونٹ سے بہت زور سے ٹکرائی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پہیوں کے نیچے آ کر کچلی جاتی۔ مگر چونکہ قسمت میں کچھ اور لکھا ہوا تھا۔ وہ گاڑی کے سامنے کے حصے سے ٹکرا کر جھٹکا کھا کر بہت زور سے اڑتی ہوئی سڑک کے کنارے پر دھپ سے گر گئی۔ گاڑی میں سے کچھ لوگ تیزی سے نیچے اترے۔ وہ لپک جھپک انشین کی طرف بڑھے۔ اس کے حواس ابھی بیدار تھے۔ اس نے سنا۔ ایک شخص اس کے قریب آ کر حیرت بھری آواز میں چلا کے کہہ رہا تھا۔ "اف مائی گاڈ! انشین یہ تم ہو؟"

اتنی سی بات وہ سن سکی۔ پھر اس کے حواس گم ہو گئے۔ رات کی اندھی تاریکی میں اس کا دماغ بھی ڈوب گیا۔

☆☆☆

اس کا دماغ آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ سر بہت بھاری لگ رہا تھا۔ شدید درد کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ وہ کسی اسپتال کے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے وارڈ میں وہ اکیلا ہی بیڈ تھا۔ ایک نرس اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ چونکتی ہوئی اٹھی۔ لپک کر اس کے پاس آئی۔

"تم ہوش میں آ گئیں۔ اب کیا محسوس کر رہی ہو؟"

وہ دھیرے سے بولی۔ "میں ٹھیک ہوں۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ میں یہاں کیسے آ گئی؟"

نرس نے نرم لہجے میں کہا۔ "تم اس وقت ہنزہ کے اسپتال میں ہو۔ تمہیں لانے والے وارڈ کے باہر موجود ہیں۔ میں انھیں بلاتی ہوں۔"

وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ انشین گزرے لمحوں کی ہولناک یادوں کی شدت سہتی ہوئی دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم ٹھٹک گئی۔ وارڈ کے دروازے سے شوکت علی سیلانی صاحب اندر داخل ہو رہے تھے۔ انشین حیرت اور مسرت سے انھیں دیکھنے لگی۔

سیلانی صاحب قریب آ کر شفقت سے بولے۔ "اللہ

"شکر ہے تم ہوش میں آ گئیں۔ اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟"
وہ بھری بھری آواز میں بولی۔ "میں ٹھیک ہوں۔ مجھے اسپتال آپ لے کر آئے تھے؟"
"جی ہاں۔ تم ہوٹل کے پاس ہماری کوسٹر سے ٹکرا گئی تھیں۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ بال بال بچ گئیں۔"
وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میری قسمت ہی تو اچھی نہیں سیلانی صاحب! زندگی سے مایوس ہو کر مرنا چاہتی تھی۔ اس سے بھی محروم رہی۔"
سیلانی صاحب نے چونکتے ہوئے کہا۔ "تم ایسا کیوں سوچ رہی تھیں؟ تمہارا دوست اشعر کہاں ہے؟"
اس کے جواب دینے سے پہلے ڈاکٹر اور نرس اندر آ گئے۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا۔ اس کے سر پر ہلکی سی چوٹ آئی تھی۔ سارا جسم جگہ جگہ سے چھلا ہوا تھا۔ ٹانگ پر بھی سخت چوٹ آئی تھی مگر ہڈی سلامت تھی۔
ڈاکٹر کی ہدایت پر نرس نے اسے سکون کا انجکشن لگایا۔ اس کے زخموں پر کچھ مرہم لگایا۔ اس سے زخموں کا درد بہت کم ہوا۔
ڈاکٹر اور نرس باہر چلے گئے۔ سیلانی صاحب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "مجھ کو گلگت پہنچنا ہے، تم اس اشعر کے ساتھ اکیلی ہنزہ کی طرف چلی گئیں تو مجھے اندیشہ تھا تمہارے ساتھ کچھ برا ہونے والا ہے۔ کیونکہ وہ کم بخت اشعر مجھے کسی اچھے کردار کا نوجوان نہیں لگتا تھا۔ اب تم بتاؤ، تم کن حالات سے گزر رہی ہو؟ خودکشی کی کوشش کیوں کی تھی؟"
وہ شکستہ سے لہجے میں بولی۔ "سر! مجھ سے گزرے حالات کے بارے میں مت پوچھیں۔ میرے پاس دکھوں اور رسوائیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔"
"مجھ پر بھروسا کرو بیٹی! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے بتاؤ، ہو سکتا ہے اس میں خیر کا پہلو نکلے۔"
وہ سسک کر رو پڑی۔ "میں دلدل میں دھنس چکی ہوں سیلانی صاحب! اشعر نے میری زندگی عذاب بنا دی ہے۔ میری اپنی نادانیوں کی وجہ سے مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔ مجھے عیاش دولت مندوں کے آگے پیش کر کے پیسے کمانا چاہتا ہے۔۔۔"
اس نے روتے روتے اشعر کی شیطانی حرکتوں کے بارے میں ساری تفصیل بتا دی۔ شوکت صاحب اس کی باتیں سن کر بڑی دیر گہری نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر افسوس سے بولے۔
"وہ کم بخت اشعر اس حد تک گر گیا؟ ایسی حرکت کر سکتا ہے مجھے یقین نہیں ہو رہا۔ تم نے نادانی کی کہ اس پر بھروسا کر لیا۔ اب مجھ پر بھی بھروسا کر لو۔ اس شیطان کے شکنجے سے تمہیں نجات دلا دوں گا۔"
اس نے پوچھا۔ "سر! آپ کا ٹور تو تین دن پہلے ختم ہونے والا تھا۔ کیا آپ لوگ واپس نہیں گئے تھے؟"
"تم جس گروپ کی بات کر رہی ہو اس کا ٹور واقعی تین دن پہلے ختم ہو گیا تھا۔ ہم واپسی کے لیے گلگت پہنچے تھے کہ لاہور سے دوسرا گروپ پہنچ گیا۔ پہلے والے گروپ کو اپنی بیگم کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ کیا اور نئے گروپ کے ساتھ ادھر آ گیا۔ آج بورتھ جھیل سے واپس آ رہے تھے کہ تم اچانک ہماری کوسٹر کے سامنے آ گئی تھیں۔"
"سر! میں بہت پریشان ہوں۔ اشعر کے پاس میری نادانی کے بہت سے ثبوت ہیں۔ وہ مجھ سے ضرور انتقام لے گا۔"
"تم اس کی فکر مت کرو۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ میں ابھی اس کے خلاف ایکشن شروع کراتا ہوں۔ گلگت میں اس وقت جو ایس ایس پی موجود ہے ان کا تعلق لاہور سے ہے۔ میرے بڑے صاحب زادے کے کلاس فیلو ہیں۔ گلگت میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں ابھی ان کو فون کرتا ہوں۔ اشعر جیسے بدکار نوجوان کو سبق سکھانا وہ خوب جانتے ہیں۔"

☆☆☆

اس کے بعد بہت تیزی سے ایسے واقعات رونما ہوئے... کہ اشعر اپنی سیاہ کاریوں کی وجہ سے قانون کے شکنجے میں کستا چلا گیا۔
شوکت علی سیلانی صاحب نے ایس ایس پی گلگت سہیل شیرازی سے رابطہ کر کے ساری تفصیل بتا دی۔ انہوں نے اشعر کی تصویر مانگی تو افشین کے موبائل میں موجود اس کی متعدد تصاویر واٹس ایپ کر دیں۔
سہیل شیرازی صاحب نے فوراً گوجال سے گلگت تک ساری پولیس فورس کو متحرک کر دیا۔ تمام پولیس اسٹیشنوں میں اشعر کی تصاویر بھیج دیں۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اسے گرفتار کرنے کی سخت ہدایات دے دیں۔
دوسری طرف اشعر اس وقت کنفیوز ہو گیا تھا کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔ جب افشین عیاش تاجر سے بچ کر بھاگ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ کوسٹر سے ٹکرا گئی تب اشعر اور

شاہد کریم تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھے۔ تصادم اتنا شدید تھا کہ پچاس گز کی دوری سے ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ شاید وہ اس تصادم سے جانبر نہیں ہو سکے گی۔
اشعر کوسٹر کے قریب نہیں گیا۔ شاہد کریم کو آگے بھیج دیا۔ ذرا دیر بعد پتا چلا کہ افشین کی جان بچ گئی تھی۔ اسے معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ اس لیے ہنزہ کے بڑے اسپتال لے جایا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کوسٹر میں شوکت علی سیلانی کا ٹورسٹ گروپ تھا۔ یہ جان کر اس کے دل میں پہلی مرتبہ گھبراہٹ طاری ہوئی تھی۔ اسے اندیشہ ہوا تھا کہ افشین ہوش میں آ کر اس کی شیطانی حرکتوں کے بارے میں سیلانی صاحب کو بتا دے گی۔
اب اسے عدم تحفظ کا شدید احساس ہونے لگا۔ اس نے شاہد کریم سے مشورہ کیا۔ راتوں رات گوجال سے گلگت کی طرف روانہ ہوا۔ شاہد کریم اسے ہنزہ تک اپنی کار میں لے آیا۔ وہاں سے آگے ایک کرائے کی گاڑی میں اسے روانہ کر دیا۔ صبح سے پہلے وہ گلگت پہنچ گیا۔
وہاں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرا لے کر بند ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ شاہد کریم سے مسلسل رابطے میں رہا۔
شاہد کریم بھی خوف زدہ تھا۔ اشعر کے ساتھ وہ بھی لپیٹ میں آ سکتا تھا۔ اس لیے وہ اسپتال کے اندر جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ دور دور سے افشین کی حالت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ بس اتنا جان سکا کہ افشین کی حالت اب بہتر ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ اسے علم نہ ہو سکا کہ سیلانی صاحب نے ایس ایس پی سہیل شیرازی صاحب سے رابطہ کر کے ساری پولیس فورس کو اشعر کے خلاف متحرک کر دیا ہے۔
وہ خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا لیکن دل میں چور بھی تھا۔ وہ دور دور سے جائزہ لیتے ہوئے گلگت میں اشعر کو سب اچھا کی رپورٹ دیتا رہا۔
اسی خوش فہمی میں شام کے وقت اشعر ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلا۔ اس کا ارادہ تھا مارکیٹ سے چند چیزیں خرید کر اسی رات گاڑی بک کر کے لاہور روانہ ہو جائے گا۔
اس کی بدقسمتی تھی کہ ایس ایس پی صاحب کی ہدایت پر گلگت میں بھی پولیس فورس اس کی کھوج میں تھی۔ اس کی تصویر ہر ایک کے موبائل میں موجود تھی۔
ہوٹل سے نکل کر چند قدم چلا تھا کہ پیچھے سے سادہ لباس میں چند جوانوں نے اسے بازوؤں سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ایک نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "ہم پولیس والے ہیں۔ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو۔"
اشعر اتنا اچانک ان کی گرفت میں آ گیا تھا کہ اسے کہیں بھاگ نکلنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔
پولیس نے ہوٹل میں اس کے کمرے پر بھی چھاپا مارا۔ اس کا لیپ ٹاپ بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔ موبائل پہلے ہی انہوں نے اٹھا لیا تھا۔
وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا اب تک اپنی حرکتوں کے بدانجام سے بچتا رہا تھا۔ اس دفعہ بری طرح پھندے میں آ گیا تھا۔ وہ اس سب کا ذمے دار سیلانی صاحب کو سمجھ رہا تھا۔
سہیل شیرازی صاحب نے خود اپنی نگرانی میں اس سے تفتیش کرائی جس کے نتیجے میں اس کے موبائل اور لیپ ٹاپ سے افشین کے علاوہ بہت سی دوسری لڑکیوں کی بھی قابل اعتراض تصاویر اور ویڈیوز سامنے آ گئیں۔ پولیس نے اس پر ایسا تشدد کیا تھا کہ اس نے فرفر بتا دیا کہ وہ ان ساری لڑکیوں کو بلیک میلنگ کے ذریعے اپنے شیطانی مقاصد کے لیے استعمال کر چکا تھا۔ اس کی نشاندہی پر پولیس نے شاہد کریم کو بھی گرفتار کر لیا۔
افشین کو دو دن بعد اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ سیلانی صاحب اپنے گروپ کو چھوڑ کر ان دو دنوں میں اس کے پاس ہی موجود رہے۔ دو دن بعد انہوں نے افشین کو گلگت روانہ کر دیا۔ سہیل شیرازی صاحب نے اسے گلگت سے آگے لاہور تک بحفاظت پہنچانے کا ذمہ لے لیا۔
اگلے دن وہ ایک پولیس گاڑی میں لاہور کی سمت روانہ ہو گئی۔ جوں جوں گلگت سے دور ہوتی جا رہی تھی، اسے ایسا لگ رہا تھا دکھوں اور اذیتوں کے سلسلے اب پیچھے رہ گئے تھے۔ آگے جہاں اس کا گھر تھا، اس کا خاندان تھا۔ لاہور میں اس کی دوست تھیں۔ جہاں اس کی عصمت پر شب خون مارنے کے لیے اشعر جیسا دھوکے باز عاشق نہیں تھا۔
وہ جوں جوں آگے بڑھ رہی تھی، وہ اپنا احتساب کر رہی تھی۔ ملتان سے لاہور تک اس کی زندگی جدت اور جدیدیت کے نام پر جس بے راہ روی کا شکار ہوئی تھی، اب گلگت سے لاہور تک سفر کے دوران وہ دل ہی دل میں اس بے راہ روی سے بچنے کی قسمیں کھا رہی تھی۔ ایک شریف اور باحیا لڑکی کی طرح گھر سے نکلنے اور اسے تک اپنی زندگی محدود رکھنے کا عزم کر رہی تھی۔

xxx

بقعۂ فتور

مرزا امجد بیگ

کرتوت کالے ہوں یا سفید... انجام تو اسے ہی بھگتنا پڑتا ہے جس کے کرتوت ہوتے ہیں۔ اس کا تعلق بھی زندگی کے ایسے ہی شعبے سے تھا جس میں بہت سے لوگوں کے مفاد اور نقصان کا وہی ذمے دار تھا اور اس حوالے سے اس پر انصاف کے ترازو کو توازن سے لے کر چلنے کی دہری ذمے داری عائد تھی لیکن... جب دلوں میں کھوٹ ہو تو کرتوت کالے ہو ہی جاتے ہیں... اور رنگوں کی پہچان بھی اُس وقت ہوتی ہے جب وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

ایمانداری کی چادر اوڑھے چند ضمیر فروشوں کی دیدہ دلیری

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر بھلائی کی نیت سے کوئی برا کام کرلیا جائے تو یہ بھی ایک نیکی ہی ہے۔ میں اس فلسفے سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی کتے کی گردن کو خلوصِ نیت سے کاٹ کر اسے بکری کا درجہ دے دیا جائے اور اس کے گوشت کو پکا کر بھوکوں کی ضیافت کا اہتمام کرکے یہ سمجھ لیا جائے کہ کسی بھوکے کو کھانا کھلانا بہت بڑی نیکی ہے۔ یاد رکھیں، نیکی اور بدی دو الگ افعال ہیں اور درحقیقت ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ سوچ کا نہیں بلکہ دل کا معاملہ ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ وہ فروری انیس سو چھیاسی کی ایک خوشگوار شام تھی۔ موسمِ سرما قریب الرخصت تھا۔ میں حسبِ معمول اپنے آفس میں بیٹھا تھا اور میرے سامنے اس وقت عارف محمود نامی ایک شخص موجود تھا۔ اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وکیل صاحب! مجھے انہوں نے آپ کے پاس بھیجا"

میں نے کارڈ پر نگاہ ڈالی۔ وہ میرے ایک اختر رمضانی کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ اختر رمضانی ایک کمپنی میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ زیادہ ملاقات تو نہیں ہوتی تھی تاہم دوستانہ تعلق خاصا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر عارف محمود کی طرف دیکھا اور ورانہ انداز میں پوچھا۔

"جی عارف صاحب! بتائیں، میں آپ کی خدمت کروں؟"

"رمضانی صاحب نے کہا تھا کہ وہ آج رات یا کل کسی وقت آپ کو فون بھی کریں گے۔" وہ پریشان بھرے لہجے میں بولا۔ "میں بھی اسی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کام کرتا ہوں۔ میں بہت مشکل میں آ گیا ہوں سر..."

وہ "مشکل" کا لفظ نہیں بھی استعمال کرتا تو بھی اس کی ذاتی کیفیت چہرے سے عیاں تھی۔ علاوہ ازیں

حرکات و سکنات سے بھی اضطرار اور اضطراب جھلکتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ رمضانی صاحب سے بھی بات ہوجائے گی۔" میں نے رف پیڈ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے اپنے مسئلے کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔ اس کے بعد ہی میں فیصلہ کر پاؤں گا کہ آپ کی کیا مدد کی جاسکتی ہے۔"

اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ "وکیل صاحب! دراصل مسئلہ میرے بڑے بھائی کا ہے۔"

"اوہ..... اچھا۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے بڑے بھائی کو کیا ہوگیا ہے عارف صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"طارق بھائی کو پولیس نے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے۔" وہ دکھی لہجے میں بولا۔

"طارق نے کس کو قتل کیا ہے؟" میں نے پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے استفسار کیا۔ "میرا مطلب ہے، آپ کے بھائی پر کس کو قتل کرنے کا الزام ہے؟"

"مقتول کا نام غفور شاہ ہے۔" اس نے بتایا۔ "اودھر کوٹ موڑ پر مقتول کا آستانہ ہے..... آستانۂ غفوریہ۔ غفور شاہ کی لاش اسی آستانے کے اندر پڑی ملی ہے۔"

"اوہ..... تو یہ بابا لوگوں کا معاملہ ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا اور پوچھا۔ "آپ کے بھائی طارق محمود سے کیا تعلق تھا اس غفور شاہ کا؟"

"کوئی تعلق نہیں وکیل صاحب!" عارف نے جواب دیا۔ "مجھے لگتا ہے، میرے بھائی کو کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں پھنسایا گیا ہے۔"

"ہاں، یہ ممکن ہے۔" میں نے عارف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن طارق محمود ہی کیوں؟ اگر آپ کے بھائی کو غفور شاہ کے قتل میں ملوث کیا گیا ہے تو اس کا کوئی تو سبب ہوگا نا؟" لمحاتی توقف کرکے میں نے اس سے پوچھا۔ "عارف صاحب! آپ اس ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کس نوعیت کا کام کرتے ہیں۔ یعنی آپ کی پوسٹ کیا ہے؟"

"ٹیلیکس آپریٹر ہوں جناب!" اس نے بتایا۔

فیکس اور ای میل سے پہلے ٹیلیکس اور ٹیلی گرام کا زمانہ تھا۔ اس وقت ٹیلیکس کو پیغام رسانی کا جدید اور تیز ترین ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور ٹیلیکس مشین سو میں سے دو تین آفسز ہی میں دکھائی دیتی تھی۔ انٹرنیٹ، سیل فون اور ٹیکنالوجی نے سائنسی انقلاب برپا کردیا ہے۔

"عارف صاحب!" میں نے متعلقہ انداز میں کہا۔ "ٹیلیکس مشین میں ایک ربن استعمال ہوتا ہے جسے اگر میں غلط نہیں تو..... "لفٹ آف" کہا جاتا ہے۔ کیا اس ربن کے استعمال کے بغیر ٹیلیکس مشین اپنا آپریشن مکمل کرسکتی ہے؟"

"نہیں!" اس نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ "ربن دراصل اس بات کا ریکارڈ ہوتا ہے کہ ہم نے کوئی میسج کہیں بھیجا ہے۔ اس سوراخ دار فیتے کو نہ صرف ریکارڈ کے طور پر محفوظ کیا جاسکتا ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر مشین میں لگا کر اس کا پرنٹ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔"

"جس طرح لفٹ آف ٹیلیکس کے پراسیس کا حصہ ضروری ہے، بالکل ویسے ہی کسی کیس میں ایک ملزم کا ہونا لازمی امر ہے۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "پولیس نے آپ کے بھائی کو غفور شاہ مرڈر کیس کا ملزم بنایا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔ آپ مجھے بتائیں کہ پولیس نے آپ کے بھائی کو کس بنا پر گرفتار کیا ہے؟"

"طارق بھائی، غفور شاہ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔" اس نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "واقعے سے ایک روز پہلے ان کا غفور شاہ سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔"

"اب گاڑی پٹری پر آگئی ہے۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "غفور شاہ سے آپ کے بھائی کی ناپسندیدگی کی وجہ بتائیں اور میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ مقتول اور ملزم کے بیچ جھگڑا کیوں ہوا تھا؟"

"بھائی کی ناراضی کا سبب یہ ہے کہ انہیں بھابی کا غفور شاہ کے آستانے پر جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔" وہ بدلائل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "طارق بھائی آستانوں اور ان پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان میں سے اکثر اتائی ہوتے ہیں جو کمزور عقیدہ اور سادہ لوح افراد کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ بھائی کسی بھی آستانے پر اپنی حاجت روائی کی غرض سے نہیں گئے۔ وہ صرف اللہ اور اپنی محنت پر بھروسا کرتے ہیں لیکن بھابی، بابا لوگوں، تعویذات پر اندھا یقین رکھتی ہیں اور غفور شاہ کے آستانے پر تو وہ پابندی سے جایا کرتی تھیں۔ وہ جب بھی آستانۂ غفوریہ کا چکر لگا کر آتیں تو اس کے بعد طارق بھائی کا موڈ بہت زیادہ خراب ہوجاتا تھا۔ بھائی کا خیال ہے کہ غفور شاہ اپنے پاس آنے والی شادی شدہ عورتوں کو ان کے شوہروں کے خلاف بھڑکاتا ہے۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"پچھلی جمعرات کو بھابی آستانۂ غفوریہ سے لوٹیں تو دونوں میاں بیوی میں خوب لڑائی ہوئی۔ اگلے روز میں اور طارق بھائی اپنے اپنے کام پر نکل گئے اور بھابی اپنا ضروری، اہم اور قیمتی سامان اٹھا کر میکے چلی گئیں۔ بھائی نے بھابی کو واپس لانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں مانیں۔ آئندہ روز بھائی، غفور شاہ کے آستانے پر پہنچے اور اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے اسے خوب کھری کھری سنا ڈالیں۔ معاملہ زبان کلام سے بڑھ کر ہاتھا پائی تک پہنچا اور دونوں نے ایک دوسرے کے گریبان میں بھی ہاتھ ڈالا۔ وہاں موجود لوگوں نے غفور شاہ ہی کی حمایت کی کیونکہ وہ سب اس کے مرید اور عقیدت مند تھے۔ بہرحال، بھائی واپس گھر آگئے۔ یہ ہفتے کے دن کا واقعہ ہے۔ اگلے روز یعنی اتوار کی رات پولیس نے بھائی کو غفور شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔"

آج فروری کی گیارہ تاریخ تھی۔ عارف کے بیان کے مطابق اس کے بھائی کو اتوار آٹھ فروری کی رات گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اگلی صبح پولیس نے ملزم کو عدالت میں پیش کرکے اس کا ریمانڈ حاصل کرلیا ہوگا۔ اسی تصدیق کے لیے میں نے عارف محمود سے سوال کیا۔

"اس وقت آپ کا بھائی کہاں ہے؟"

اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتانے کے بعد کہا۔ "طارق بھائی پولیس کی تحویل میں ہیں۔ وہ لوگ تفتیش کے نام پر بھائی سے اقبالِ جرم کروانے کی کوشش کررہے ہیں۔ اگر آپ بھائی کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیں تو بڑی مہربانی ہوگی وکیل صاحب! رمضانی صاحب نے کہا تھا کہ آپ بڑے پہنچے ہوئے چوٹی کے وکیل ہیں۔"

"عارف صاحب! مجھے یہ سوچنے کی بھی فرصت نہیں ملی کہ میں کس چوٹی پر پہنچا ہوا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بہرکیف، رمضانی صاحب نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے تو یقیناً آپ ان کے لیے بھروسا مند ہوں گے لیکن میں اپنے اصولوں پر چلتا ہوں۔ آپ مجھے ایک دن کا وقت دیں۔ میں آج تھانے جا کر آپ کے بھائی صاحب سے ملاقات کروں گا۔ اگر وہ مجھے بے گناہ نظر آئے تو میں ان کا کیس ضرور لوں گا۔ آپ کل اسی وقت آکر مجھ سے ملیں پھر ہم تفصیلات طے کرلیں گے۔ باقی جہاں تک پولیس کی تفتیش کا تعلق ہے تو....." لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک معنی خیز سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ پولیس کسٹڈی میں لیے گئے ملزم کے بیان کو عدالت کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ یہ ایک سنگین حقیقت ہے کہ پولیس اپنے چالان کا معاملہ سیدھا کرنے کے لیے بزور تشدد ملزم سے اقبالِ جرم کروالیتی ہے۔ عدالت چونکہ اس سفاک حقیقت سے بخوبی واقف ہے اس لیے وہ ملزم کو اس بات کا پورا حق دیتی ہے کہ وہ اپنے بیان سے منحرف ہوجائے۔"

"اچھا!" اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت نمودار ہوئی۔ "یہ بات مجھے پہلے معلوم نہیں تھی۔"

"یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو ہر چیز کا علم ہو۔" میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "آپ اس کیس کے بارے میں اور کیا جانتے ہیں عارف صاحب؟"

"نہیں جناب!" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے جو معلوم تھا، وہ سب میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "تو پھر کل ملاقات ہوگی۔"

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سلام کرکے دفتر سے رخصت ہوگیا۔

اسی روز میں نے متعلقہ تھانے جا کر طارق محمود سے ملاقات کی۔ اس کی عمر پینتیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ ایک دراز قامت، صحت مند اور خوش شکل شخص تھا لیکن اس وقت وہ جن حالات سے گزر رہا تھا، اس کی تلخی نے اس کی مردانہ وجاہت اور صورت شکل کو گہنا دیا تھا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ملزم طارق محمود کے ساتھ نصف گھنٹے کی ملاقات ممکن بنانے کے لیے میں نے تھانہ انچارج کو کس طرح اپنے شیشے میں اتارا تھا۔ قصہ مختصر، میں نے ملزم کو بے قصور جانتے ہوئے اپنا موکل بنالیا اور ضروری قانونی کاغذات پر اس کے دستخط لینے کے بعد میں نے اسے تسلی دی اور تھانے سے نکل آیا۔

آئندہ روز عارف آفس آکر مجھ سے ملا۔ میں نے کیس لینے کی خوشخبری اسے سنائی اور چند ایک اہم کام اس کے ذمے لگانے کے بعد رخصت کردیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اس کیس کے پس منظر سے آپ کو آگاہ کرنا چاہوں گا۔ واضح رہے کہ اس خلاصے میں شامل بعض اہم حالات و واقعات میں نے بعد میں اپنے مخصوص ذرائع استعمال کرکے معلوم کیے ہیں لیکن تسلسل کے خیال کی خاطر انہیں ان مقامات پر "ٹانکا" دیا ہے۔ اسی طرح بعض نکات کو میں نے دانستہ چھپالیا ہے تاکہ کہانی میں

سسپنس کا وجود موجود ہے۔

☆☆☆

ان دونوں بھائیوں کا کوئی اور بھائی بہن نہیں تھا۔ عرصہ پہلے ان کے والدین کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ طارق محمود، عارف محمود سے کم و بیش پانچ سال بڑا تھا لیکن عارف کی شادی طارق سے تین سال پہلے ہو گئی تھی اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ ارسلان اور نادیہ۔ جبکہ ملزم طارق ابھی اولاد جیسی نعمت سے محروم تھا۔ اس کی بیوی شاکرہ زبان کی تیز اور تلخ مزاج تھی۔ ان کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے لیکن ان میں پانچ دن بھی نہیں بنی تھی۔ اپنی اپنی دانست میں وہ دونوں ایک دوسرے کو برداشت کر رہے تھے۔

جیسا کہ میں نے بتایا، عارف ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کلیکس آپریٹر تھا۔ مذکورہ کمپنی کا جدید طرز کا شاندار آفس آئی آئی چندریگر روڈ المعروف میکلوڈ روڈ پر واقع تھا۔ طارق مارکیٹنگ اور سیلز وغیرہ کا کام کرتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت سامان کی ڈلیوری میں گزرتا تھا۔

دونوں بھائیوں نے دن رات محنت کر کے اپنا ایک ذاتی گھر بنا لیا تھا۔ اسی گز پر تعمیر شدہ وہ دو منزلہ مکان ناگن چورنگی پر واقع تھا۔ بالائی منزل پر عارف اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا جبکہ مکان کی زیریں منزل طارق اور اس کی بیوی شاکرہ کے استعمال میں تھی۔ وہ شاکرہ جو طارق کو چھوڑ کر اپنے والدین کے پاس جا چکی تھی۔ شاکرہ کا میکا حسن آباد میں تھا۔ شاکرہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور حد سے زیادہ لاڈلی بھی۔

اگرچہ شاکرہ اور طارق کے مزاج میں بعد المشرقین جیسا معاملہ تھا لیکن جمعرات پانچ فروری کی رات ان کے بیچ ایسا خطرناک جھگڑا ہوا جس کے بعد اثرات نے شاکرہ کو اس کے میکے اور طارق کو قتل کے ملزم کی حیثیت سے پولیس کسٹڈی میں پہنچا دیا تھا۔ بات معمولی سی بحث سے شروع ہوئی تھی جس نے ان کے گھر کا سکون برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

اس شام جب طارق اپنے کام کو نمٹا کر واپس آیا تو شاکرہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر فریش ہوا اور ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر شاکرہ کا انتظار کرنے لگا۔ لگ بھگ ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد اسے بیوی کی شکل دکھائی دی۔

"کہاں سے آرہی ہو شاکرہ؟" اس نے خفگی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

"کیا تمہاری یادداشت اتنی ہی کمزور ہو گئی ہے کہ تمہیں اتنا بھی ہوش نہیں کہ میں ہر جمعرات کو کہاں جاتی ہوں؟" شاکرہ نے ترخ کر جواب دیا۔ "میں آج آستانے پر رش زیادہ تھا اس لیے مجھے دیر ہو گئی۔"

"میری یادداشت کو کچھ نہیں ہوا شاکرہ!" وہ تھوڑا غصے میں آ گیا۔ "بلکہ تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے جو ایک فراڈ شخص سے امیدیں باندھے بیٹھی ہو۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ شاہ جی فراڈ ہیں؟" وہ اسے گھورتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ "کیا تم بھی ان کے آستانے پر گئے ہو؟ وہاں سیکڑوں لوگ اپنی بگڑی بنانے آتے ہیں۔"

"میں نے اللہ اور اس کے رسول کے آستانے کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے اس لیے مجھے اپنے مسائل کے حل کے لیے کسی قرتوت کی خدمت میں حاضر ہونے کی ضرورت نہیں۔ شاہ کے آستانے پر جو لوگ پیشانی ٹیکتے ہیں، وہ سب تمہاری ہی طرح کے ضعیف العقیدہ اور بے وقوف ہیں۔"

"تم نے شاہ جی کو کیا کہا..... پیر قرتوت؟" وہ تیکھی نظروں سے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ "تم نے ان کی شان میں گستاخی کی ہے جس کے لیے تمہیں پچھتانا پڑے گا۔"

طارق نے اپنی بات میں غفور شاہ کے لیے "پیر قرتوت" اور شاکرہ کے لیے "ضعیف العقیدہ بے وقوف" کے الفاظ استعمال کیے تھے لیکن شاکرہ کا دھیان اپنی طرف نہیں گیا تھا۔

"پیر قرتوت نہیں، پیر فرتوت!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "اور اس کا مطلب ہے، بہت زیادہ بوڑھا شخص..... تو کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟ کیا تم غفور شاہ کو کوئی جوان سمجھتی ہو؟ کاش، میں نے اسے پیر فرتوت کہا ہوتا۔ اس خانہ خراب نے کئی گھروں میں آگ لگا رکھی ہے۔ ایک زندہ مثال تو ہمارا اپنا گھر ہی ہے۔ تم جب بھی اس کے آستانے سے ہو کر آتی ہو، تمہارے تیور بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ تم ذرا ذرا سی بات پر مجھ سے جھگڑا کرتی ہو اور پھر دو چار روز کے لیے ہمارے درمیان بات چیت بند ہو جاتی ہے۔ کیا غفور شاہ میرے خلاف تمہارے کان بھرتا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ وہ دوسروں کی بیویوں کو ورغلانے کا ماہر ہے؟"

"تم نے بالکل غلط سنا ہے۔" شاکرہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "شاہ جی، اللہ کے نیک بندے ہیں۔ وہ کسی کو بھڑکاتے یا ورغلاتے نہیں ہیں۔ وہ تو اپنے پاس آنے والوں کا بھلا کرتے ہیں۔ انہیں خطرات سے آگاہ کرتے ہیں۔"

"اچھا تو ایسا ہے؟" طارق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "میں ان کے

پاس اولاد کے لیے دعا کرانے جاتی ہوں۔ وہ میرے لیے دل سے دعا کرتے ہیں۔ انہوں نے تمہارا اور میرا حساب بھی دیکھا ہے۔"

"اچھا، تو وہ حساب کتاب کا علم بھی جانتے ہیں؟" طارق نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "مجھے بتاؤ، وہ ابھی تک دنیا کے سب سے بڑے ریاضی داں کا ایوارڈ کیوں حاصل نہیں کر پائے؟"

"طارق! تم شاہ جی کا مذاق اڑا رہے ہو اور یہ مذاق تمہیں بہت بھاری پڑے گا۔" وہ اپنے شوہر کی جانب انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں بولی۔ "تم ان کے غضب کو سہہ نہیں پاؤ گے۔ ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھیں یا پھر بددعا کے لیے، وہ اثر ضرور دکھاتے ہیں۔"

"شاکرہ! فضول بکواس سے میرا دماغ خراب مت کرو۔" وہ جھلاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ "میں دن بھر کی تھکا دینے والی مشقت کے بعد گھر آیا ہوں۔ اگر تم مجھے آرام و سکون نہیں پہنچا سکتی ہو تو کم از کم فراڈ غفور شاہ کی شان میں قصیدے پڑھ کر تو نہ سناؤ۔"

"کیا تمہیں صرف مجھ پر ہی غصہ آتا ہے یا باہر بھی سب سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہو؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے استفسار سے زہر ٹپکتا تھا۔

"میں کوئی پاگل نہیں ہوں کہ لوگوں سے لڑتا جھگڑتا پھروں۔" طارق نے تیز لہجے میں کہا۔ "تم میرے سامنے ہمیشہ تیز تیز اور الٹی بات کرتی ہو اس لیے مجھے غصہ آ جاتا ہے۔"

"شاہ جی کا حساب غلط نہیں ہو سکتا۔" وہ طارق کو ٹٹولنے والی نظر سے تکتے ہوئے بولی۔ "تم گھر سے باہر بالکل ٹھیک اور خوش رہتے ہو۔ مجھے دیکھتے ہی تمہارا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور کسی نہ کسی بہانے مجھ سے لڑائی شروع کر دیتے ہو۔ یہ سب گندے عمل کا نتیجہ ہے۔"

"کیا کہا تم نے، گندا عمل؟" طارق نے چونک کر شاکرہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں، شاہ جی کے حساب میں یہی آیا ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "تم پر وہ عمل کروایا گیا ہے۔ ایک اولاد کی بندش اور دوسرا مجھ سے خفا اور نفرت کے لیے تم مجھ سے جھگڑتے رہتے ہو۔ شاہ جی نے بتایا ہے کہ کسی دن تم غصے میں مجھے طلاق دے دو گے۔ اس طرح عمل کرانے والے کا مقصد پورا ہو جائے گا۔"

"سبحان اللہ..... ماشاء اللہ..... الحمد للہ.....!" طارق نے زیر لب مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں

ہاں بھی کہ تمہارا یہ غفور شاہ کوئی بہت ہی پہنچا ہوا شیطان ہے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ وہ کہاں تک پہنچ چکا ہے..... بچھو کی طرح بیماں، بھائی پھیرو، کا بیٹا کا چھایا پھر کوئی سوئی خان.....؟"

"طارق! میں تمہیں آخری بار خبردار کر رہی ہوں کہ تم شاہ جی کا مذاق اڑانا بند کردو۔" شاکرہ نے خفگی بھرے لہجے میں تنبیہ کی۔ "ورنہ ان کا غیظ و غضب تمہارا بیڑا غرق کردے گا۔"

"میں صرف اپنے پروردگار کے غیظ و غضب سے ڈرتا ہوں شاکرہ!" طارق نے چٹانی لہجے میں کہا۔ "غفور شاہ جیسے جعلی پیر اور ڈھونگی لوگوں کو میں جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں۔ اگر تم نے اپنی آنکھیں نہ کھولیں تو اگلے مرحلے پر وہ دغاباز تمہیں اس شخص کا نام اور حلیہ بھی بتادے گا جس نے مجھ پر کوئی زبردست سفلی عمل کروا رکھا ہے کیونکہ اس کے حساب میں تو سب کچھ نظر آجاتا ہے۔"

طارق کا آخری جملہ طنز میں بھیگا ہوا تھا لیکن شاکرہ نے اس کی بات کی گہرائی پر دھیان نہیں دیا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"یہ سب تو شاہ جی نے مجھے بتا رکھا ہے۔" وہ بڑے فخر سے بولی۔ "وہ ایک عورت ہے۔ اس کا نام سلمیٰ ہے۔ وہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ تم اس خوبصورت عورت کو اچھی طرح جانتے ہو اور اس سے ملتے بھی رہتے ہو لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ وہ تمہارے حصول کے لیے کیسے کیسے گندے عمل کروا رہی ہے۔ اس بدمعاش عورت نے تمہارے دل و دماغ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ تم اس کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتے......"

"بس.... ہوگیا؟" طارق نے تفصیلی نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ "یا کوئی کسر باقی ہے؟"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" شاکرہ تعجب خیز لہجے میں مستفسر ہوئی۔ "کیا سچ تم سے برداشت نہیں ہو رہا۔ مجھے بتاؤ، یہ حرام زادی سلمیٰ کون ہے؟ تم لوگوں کے بیچ کب سے چکر چل رہا ہے؟ اگر تمہارا دل مجھ سے بھر گیا ہے تو مجھے آزاد کردو۔ اس طرح دھوکا دینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ستیاناس نہیں بلکہ سوا ستیاناس!" طارق نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "غفور شاہ کا حساب تو گیا بھاڑ میں لیکن میرا یہ اندازہ صد فیصد درست ثابت ہو رہا ہے کہ وہ کمینہ بستے بستے گھروں کو اجاڑنے کی بھرپور طاقت اور صلاحیت رکھتا ہے۔"

"اپنا منہ بند رکھو۔" شاکرہ نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔ "میں تمہاری زبان سے شاہ جی کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتی۔ تم اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے انہیں برا بھلا کہہ رہے ہو۔"

"ایک لفظ کیا، میں تو اس خبیث شخص پر اپنا آدھا لفظ بھی ضائع کرنے کو فضول خرچی سمجھتا ہوں۔" طارق نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اب مجھے جو بھی کہنا ہوگا، میں ڈائریکٹ اسی سے کہوں گا۔"

"آخر تم کیا کرنے والے ہو؟" شاکرہ نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "تم شاہ جی سے کیا کہو گے؟"

وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "تمہیں بہت جلد پتا چل جائے گا۔ میں اس ذلیل شخص کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ......"

طارق نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کے تیکھے اور غصے کو دیکھتے ہوئے شاکرہ نے بھی مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اس رات وہ دونوں الگ الگ کمروں میں الگ بستروں پر سوئے تھے۔ گویا غفور شاہ کی لگائی ہوئی آگ نے ان میں جدائی ڈالنے کی شروعات کردی تھی۔

اگلے روز چھ فروری جمعے کی صبح طارق اور عارف اپنے معمول کے مطابق گھر سے نکل گئے تھے۔ شام میں پہلے عارف کی واپسی ہوئی۔ اس کے ایک گھنٹے کے بعد طارق بھی گھر پہنچ گیا اور تبھی عارف کی بیوی شازیہ نے بتایا۔

"شاکرہ بھابی گھر چھوڑ کر جا چکی ہیں۔"

"کہاں؟" طارق نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"انہوں نے اپنا ضروری سامان ایک بیگ میں پیک کیا اور مجھے گھر کی چابیاں دیتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنی امی کے گھر جا رہی ہیں۔" شازیہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "پھر انہوں نے اپنے لیے رکشا منگوایا اور اس میں بیٹھ کر چلی گئیں۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" طارق نے پوچھا۔

"وہ سہ پہر میں نکلی ہیں۔"

"جاتے ہوئے انہوں نے تم سے کچھ اور بھی کہا تھا؟" عارف نے اپنی بیوی سے استفسار کیا۔

"ہاں، وہ کہہ رہی تھیں کہ جب تک طارق اپنے دماغ کا علاج نہیں کرالیتا، وہ واپس نہیں آئیں گی۔" شازیہ نے بتایا۔ "انہوں نے کسی سلمیٰ کا نام بھی لیا تھا اور بڑے غصے سے کہا تھا...طارق کو کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ گھر والی اور باہر والی ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔"

"بھائی جان! یہ سلمیٰ کون ہے؟" عارف نے شک زدہ نظر سے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "اور

"گھر والی، باہر والی" سے بھابی کی کیا مراد ہے؟"

"اس بدبخت کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" طارق نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"لگتا ہے بھابی کو آپ کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے بھائی جان!" شازیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کسی بدخواہ نے آپ کے خلاف ان کے کان بھرے ہیں۔"

"ہاں، بالکل۔ ایسا ہی ہے۔" طارق نے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔ "اور اس میرے بدخواہ بلکہ خوبصورت بیویوں کے شوہروں کے مشترکہ دشمن شخص کا نام ہے پیر غفور شاہ!"

شازیہ اور عارف بے یقینی سے اسے دیکھنے لگے۔

"پیروں، فقیروں کے چکروں میں پڑنا مجھے تو ٹھیک نہیں لگتا بھائی جان!" شازیہ نے کہا۔ "وہ بھلا زمانہ گزر گیا جب سو میں سے کوئی ایک آدھ ڈھونگی اور ڈبا پیر ہوا کرتا تھا اور لوگ اس سے متاثر رہا کرتے تھے۔ آج کل تو سو میں سے ننانوے شک کے دائرے کے اندر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ جس شخص کو ڈھنگ سے وضو کرنا نہیں آتا اور تحت اللفظ کے ساتھ وہ قرآن مجید کی چار آیات تلاوت نہیں کرسکتا، وہ بھی آستانہ کھولے بیٹھا ہے۔"

"عارف! تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں شازیہ جیسی سمجھ دار بیوی ملی ہے۔" طارق اپنی بھابی کو توصیفی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا پھر اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"ان میں سے بعض بابا تو اپنے عقیدت مندوں کی نظروں میں اتنے زیادہ پہنچے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ ظہر کی نماز حرم میں، عصر کی مسجد نبوی میں اور مغرب کی بغداد شریف میں ادا کرتے ہیں اور وہ بھی اپنے مقامی آستانے میں رہتے ہوئے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ جب وہ آستانے سے اٹھ کر اپنے گھر کا رخ کرتے ہیں تو انہیں بائیک، ٹیکسی، رکشا یا موٹر کار کی ضرورت پیش آتی ہے اور اگر ان کی رہائش سیکنڈ، تھرڈ یا اس سے اوپر کے کسی فلور پر ہے تو انہیں وہاں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے لفٹ یا زینے کا سہارا لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے مگر عقل سے پیدل اور آنکھوں والے اندھے مریدوں کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ مکہ، مدینہ اور بغداد تک روحانی قلانچیں بھرنے والے بابا صاحب اپنی نجی زندگی میں اتنے لاچار کیوں ہیں۔ جس زبانی جمع خرچ والے فارمولے کی مدد سے وہ اپنے فدائین کو الو بناتے ہیں، وہی فارمولا ان پر اثر کیوں نہیں کرتا؟"

"بھائی جان! آپ کے ہر سوال کا جواب ہے ان بابا لوگوں کے پاس اور یہ جواب انہوں نے اپنے مریدوں کو بھی رٹوایا ہوا ہے جیسا کہ...... چراغ تلے اس لیے اندھیرا ہوتا ہے کہ وہ خود کو نظر انداز کرکے اپنے ماحول کو روشنی بخشتا ہے یا پھر یہ کہ...... درخت خود دھوپ میں جلتا ہے تو اپنے نیچے بیٹھنے والوں کو سایہ فراہم کرتا ہے۔" شازیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اندھی عقیدت ایک ایسا مرض ہے جس کے خاتمے کے لیے ابھی تک کوئی دوا تیار نہیں کی گئی۔"

"بھائی جان! ان بابا لوگوں کی اصلیت اور تقلید پر ہم بعد میں بھی بات کرسکتے ہیں۔" عارف نے ان دونوں کی گفتگو سے بور ہوتے ہوئے کہا۔ "ابھی آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"مجھے کہاں لے کر جانا چاہتے ہو؟" طارق نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہم دونوں بھابی کے میکے نعمان آباد جائیں گے۔" عارف نے جواب دیا۔ "اور انہیں منا کر واپس لائیں گے۔"

"میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔" شازیہ نے کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ طارق بھائی اس مزاج اور فطرت کے نہیں ہیں جیسا شاکرہ بھابی انہیں سمجھ رہی ہیں یا غفور شاہ نے جیسے بھابی کے ذہن میں شک کا زہر بھرا ہے۔ ہم اگر آپ کی موجودگی میں بھابی کو سمجھائیں گے تو مجھے یقین ہے کہ ان کی غلط فہمی دور ہوجائے گی۔"

"اس معاملے میں جلد بازی مناسب نہیں ہوگی۔" طارق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شاکرہ اپنی مرضی سے گئی ہے اور وہ بھی مجھ سے پوچھے یا مجھے بتائے بغیر۔ اگر ہم باجماعت اسے منانے چلے گئے تو وہ ہمیں ہلکا لے گی اور اس کا دماغ اور خراب ہوجائے گا۔"

بات کے اختتام پر طارق نے اپنے بھائی اور بھاوج کو گزشتہ رات والے اس جھگڑے سے تفصیلاً آگاہ کردیا جو اس کے اور شاکرہ کے بیچ ہوا تھا۔ یہ قصہ سننے کے بعد وہ میاں بیوی تشویش بھری نظروں سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ عارف نے فکرمند لہجے میں طارق کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بھائی! موجودہ صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ آپ کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔ ہم بھابی کے معاملے کو یونہی تو نہیں چھوڑ سکتے نا۔"

"اس معاملے کو فی الحال یونہی چھوڑ دینا ہی اس مسئلے کا حل ہے۔" طارق نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں کل جاکر شاکرہ کے باپ سے ملاقات کرتا

ہوگا۔ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ شاکرہ نے اپنے والدین کو کیا بتایا ہے۔ اس کے بعد ہی کوئی عملی قدم اٹھانا عقل مندی ہوگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاکرہ نے اپنے ماں باپ کے سامنے ہمارے جھگڑے کا کوئی ذکر ہی نہ کیا ہو اور ہم پہنچ جائیں وہاں تماشا لگانے۔ یہ تو اپنے ہاتھوں خود ہی ذلیل ہونے کے مترادف ہوگا۔"

طارق کی بات وزن اور منطق سے بھرپور تھی اس لیے ان میاں بیوی کی سمجھ میں فوراً آگئی۔ عارف نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے بھائی! آپ کل ادھر کا احوال معلوم کرلیں۔ ہم رات میں بیٹھ کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کریں گے۔"

طارق نے وہ رات سونے کی کوشش میں جاگتے ہوئے گزار دی۔ آئندہ روز عارف اپنے آفس اور طارق سمن آباد کی جانب روانہ ہوگیا۔

طارق کا سسر شکور حسین ایک فارما سیوٹیکل کمپنی سے ریٹائر ہوا تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے اپنی فارمیسی کھول لی تھی۔ اس کا میڈیکل اسٹور سمن آباد میں گھر کے نزدیک ہی تھا جو دن کے گیارہ بجے سے رات کے ایک بجے تک کھلا رہتا تھا۔ شکور نے اپنی مدد کے لیے دو سیلز مین بھی رکھے ہوئے تھے۔ وہ خود سہ پہر میں دو تین گھنٹے کے لیے آرام کرنے گھر بھی چلا جایا کرتا تھا۔ اس کی ریٹائرمنٹ لائف گویا پکنک اینڈ پارٹی کی طرح انجوائے کرتے ہوئے گزر رہی تھی۔

شکور حسین ایک سمجھ دار اور بردبار شخص تھا۔ اس نے اپنے داماد کی بات تحمل سے سنی اور تسلی آمیز انداز میں کہا۔

"طارق بیٹا! میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے جھگڑے کے حوالے سے شاکرہ کی سنائی ہوئی کہانی من و عن قبول ہے لیکن اس پر یقین بالکل نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں یہ سب اس شک کا نتیجہ ہے جو غفور شاہ نے کسی نیج کے مانند اس کے دماغ میں بو دیا ہے۔ تم شاکرہ کو چند روز کے لیے ادھر ہی رہنے دو۔ میں اس کی برین واشنگ کردوں گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سب ٹھیک ہوجائے گا کیونکہ اس مشن میں شاکرہ کی ماں راحیلہ ناز بھی میرا ساتھ دے رہی ہے۔"

شکور حسین کی باتوں نے اسے مطمئن کردیا اور وہ اپنے سسر کا شکریہ ادا کرکے وہاں سے چلا آیا۔

اس وقت دوپہر ہو رہی تھی۔ اگرچہ سسر کے تعاون آمیز رویے نے اسے شاکرہ کی طرف سے بے فکر کردیا تھا لیکن وہ اس فساد کی جڑ کو نہیں بھولا تھا جس نے اس کی ہنستی بستی ازدواجی زندگی کو پیچیدہ عذاب کردیا تھا۔ آدھے سے زیادہ دن گزر ہی گیا تھا۔ اس نے آج چھٹی کرنے کا فیصلہ کیا اور گلبرگ آباد سے وہ سیدھا یوپی موڑ کی جانب روانہ ہوگیا جہاں آستانہ غفوریہ واقع تھا۔ وہ ٹھیک دو بجے دوپہر غفور شاہ کے سامنے بیٹھا اس کی "خبر گیری" کر رہا تھا۔

غفور شاہ نے طارق کے ہر الزام کو اپنے حسابی علم کی روشنی میں حقیقت کا درجہ دیا تو طارق کو غصہ آگیا۔ بات ہی ایسی کہ اس کا طیش میں آنا بنتا تھا۔ وہ شخص ایک ایسی عورت والے کو طارق کے سر پر ڈال رہا تھا جس کا کوئی وجود نہ تھا اور نہ ہی کوئی حقیقت۔ طارق سلمیٰ نامی کسی عورت کو نہیں جانتا تھا۔ اس کے ساتھ خفیہ تعلقات استوار کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

اس روز غفور شاہ اور طارق کے بیچ تلخ کلامی سے شروع ہونے والا معاملہ ہاتھا پائی اور دست و گریباں تک جا پہنچا تھا۔ غفور شاہ کے عقیدت مندوں نے بیچ بچاؤ کرکے اس قضیے کو رفع دفع کیا اور طارق کو بازو سے پکڑ کر آستانے سے باہر نکال دیا۔

"ڈبا پیر! میں تمہیں دیکھ لوں گا۔" طارق نے بوقت رخصت غفور شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے غضیلے لہجے میں کہا تھا۔ "تم نے میری زندگی میں آگ لگانے کی کوشش کی ہے نا، میں تمہیں ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ تمہاری زندگی جہنم سے زیادہ بدتر ہوجائے گی پھر تم کسی کے ذہن سے کھیلنے کے قابل ہی نہیں رہو گے۔"

اس روز طارق اپنے دل کی بھڑاس نکال کر آستانے سے واپس آگیا تھا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ جذبات میں ادا کیے گئے اس کے مکالمے بعد ازاں کون سی قیامت برپا کریں گے۔

اس نے ہفتے کے روز کام سے چھٹی کی تھی البتہ وہ اتوار کے دن اپنے بعض ادھورے معاملات نمٹانے کے لیے گھر سے نکل گیا۔ اسی رات دس بجے پولیس نے طارق کو غفور شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔

وہ بے گناہ تھا۔ غفور شاہ کے قتل میں اس کا ہاتھ نہیں تھا لیکن حالات و واقعات کی ستم ظریفی اور وقت کی بے رحم چال نے بڑی بے دردی سے اسے مجرموں والے کٹہرے میں لاکھڑا کیا تھا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ اس پیشی پر میں نے اپنے مؤکل اور اس کیس کے ملزم کی ضمانت کرانے کی بھرپور سعی کی لیکن اس کوشش میں مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ کیس قتل کا ہو اور استغاثہ کے پاس کوئی عینی شاہد بھی موجود ہو تو ملزم کی ضمانت اور وہ بھی پہلی پیشی پر ناممکن کی حد تک مشکل ہوجاتا ہے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول غفور شاہ کی موت آٹھ فروری بروز اتوار سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ استغاثہ کے مطابق مقتول اس وقت اپنے آستانے میں نماز عصر ادا کر رہا تھا جب ملزم نے گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

ابتدائی چند پیشیاں عدالت کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے گزر گئیں۔ اس کے بعد کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی۔ اس دوران میں، میں نے چند ضروری کام نمٹا لیے تھے۔ آؤٹ ڈور بھاگ دوڑ کے حوالے سے میں نے بعض ذمے داریاں ملزم کے چھوٹے بھائی عارف محمود کو سونپ دی تھیں اور اس نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ اس سلسلے میں اسے آفس سے دو تین روز کی چھٹی بھی لینا پڑی تھی۔ بہرکیف، عارف نے خود کو ایک فرض شناس اور ذمے دار شخص ثابت کردیا تھا۔

استغاثہ کی جانب سے نصف درجن گواہوں کی فہرست داخل عدالت کی گئی تھی۔ میں نے بھی چند اہم گواہوں کو لائن اپ کر رکھا تھا جنہیں ضرورت پڑنے پر میں کسی بھی روز عدالت میں بلا سکتا تھا۔

جج کرسیٔ عدل پر براجمان ہوچکا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کردیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ یہ کم و بیش وہی بیان تھا جو وہ اپنی گرفتاری کے وقت پولیس کو دے چکا تھا۔ ملزم کے بیان حلفی کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے اکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا اور ملزم کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ تم مقتول سے نفرت کرتے تھے؟"

"کسی بھی انسان سے محبت یا نفرت کرنے کی ٹھوس وجوہات ہوتی ہیں وکیل صاحب!" ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "یہ زبردستی کا سودا نہیں ہے۔"

میں نے جب تھانے کی حوالات میں طارق سے ملاقات کی تھی تو اسے تھانے اور عدالت کے ماحول اور مزاج کے بارے میں اچھی طرح سمجھا دیا تھا اور اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ میری ہدایت کے مطابق سمجھ داری کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس کے چہرے یا زبان سے کسی قسم کا ڈر یا خوف نہیں جھلکتا تھا۔ اس نے میری اس نصیحت کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا تھا کہ ہم جس بھی ملک میں ہوں، وہاں کی زبان بولنے سے معاملات آسان ہوجاتے ہیں۔

"مطلب؟" ملزم کے جواب پر وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔ "تم کس سودے بازی کی بات کر رہے ہو؟"

"سودے بازی نہیں، میں نے "سودا" کا لفظ استعمال کیا ہے وکیل صاحب!" ملزم نے متحمل انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ کسی انسان سے زبردستی محبت کرسکتے ہیں اور نہ ہی نفرت۔ یہ سب سامنے والے کے رویے اور عمل پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ میں غفور شاہ کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ اس کا دشمنانہ رویہ اور گھٹیا عمل مجھے بہت اذیت پہنچاتا تھا۔ ہاں، میں اس شخص سے بے پناہ نفرت کرتا تھا۔"

"سات فروری بروز ہفتہ......!" وکیل استغاثہ نے معتدل انداز میں سوال کیا۔ "یعنی مقتول کی موت سے ایک دن پہلے تم اس کے آستانے پر گئے تھے۔ اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ تم نے مقتول سے جھگڑا کیا اور اسے خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔ تمہارے الفاظ کچھ اس طرح تھے...... "میں تمہیں دیکھ لوں گا۔ میں تمہیں ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ تمہاری زندگی جہنم سے بھی بدتر ہوجائے گی۔"" لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر ملزم سے پوچھا۔ "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"نہیں وکیل صاحب!" ملزم نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "آپ بددیانتی سے کام لے رہے ہیں۔"

وکیل استغاثہ کے چہرے پر غصہ چھلکنے لگا۔ اس نے جارحانہ انداز میں استفسار کیا۔ "آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"بددیانتی کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ کسی امانت میں خیانت کرنا۔" ملزم نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ "مذکورہ روز میں نے مقتول سے کہا تھا کہ...... میں تمہیں دیکھ لوں گا ڈبا پیر! تم نے میری زندگی میں آگ لگانے کی کوشش کی ہے نا...... میں تمہیں ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ تمہاری زندگی جہنم سے زیادہ بدتر ہوجائے گی۔ پھر تم کسی کے ذہن سے کھیلنے کے قابل نہیں رہو گے۔" وہ ذرا بھر کے لیے تھما پھر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے شاکی لہجے میں اضافہ کردیا۔

"آپ نے میرے بیان کے ایک حصے کو غائب کر دیا ہے۔ کسی سچ کو چھپانا یا اس کے آدھے حصے کو بیان کرنا بددیانتی کے زمرے میں آتا ہے۔ آپ امانت میں خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں وکیل صاحب!"

"عدالت کا وقت اتنا بھی فالتو نہیں ہوتا کہ یہاں طول طویل کہانیاں سنائی جائیں۔" وکیل استغاثہ نے قہقہات بھرے لہجے میں کہا۔ "بہرحال، تم نے اس روز مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔"

"میرے الفاظ کی روشنی میں ایسا سمجھا جاسکتا ہے۔" ملزم نے مطمئن انداز میں کہا۔ "لیکن اس وقت میں بہت غصے میں تھا۔ وہ بیان میرے جذبات کا عکاس تھا، عمل کا نہیں۔ طیش کے عالم میں انسان کچھ بھی بول جاتا ہے۔"

"تم نے اپنی اس دھمکی کو آئندہ روز عملی جامہ پہنا دیا۔" وکیل استغاثہ ملزم کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ "تم اتوار آٹھ فروری کی سہ پہر دوبارہ مقتول کے آستانے پر پہنچے اور حالت نماز میں اس پر حملہ آور ہوئے۔ جب مقتول سجدے میں تھا تو تم نے اس کا گلا دبا کر اسے موت کی نیند سلا دیا۔ تم اس سفاک حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔"

"یہ کوئی سفاک حقیقت نہیں بلکہ ایک من گھڑت کہانی ہے۔" ملزم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں نے غفور شاہ کو قتل نہیں کیا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس روز وہاں گیا ہی نہیں تھا۔"

"استغاثہ کے پاس ایک ایسا معتبر گواہ موجود ہے جس نے وقوعہ کے روز تمہیں مقتول کے آستانے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔" وکیل استغاثہ نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "تم اپنے کیے کی سزا پا کر ہی رہو گے۔"

"ہر انسان کو اس کے بُرے اعمال کی سزا مل کر ہی رہتی ہے۔" ملزم نے معنی خیز انداز میں کہا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ "بندہ لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے... وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے کھا جانے والی نظر سے ملزم کو دیکھا اور جرح موقوف کرنے کا اعلان کر دیا۔ "مجھے ملزم سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!"

اپنی باری پر میں اکیوزڈ باکس کے قریب چلا گیا اور میں نے اپنے موکل سے چند ایک اہم سوال کیے۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔

"طارق محمود! ابھی تم نے وکیل سرکار کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ کسی بھی انسان سے محبت یا نفرت کرنے کی ٹھوس وجوہات ہوتی ہیں۔ تم نے اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ مقتول سے تمہیں نفرت تھی۔ یہ نفرت اس کے رویے اور عمل کے سبب تھی۔ تم مقتول کی وجہ سے ذہنی اذیت میں مبتلا تھے۔ آخر مقتول نے ایسا کیا کر دیا تھا کہ تم اس سے اتنی شدید نفرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے؟"

"میری بیوی شاکرہ کا شمار بھی مقتول کے عقیدت مندوں میں ہوتا تھا۔"

"ہوتا تھا کا کیا مطلب ہوا؟" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے تیز آواز میں استفسار کیا۔ "کیا اب وہ مقتول کی عقیدت مند نہیں رہی؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ شاکرہ کو عقل آ گئی ہے۔" وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "اور اس نیک کام کا سارا کریڈٹ میرے ساس، سسر کو جاتا ہے۔ انہوں نے بڑے طریقے اور سلیقے سے شاکرہ کو زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا جس کے نتیجے میں وہ واپس گھر آ گئی ہے ورنہ تو وہ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکی تھی۔"

"تمہارا خیال ہے شاکرہ کی اس بغاوت کے پیچھے مقتول کا ہاتھ تھا؟"

"جی، بالکل۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔

"وہ کیسے؟" میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ "معزز عدالت اس معاملے کو سمجھنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔"

"ہماری شادی کو لگ بھگ پانچ سال ہو گئے ہیں لیکن اللہ کی مرضی کہ ابھی تک ہم بے اولاد ہیں۔ ہم دونوں کی میڈیکل رپورٹس بالکل نارمل ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اسی لیے میں نے اس معاملے کو پھر رضا کر رکھا ہے کیونکہ اولاد، صحت، بیماری، زندگی، موت...... سب اسی کے ہاتھ میں ہے لیکن شاکرہ کا بے صبراپن اسے ادھر ادھر لے جاتا تھا۔ اسی سرگردانی نے اسے مقتول کے آستانے پر پہنچا دیا۔ یہ بات مجھے کافی عرصے کے بعد پتا چلی کہ شاکرہ اولاد کے حوالے سے غفور شاہ کے پاس جاتی ہے۔ میں نے اپنے طور پر مقتول کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ اسے کچھ بھی آتا جاتا نہیں۔ وہ سائلین کی سادگی اور نفسیات سے کھیل کر اپنا دھندا چلاتا ہے۔ مقتول کی ذات کے حوالے سے مجھے جو خطرناک بات معلوم ہوئی، اس نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔"

وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے پتا چلا کہ مقتول حسین اور خوبصورت عورتوں کو ورغلانے اور بہکانے کا بھی ماہر ہے۔ اور شادی شدہ عورتیں اس کا خصوصی ٹارگٹ ہیں۔ وہ انھیں ان کے شوہروں کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ ان میں سے جو عورتیں کمزور سوچ کی مالک ہوتی ہیں، انہیں وہ آسانی سے اپنے ناپاک مقاصد کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے اور جو تیز دماغ عورتیں اس کے فریب میں نہ آ سکیں، ان کے ذہن میں وہ شوہروں کے خلاف شک کا بیج بو کر ان کی ازدواجی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔ میں سمجھانے والے انداز میں شاکرہ کو مقتول کے آستانے پر جانے سے روکتا رہتا تھا لیکن جب اس کی زبان سے میں نے انتہائی خطرناک اور گھر اجاڑنے والی باتیں سنیں تو ہمارے بیچ شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا۔"

"ایک منٹ......!" میں نے دانستہ اسے ٹوک دیا اور پوچھا۔ "عدالت ان انتہائی خطرناک اور گھر اجاڑنے والی باتوں کے بارے میں جاننا چاہتی ہے جن کا ابھی تم نے ذکر کیا ہے۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ جمعرات پانچ فروری کی رات تھی۔" ملزم نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ "میں اپنے کام سے واپس آیا تو شاکرہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ جب وہ لوٹی اور میں نے اس سے استفسار کیا کہ وہ اتنی دیر تک کہاں غائب تھی تو اس کے جواب نے مجھے آپے سے باہر کر دیا۔ شاکرہ نے مجھے بتایا کہ مقتول کے حساب میں آیا ہے کہ میں سلمیٰ نامی کسی عورت سے عشق لڑا رہا ہوں اور عنقریب میں شاکرہ کو طلاق دے کر سلمیٰ سے شادی کرنے والا ہوں۔ علاوہ ازیں مقتول نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ ہماری اولاد کے حوالے سے کوئی بندش وغیرہ بھی کروا رکھی ہے۔ یہ خرافات بلکہ واہیات باتیں سن کر میرا دماغ گھوم گیا اور میں نے شاکرہ کو مقتول کی کمینگی کے ذیل میں خوب سنائیں۔ آئندہ روز جمعہ چھ فروری کی شام جب میں اپنے کام سے واپس آیا تو پتا چلا کہ شاکرہ مجھے چھوڑ کر اپنے والدین کے پاس چلی گئی ہے۔ میں نے ہفتہ سات فروری اپنے سسر شکور حسین کو صورت حال سے آگاہ کر دیا اور اسی دوپہر مقتول کے آستانے پر جا کر میں نے اس سے جھگڑا بھی کیا تھا۔"

"ٹھیک ہو گیا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "لیکن استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ اس جھگڑے سے تمہارا جی نہیں بھرا تھا۔ تم آئندہ روز یعنی اتوار آٹھ فروری کی سہ پہر دوبارہ مقتول کے آستانے پر پہنچے اور تم نے اسے عصر کی نماز کی ادائیگی کے دوران میں گلا گھونٹ کر اس دنیا سے اگلی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔"

"اس سے بڑا مذاق اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا وکیل صاحب!" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "اگر غفور شاہ کی موت نماز عصر ادا کرتے ہوئے واقع ہوئی تھی تو پھر اس کی لاش کو اس کے آستانے سے نہیں بلکہ مسجد نبوی سے دستیاب ہونا چاہیے تھا۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" جج نے بے ساختہ سوال کیا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ وقوعہ کی سہ پہر مقتول کراچی میں نہیں بلکہ مدینہ منورہ میں تھا؟"

"نو سر......! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" ملزم نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "مقتول کے بیان اور اس کے عقیدت مندوں کے ایمان کے مطابق، وہ اپنی روحانی پرواز کی بدولت ظہر کی نماز حرم میں، عصر کی نماز مسجد نبوی اور مغرب کی نماز بغداد شریف میں ادا کیا کرتا تھا۔ میں ایک سیدھا سادہ اہل ایمان مسلمان ہوں جناب عالی! اس نوعیت کے روحانی کمالات و عجائب ابھی میرے تجربے میں نہیں آئے۔ میں نے ابھی معزز عدالت کے سامنے جو بھی کہا، وہ مقتول اور اس کے ارادت مندوں کے عقیدے کی روشنی میں تھا۔ اگر مجھ سے کوئی گستاخی یا کوئی غلطی ہوئی ہو تو میرا اللہ مجھے معاف کرے اور...... سر! آپ بھی مجھے معاف کر دیں...... پلیز!"

مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ طارق محمود اداکاری کے شعبے میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ اس نے ایک طرح سے جج کو لاجواب کر دیا تھا لہٰذا اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"بیگ صاحب! آپ ملزم سے کچھ اور پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"آخری سوال یور آنر!" میں نے مؤدب انداز میں کہا پھر اپنے موکل سے مخاطب ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

"تو تم اس بات سے انکاری ہو کہ وقوعہ کی سہ پہر تم مقتول کے آستانے پر...... گئے تھے یعنی آٹھ فروری بروز اتوار کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان؟"

"بالکل نہیں جناب!" وہ قطعی لہجے میں بولا۔ "مجھے صرف ایک بار اس فسادِ خانے...... میرا مطلب ہے، اس آستانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ یعنی سات فروری بروز ہفتہ دوپہر میں جب میرے اور مقتول کے بیچ شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا تھا۔"

"گویا وقوعہ کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان تم جائے واردات سے کہیں دور موجود تھے؟" میں نے تیز آواز میں سوال کیا۔

"جی ہاں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے

بولا۔ ''ایسا ہی ہے وکیل صاحب!''
''دیٹس آل یور آنر!'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ ''مجھے ملزم سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

میں نے جرح کے آخری حصے میں سوال کرتے ہوئے دانستہ مخصوص وقت کا ذکر دوبار کیا تھا۔ وہی وقت جب پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق غفور شاہ کی موت واقع ہوئی تھی۔ اس تذکرے سے میرا مقصد عدالت کو یہ باور کرانا تھا کہ مقتول کی موت کے وقت میرا موکل آستانہ غفوریہ سے دور کہیں اور موجود تھا۔ میں اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب رہا تھا۔ اگر ضرورت محسوس ہوتی تو بھی مجھے کوئی دقت یا پریشانی نہیں تھی کیونکہ میں نے اس معاملے کی دوسری حد تک رسائی کا راستہ بھی ہموار کر رکھا تھا۔

آج عدالتی کارروائی کے لیے ہمارے کیس کو زیادہ وقت نہیں مل سکا تھا۔ جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈجارنڈ!''

☆☆☆

کسی بھی کیس کی ابتدائی کارروائی قدرے سست اور بور محسوس ہوتی ہے لیکن معاملات جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں، اس میں تیزی اور دلچسپی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ہمارے کیس کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ آج میں نے اپنے موکل کی بیوی شاکرہ کو عدالت میں موجود رہنے کے لیے خاص طور پر کہا تھا۔ یہ بہت اچھی بات تھی کہ اپنے والدین کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی اور میں جانتا ہوں اس کا ایک اہم سبب غفور شاہ کا قتل بھی تھا۔ اگر وہ شخص زندہ ہوتا تو شاکرہ کا دماغ اسی کے اشاروں کی زبان سمجھتا اور یہ معاملہ اتنی آسانی سے نہیں سلجھ سکتا تھا جیسا کہ درحقیقت ہو چکا تھا۔

شاکرہ واپس اپنے گھر آ گئی تھی لیکن اب اس کا گھر والا جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا اور اسے اس وقت تک جیل ہی میں روز و شب گزارنا تھے جب تک میں اسے بے گناہ ثابت کرنے کے بعد باعزت بری نہ کروا لیتا اور مجھے پورا یقین تھا کہ میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

شاکرہ کو عدالتی کارروائی دکھانے کا مقصد یہ تھا کہ اسے زمانے کی اونچ نیچ اور انسانوں کے اصلی چہروں سے شناسائی ہو جائے۔ اگر کوئی شخص واقعتاً کچھ سیکھنے کی خواہش رکھتا ہو تو اس کے لیے کورٹ روم (کمرۂ عدالت) سے زیادہ بہتر اور کوئی درس گاہ نہیں ہو سکتی۔

اس پیشی پر استغاثہ کی طرف سے تین گواہوں کو عدالت میں پیش کیا گیا جن میں سے دو آستانے پر کام کرنے والے مقتول کے وفادار اور عقیدت مند مرد تھے اور تیسری مقتول کی اہلیہ فائزہ۔ قبل اس کے کہ وکیل مخالف اپنے گواہ کو کٹہرے تک لاتا، میں نے جج سے ایک چھوٹی سی درخواست کر دی۔

''یور آنر! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ دس منٹ۔ میں اس سے زیادہ وقت نہیں لوں گا۔''

میری یہ درخواست انتہائی معقول اور جائز تھی بلکہ یہ میرا حق تھا لہٰذا جج نے کسی تردد کے بغیر میری بات مان لی۔ کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ ہمارے کیس کا انکوائری آفیسر عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ اس کا نام جمال شاہ تھا۔

جج کے حکم پر جمال شاہ وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوا تو میں اس کے نزدیک چلا گیا پھر اس کے چہرے پر نگاہ جما کر خوشگوار لہجے میں استفسار کیا۔

''شاہ جی! مجھے کبھی آستانہ غفوریہ پر جانے کا موقع نہیں ملا مگر اس کیس نے آپ کو وہاں جانے پر مجبور کر دیا۔ کیا آپ اس سے پہلے بھی ادھر جاتے رہے ہیں؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرے لیے بھی یہ ایک اتفاق ہی تھا...... پہلا اتفاق۔''

''لیکن ہم دونوں میں ایک اور بھی فرق ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس اتفاق کے علاوہ...... میرا مطلب ہے، مقتول کے حوالے سے۔''

میں مبہم انداز میں آئی او کے ذہن کو الجھانے کی سعی کر رہا تھا اور اس کوشش میں مجھے کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ اس نے دلچسپی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''آپ کس فرق کی بات کر رہے ہیں وکیل صاحب؟''

''لائیو ٹیلی کاسٹ اور ریکارڈڈ ٹیلی کاسٹ کا فرق شاہ جی!'' میں نے اس کی الجھن میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ بے بسی سے بولا۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''شاہ جی! میں نے اس کیس کی فائل میں لگی ہوئی مقتول کی چند تصاویر کو دیکھا ہے جبکہ آپ نے موقع واردات پر بڑی توجہ اور باریک بینی سے اس کی لاش کا معائنہ کیا تھا، خصوصاً اس کی گردن کا۔''

"جی، میں سمجھ گیا، لائیو اور ریکارڈنگ کا فرق۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"گڈ!" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اب چند منٹ کے لیے ہم مقتول کی چربیلی گردن پر فوکس کرتے ہیں۔ آپ تیار ہیں اس کام کے لیے؟"

"جی، میں تیار ہوں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"میرا اندازہ یہ کہتا ہے کہ مقتول کی قمیص کا کالر سترہ سے اٹھارہ انچ کے درمیان رہا ہوگا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"میں مقتول کے کالر کا درست سائز نہیں بتا سکتا۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "البتہ اس کی گردن نارمل سائز سے بڑی تھی۔"

"بڑی، موٹی اور چربیلی دار... تھی نا؟"

"جی، بالکل۔"

"کسی بپھرے ہوئے سانڈ یا گینڈے کے مانند؟"

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"آئی او صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "کیا آپ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اتفاق کرتے ہیں؟"

وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "صد فیصد۔"

"مذکورہ رپورٹ میں واضح الفاظ میں لکھا ہوا ہے کہ مقتول کی موت اس کا گلا دبانے سے واقع ہوئی تھی۔" میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے سوال کیا۔ "اگر آپ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اتفاق کرتے ہیں تو پھر آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس بھی شخص نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا تھا، وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط تھا؟"

"لیکن اس رپورٹ میں مقتول کا گلا گھونٹنے کا ذکر ہے، گردن دبانے کا نہیں۔" آئی او اپنی عقل کے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تھروٹ اور نیک دو الگ مقامات ہیں۔"

"بے شک، تحقیقی اعتبار سے آپ درست فرما رہے ہیں مائی ڈیئر آئی او!" میں نے تحسینی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب آپ ذرا موت کے منظر، میرا مطلب ہے موت کے آسن کا جائزہ لیں۔ آپ نے اس کیس کا چالان تیار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مقتول اپنی موت کے وقت نماز عصر ادا کر رہا تھا اور عین سجدے کی حالت میں گلا دبا کر اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کیا میرے موکل کے خلاف چارج شیٹ آپ ہی نے تیار کی تھی یا...؟"

میں نے بات ادھوری چھوڑ کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

"جی بالکل۔ یہ رپورٹ میں نے ہی تیار کی ہے۔"

"ٹھیک ہوگیا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "پھر تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب کوئی نمازی عالم سجدہ میں ہوتا ہے تو اس کا گلا دبانے کے لیے بھی عملاً اس کی گردن ہی کو دبانا پڑتا ہے اور اس حالت میں نمازی دنیا و مافیہا سے اتنا بھی غافل نہیں ہوتا کہ کوئی قاتل گردن دبا کر اسے ہلاک کرنے کی کوشش کر رہا ہو اور وہ اپنی بقا کے لیے ذرا سی بھی مزاحمت نہ کر سکے۔ خصوصاً مقتول جیسا جاندار، خاصے فٹ اور توانائی سے بھرپور کوئی شخص......"

"چلیں، ہم گلے کی جگہ گردن کو رکھ لیتے ہیں۔" آئی او نے عجیب سے اعتماد اور شکست خوردہ انداز میں کہا۔

"اب گردن اور گلے کو ادھر اُدھر رکھنے سے بات نہیں بنے گی، شاہ جی!" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ نے تو کھوتا ہی کھوہ میں ڈال دیا ہے۔ میرا مطلب ہے، آپ کی معمولی سی غلطی نے معاملے کو بُری طرح بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔"

"تو پھر کیا، کیا جائے؟" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"آپ نے تو جو کرنا تھا، وہ کر چکے۔ اب میری باری ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے آپ کے لیے بھی میرے پاس ایک چھوٹا سا کام ہے۔"

"کیا؟" وہ چونک کر مجھے تکنے لگا۔

"آپ ملزم کے ہاتھوں کو غور سے دیکھیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر معزز عدالت کو بتائیں کہ کیا یہ ہاتھ کسی ایسے توانا انسان کی گردن کو اس طرح دبانے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ ان کا ٹارگٹ کسی قسم کی مزاحمت کرنے کے قابل نہ رہے اور وہ اس قاتل کو اپنی جان دینے کے لیے تیار ہو جائے؟"

میری بات کے ختم ہوتے ہی کمرۂ عدالت میں ایک شور سا اٹھا۔ حاضرین عدالت آپس میں ہنسی مذاق اور چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔ آئی او سے کیے گئے میرے سوال نے گویا ان کے لیے تفریح کا سامان مہیا کر دیا تھا۔

"آرڈر... آرڈر...!" جج نے چوبی ہتھوڑے کو حرکت میں لاتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "آرڈر اِن مائی کورٹ پلیز!"

اگلے ہی لمحے عدالت میں خاموشی چھا گئی۔ میں نے

آئی او سے سوال و جواب کے لیے جج سے جو مہلت مانگی تھی، وہ وقت دو گنا سے بھی بڑھ گیا تھا لیکن اس جرح کے دوران میں، میں نے جو اہم انکشاف کیا تھا، اس نے عدالت میں ہلچل مچا دی تھی۔ میں اپنا کام مکمل کر چکا تو وکیل استغاثہ نے یاسین نامی ایک شخص کو گواہی کے لیے پیش کیا۔

یاسین کی عمر چالیس سال کے اریب قریب تھی۔ وہ عام سی شکل و صورت کا مالک ایک صحت مند شخص تھا۔ جب وہ اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کروا چکا تو وکیل استغاثہ نے اس سے سوال کیا۔

"یاسین! عدالت کو بتاؤ کہ وقوعہ کے روز تم نے کیا دیکھا تھا؟"

یاسین وہی بندہ تھا جس کے بارے میں وکیل استغاثہ نے عینی شاہد ہونے کی بات کی تھی۔

"اس روز آستانے پر صرف میں اور اصغر ہی موجود تھے۔ جب شاہ جی وضو کر رہے تھے تو میں نے اصغر کو دودھ لینے کے لیے باہر بھیج دیا۔ آستانے پر موجود دودھ ختم ہو چکا تھا اور شاہ جی عصر کی نماز کے بعد چائے پیا کرتے تھے۔ اسی لیے میں نے اصغر کو دودھ لانے کے لیے بھیجا تھا۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

"جب شاہ جی نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو یہ شخص آستانے پر آیا تھا۔" وہ ایکوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس نے مجھ سے کہا کہ شاہ جی سے ملنا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ شاہ جی اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہے ہیں، وہ انتظار کرے۔ یہ بولا، میں ان کے کمرے میں بیٹھ کر ہی انتظار کر لوں گا۔ مجھے ان سے معافی مانگنا ہے۔ میں نے کل شاہ جی سے جو جھگڑا کیا تھا اس پر میں بہت شرمندہ ہوں۔ اس بندے نے رونے والا چہرہ بنا رکھا تھا اور بہت زیادہ پریشان نظر آرہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آگیا اور میں نے اسے شاہ جی کے کمرے میں جانے دیا۔ دس منٹ کے بعد یہ کمرے سے نکلا اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد یہ کہتے ہوئے آستانے سے رخصت ہوگیا۔ شاہ جی بہت بڑے دل کے مالک ہیں۔ انہوں نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اس کے جانے کے بعد اصغر دودھ لے کر واپس آگیا۔ میں نے شاہ جی کے لیے چائے بنائی اور جب میں چائے لے کر ان کے کمرے میں گیا تو وہ جائے نماز پر الٹے پڑے تھے۔ اس ذلیل انسان نے شاہ جی کی جان لے لی تھی۔"

بیان کے اختتام پر اس کی صورت ایسی بن گئی جیسے اس کے کسی عزیز کی تازہ تازہ موت واقع ہوئی ہو۔ وکیل استغاثہ نے اس کے بیان کی ذیل میں چند سوالات کرنے کے بعد اسے فارغ کر دیا تو میں اپنی باری پر وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ استغاثہ کے گواہ نے جو پرفارمنس دی تھی، اس سے میں بالکل متاثر نہیں ہوا تھا لہٰذا میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"یاسین! تم نے بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز تمہارے اور اصغر کے سوا آستانے پر کوئی اور موجود نہیں تھا۔ تو کیا اتوار کے دن شاہ جی باقاعدہ تعطیل مناتے تھے؟"

"ایسی بات نہیں ہے وکیل صاحب!" اس نے جواب دیا۔ "شاہ جی تو کسی بھی دن چھٹی نہیں کرتے تھے۔ اس روز ان کی طبیعت خراب تھی اس لیے آرام کی غرض سے انہوں نے آستانے کی مصروفیت کو ایک دن کے لیے روک دیا تھا۔"

"تم یہ بات جانتے تھے کہ ایک روز قبل ملزم، مقتول سے تعویذ کی قیمت کا جھگڑا کر کے گیا تھا۔" میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ "اس کے باوجود بھی تم نے اسے مقتول کے کمرے میں جانے دیا؟"

"اس بندے نے شاہ جی سے معافی مانگنے کی بات کی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "شاہ جی معافی مانگنے کے عمل کو بہت پسند فرماتے تھے اس لیے میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس کی نیت میں فتور ہے اور یہ شاہ جی کی جان لے لے گا۔"

"نیت کا حال تو صرف پاک پروردگار ہی جانتا ہے لیکن نیت کا فتور انسان کے عمل سے ظاہر ہو جاتا ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "جیسا کہ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔"

"میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے وکیل صاحب؟" اس نے الجھن زدہ لہجے میں سوال کیا۔

"تم جب مقتول کے لیے چائے لے کر اس کے خاص کمرے میں پہنچے تو تم نے اسے جائے نماز پر الٹا پڑے دیکھا۔" اس کے استفسار کا جواب دینے کے بجائے میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ "اور تم نے سمجھ لیا کہ ملزم نے گلا گھونٹ کر یا گردن دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔"

"جی... جی ہاں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"تمہارے پاس ایسا کون سا علم ہے جس کی بدولت تم کسی شخص پر نگاہ ڈال کر یہ بتا سکتے ہو کہ وہ زندہ ہے یا زندگی سے خالی ہو چکا ہے؟"

میرے سوال نے لمحے بھر کے لیے اسے گڑبڑا دیا لیکن جلد ہی وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھے نہیں وکیل صاحب! دراصل ریحان شاہ صاحب نے شاہ جی کو ہلا جلا کر دیکھا تھا۔ تبھی پتا چلا تھا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد ہی ریحان صاحب نے پولیس کو آستانے پر بلایا تھا۔"

"یامین! نیت کا فتور اسی کو تو کہتے ہیں۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "پہلے تم نے بتایا کہ وقوعہ کے وقت صرف تم اور اصغر ہی آستانے پر موجود تھے۔ اب تمہاری زبانی کسی ریحان شاہ کی 'انٹری' سننے میں آ رہی ہے۔ یہ کیسا چکر ہے؟"

"میں نے غلط نہیں کہا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس وقت آستانے پر صرف اصغر اور میں ہی تھے لیکن جب میں نے شاہ جی کو بے ہوش پڑے دیکھا تو میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آیا تا کہ اصغر کو شاہ جی کے بارے میں بتاؤں۔ میں جیسے ہی کمرے سے باہر آیا، میں نے ریحان شاہ صاحب کو آستانے میں داخل ہوتے دیکھا۔ جب میں نے انہیں شاہ جی کی حالت کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً اندر چلے گئے تھے۔ بس، اتنی سی بات ہے۔"

میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کر لیا تھا کہ اس واقعے کی اطلاع تھانے میں کسی ریحان شاہ نامی نوجوان نے درج کرائی تھی۔ جب استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں بھی مجھے ریحان شاہ کا نام نظر آیا تو میں نے عارف محمود کو اس نوجوان کا "تاریخ جغرافیہ" کھوجنے پر لگا دیا تھا اور اس "کھدائی" میں بہت سا کام کا مال نکلا تھا۔ میں نے یامین پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں ریحان شاہ کے حوالے سے مکمل جانکاری رکھتا ہوں۔ میں نے بالکل انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ریحان شاہ کون ہے؟ تم اتنے ادب سے اس کا نام کیوں لے رہے ہو۔ کیا یہ کوئی اہم شخص ہے؟"

"جی بالکل!" وہ زور دے کر بولا۔ "ریحان شاہ صاحب، شاہ جی کے بڑے صاحبزادے ہیں۔"

"اوہ..... تو یہ بات ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اپنی جرح کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے استغاثہ کے گواہ یامین سے سوال کیا۔ "وقوعہ کے روز جب ملزم، مقتول سے معافی مانگنے آستانے پر آیا تو اس نے کس رنگ کا لباس پہن رکھا تھا؟"

لمحاتی تذبذب کے بعد اس نے جواب دیا۔ "بھورے رنگ کا شلوار قمیص۔"

"اور اس روز اصغر نے کیسا لباس پہن رکھا تھا؟"

"اس نے سفید شلوار پر کالا کرتا پہن رکھا تھا۔"

"اب ذرا اپنے لباس کے بارے میں بھی بتا دو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔" اس نے بتایا۔

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"

یامین کے بعد اصغر گواہی دینے آیا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے پاس چلا گیا۔ وکیل استغاثہ نے انیس بیس کا فرق رکھتے ہوئے اصغر سے بھی اسی ٹائپ کے سوالات کیے جیسے وہ اس سے پہلے یامین سے کر چکا تھا۔ اپنی باری پر میں نے اصغر سے صرف تین سوال کیے۔

"وقوعہ کے روز تم نے کون سا لباس پہن رکھا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "سیاہ کرتا اور سفید شلوار۔"

"اور یامین نے؟"

"وہ نیلے رنگ کے شلوار سوٹ میں تھا۔"

"ملزم کے لباس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے ترنت جواب دیا۔ "براؤن شلوار قمیص۔"

"تم ملزم کے لباس کے بارے میں اتنے وثوق سے کیسے بتا سکتے ہو؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "یامین نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ جب اس نے تمہیں دودھ لینے بھیجا، اس کے بعد ملزم آستانے پر پہنچا تھا اور جب وہ رخصت ہو گیا، اس کے بعد تم دودھ لے کر واپس آئے تھے۔ مطلب یہ کہ تم نے تو وقوعہ کے روز ملزم کو دیکھا ہی نہیں تھا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ملزم کے لباس کے بارے میں مجھے یامین ہی نے بتایا تھا۔"

"اور تمہیں یہ بھی یامین ہی کی زبانی پتا چلا تھا کہ جس وقت تم دودھ لینے گئے ہوئے تھے، ملزم، مقتول سے معافی مانگنے وہاں آیا تھا اور شاہ جی کو موت کے گھاٹ اتار کر واپس چلا گیا؟" میں نے اصغر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "ہیں نا؟"

"جی ہاں..... بالکل۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ میں نے تو ملزم کو دیکھا ہی نہیں تھا۔"

"دیٹس آل یور آنر!" میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا البتہ عدالت کے ریکارڈ پر چند اہم باتیں لانا ضروری سمجھتا ہوں۔"

"کون سی اہم باتیں، بیگ صاحب؟" جج نے مجھ سے دریافت کیا۔

"نمبر ایک....." میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ "سب سے پہلے میں اس کیس کی بنیاد یعنی ایف آئی آر کی ایک بھیانک خامی کی جانب عدالت کی توجہ مرکوز کرانا چاہوں گا۔ میرے موکل کے خلاف جو چارج شیٹ تیار کی گئی، اس کے مطابق ملزم نے حالت سجدہ میں مقتول کا گلا گھونٹ کر اس کی جان لی تھی۔ جیسا کہ میں اس کیس کے دوران میں اس جانب واضح اشارہ کر چکا ہوں کہ سجدے کی حالت میں تکنیکی اعتبار سے کسی شخص کی گردن تو دبائی جا سکتی ہے لیکن اس کا گلا گھونٹنا ممکن دکھائی نہیں دیتا اور پھر ملزم کے ناتواں ہاتھوں اور مقتول کی چربیلی موٹی تازی گردن کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ..... یہ گردن اور ملزم کے ہاتھ.....!" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے استغاثہ کے دو گواہوں یامین اور اصغر کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح کا احوال معزز عدالت کے ریکارڈ پر آ چکا ہے۔ اسی حوالے سے میں نمبر دو اہم نکتے کی جانب عدالت کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے وکیل سرکار کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے خوب بپھرا ہوا نظر آیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ "آبجیکشن یور آنر" کا نعرۂ مستانہ بلند کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تاک میں ہے۔ میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور دلائل کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس امر میں رتی برابر بھی شک نہیں کہ استغاثہ کے گواہ یامین کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ بس، اس کی نیت میں فتور ہے۔"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" بالآخر وکیل استغاثہ نے میرے دلائل میں رخنہ ڈال ہی دیا۔ "میرے فاضل دوست دو تین بار معزز گواہ کی نیت کے حوالے سے "فتور" کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ گواہ کی عزت نفس پر کھلا حملہ ہے جو اخلاق کے بنیادی تقاضوں کے منافی ہے۔ میری عدالت سے درخواست ہے کہ ڈیفنس کونسل کو ایسی حرکت سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔"

"آپ کیا کہتے ہیں بیگ صاحب؟" جج نے مجھ سے پوچھا۔

"جناب عالی! میں نے جب جب، جہاں جہاں اور جس جس شخص کے لیے جو جو لفظ استعمال کیا، وہیں پر اس کی مکمل وضاحت بھی کی ہے۔" میں نے متحمل انداز میں کہا۔ "میں تو اب بھی وہی کرنے جا رہا تھا لیکن میرے فاضل دوست نے بیچ میں ٹانگ اڑا دی۔ شکر ہے کہ میں منہ کے بل نہیں گرا ورنہ کمرۂ عدالت میں گرنے والوں کا اٹھنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہوتا ہے۔"

میرے مدلل اور پُرمغز جواب کے جواب میں جج نے بہ آواز بلند کہا۔ "آبجیکشن اوور رولڈ۔ مسٹر بیگ! پلیز پروسیڈ فردر۔"

"گواہ یامین کی یادداشت اچھی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنے اور اصغر کے لباس کے بارے میں پوچھے گئے سوالات کے جو جو جوابات دیے، ان کی تصدیق اصغر کے بیان سے ہو گئی ہے لیکن......" میں نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک گہری سانس لی اور کہا۔ "لیکن ملزم کے لباس کے حوالے سے اس نے صریحاً غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ ملزم کا لباس اس کی یادداشت میں محفوظ نہیں رہا ہوگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ملزم جب وقوعہ سے ایک روز قبل یعنی سات فروری بروز ہفتہ دوپہر دو بجے مقتول سے جھگڑا کرنے آیا تو اس نے بھورے رنگ کا شلوار قمیص زیب تن کر رکھا تھا اور اس امر کی گواہی ملزم کا سسر شکور حسین اور اس کی فارمیسی میں کام کرنے والے سیلز مین بھی دے سکتے ہیں کیونکہ ملزم اپنے سسر سے ملاقات کرنے کے بعد ہی آستانے پر پہنچا تھا۔ آٹھ فروری یعنی اتوار کی سہ پہر ملزم نے جائے وقوعہ کا رخ کیا ہی نہیں لہٰذا گواہ یامین نے میرے استفسار کے جواب میں ملزم کے گزشتہ روز والے لباس کا ذکر کر دیا۔ اس قسم کی حرکات کو سیانے "نیت کا فتور" کہا کرتے ہیں جناب عالی!"

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے اس بات کا؟" وکیل استغاثہ نے جارحانہ لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"کس بات کا؟" میں نے معصومیت بھرے لہجے

میں جواباً پوچھا۔ "ملزم کے پہناوے کا یا اس کے جائے واردات پر آنے کا؟"

وہ بیزاری سے بولا۔ "دونوں ہی کا۔"

"ٹھیک ہے میرے قابل دوست!" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "آپ نے تو میرا کام آسان کر دیا ہے۔"

وکیل استغاثہ میرے آخری جملے پر بوکھلاہٹ آمیز نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی جج کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ میری بات کی گہرائی تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ اس گہرائی کو ناپنے کے لیے غوطہ خوری پر اتر آتا، میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے بولنا شروع کر دیا۔

"جناب عالی! میں عدالت کے حکم پر ملزم کے سرکل میں سے دو تین ایسے معتبر افراد کو گواہی کے لیے یہاں لا سکتا ہوں جو اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ملزم شلوار قمیص صرف اسی روز پہنتا تھا جب اسے اپنی ڈیوٹی پر نہیں جانا ہوتا تھا ورنہ اپنے کام پر وہ ہمیشہ جینز اور شرٹ پہنا کرتا ہے۔ سات فروری کو اس نے کام سے چھٹی کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ اپنے سسر سے مل کر وہ اسے شاکرہ کو سمجھانے کے لیے کہے۔ اسی لیے وہ براؤن شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ آٹھ روز یعنی اتوار آٹھ فروری کو وہ گزشتہ روز والی چھٹی کی کسر پوری کرنے کے لیے فیلڈ میں نکل گیا تھا اور اس نے گہرے رنگ کی نیوی بلیو شرٹ پہن رکھی تھی اور مزے کی بات یہ کہ..." میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے طنزیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

"وقوعہ کے روز ملزم دوپہر دو بجے سے شام چھ بجے تک اپنے ایک ساتھی سیلزمین عاصم نقوی کے ہمراہ کام میں مصروف تھا۔ انہوں نے لنچ ایک ساتھ کیا تھا اور شام کی چائے چھ بجے جائے واردات سے پانچ کلومیٹر دور ایک ایرانی ریسٹورنٹ میں پی تھی۔ میں اگلی پیشی پر اپنے صفائی کے گواہ عاصم نقوی کو عدالت میں پیش کرنے والا ہوں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے۔ ویٹس آل یور آنر!"

یاسمین اور اصغر کی گواہی کے بعد جرح میں میں نے اپنے موکل کی بے گناہی کے ذیل میں اہم دلائل بھی دے ڈالے تھے۔ اب استغاثہ کی اگلی گواہ مسز مقتول یعنی فائزہ غفور کی گواہی کی باری تھی لیکن عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف تین منٹ باقی رہ گئے تھے چنانچہ فائزہ کی گواہی کو اگلی پیشی تک موخر کرتے ہوئے جج نے عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

اس پیشی پر کل چار گواہوں کا نمبر لگا ہوا تھا۔ ایک میرے صفائی کے گواہ عاصم نقوی اور تین استغاثہ کے گواہان جن میں سرفہرست مقتول کا بیٹا ریحان شاہ، مقتول کی اہلیہ فائزہ غفور اور ملزم و مقتول کے ساتھ فروری والے جھگڑے کا عینی گواہ عبدالصمد۔ تاہم جب ان لوگوں کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا تو یہ ترتیب برقرار نہیں رہ سکی تھی۔

سب سے پہلے میں نے اپنے گواہ عاصم نقوی کو وٹنس باکس میں بلا کر عدالت کو یہ باور کرایا کہ مقتول کی موت کے وقت یعنی آٹھ فروری بروز اتوار سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان ملزم جائے واردات سے کئی کلومیٹر دور اپنے ساتھی عاصم نقوی کے ساتھ موجود تھا۔ میرے موکل کی جائے وقوعہ پر عدم موجودگی اس امر کی دلیل ہے کہ مقتول کی موت میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔

اس موقع پر وکیل استغاثہ نے صفائی کے گواہ پر کڑی جرح کر کے اسے اور اس کے بیان کو غلط ثابت کرنے کے لیے تن من کا وکیلانہ زور لگا ڈالا تھا لیکن مجال ہے کہ عاصم نقوی کے پائے استقامت میں ذرا سی بھی لرزش دیکھنے کو ملی ہو۔ الٹا اس نے یہ کہہ کر وکیل سرکار کو حیرت میں ڈال دیا تھا کہ اگر عدالت کا حکم ہوگا تو وہ نصف درجن ایسے کاروباری اشخاص کو گواہی کے لیے لے کر آ سکتا ہے جنہوں نے آٹھ فروری کی دوپہر اور سہ پہر اسے اور ملزم کو ایک ساتھ دیکھا تھا اور ان افراد میں اس ایرانی ریسٹورنٹ کا ایک معتبر ویٹر بھی شامل ہوگا جہاں وقوعہ کی سہ پہر انہوں نے چائے نوش کی تھی اور پانچ سے چھ بجے تک لگ بھگ ایک گھنٹا وہاں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے تھے اور یہ وہی وقت تھا جب ان دونوں سے کئی کلومیٹرز کی دوری پر مقتول غفور شاہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

وکیل استغاثہ نے صفائی کے گواہ سے بمشکل جان چھڑائی اور اپنے گواہ عبدالصمد کو گواہی کے لیے کٹہرے میں بلا لیا۔

عبدالصمد سات فروری کی دوپہر آستانے پر موجود تھا اور ملزم و مقتول کے بیچ ہونے والی لڑائی کا احوال اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وکیل استغاثہ اس کی گواہی سے محض یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس روز جھگڑے کے اختتام پر ملزم نے مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔

میرے خیال میں عبدالصمد کی گواہی بلاوجہ وقت اور جا ضائع تھی کیونکہ میرے موکل کی وہ جذباتی دھمکی عاصم نقوی

کے فراہم کردہ ماؤنٹ ایورسٹ سائز ملزم کی بے گناہی کے ثبوت کے سامنے رائی کے دانے سے زیادہ حیثیت کی حامل نہیں تھی لہٰذا میں نے گواہ پر وقت برباد کرنا مناسب نہ جانا اور دو سوالات میں اسے فارغ کر دیا۔

اگلا گواہ ریحان شاہ تھا۔ اسی جوان نے فون کر کے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ ریحان شاہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط، دراز قامت ایک کڑیل جوان تھا اور اسے مقتول کا بڑا بیٹا ہونے کا "اعزاز" بھی حاصل تھا۔

وکیل استغاثہ نے مختصر سی جرح کے بعد ریحان شاہ کو فارغ کیا تو میں اپنی باری پر وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا پھر اس کے چہرے پر نگاہ جما کر میں نے مصنوعی ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہارے باپ کی موت کا دلی افسوس ہے۔ میں ان کے قاتل کو منظر عام پر لانے کا خواہشمند ہوں۔ کیا تم میری خواہش پوری کرنے کے لیے کچھ مدد کر سکتے ہو؟"

میرے اس غیر متوقع سوال نے ریحان شاہ کو الجھا کر رکھ دیا۔ وہ بیزاری سے بولا۔ "کیا آپ مجھ سے اور میرے جذبات سے کھیل رہے ہیں؟"

"کورٹ روم کا یہ اکھاڑا اسی مقصد سے سجا ہے۔" میں نے گول مول الفاظ میں اس کے سوال کا جواب "ہاں" میں دیتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہو کیونکہ تم غفور شاہ کے قاتل کو اچھی طرح جانتے ہو۔"

"یہ آپ مجھ سے کس قسم کی جرح کر رہے ہیں۔" وہ جھگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ابا جی کا قاتل وہ سامنے کٹہرے میں کھڑا ہے اور آپ اسے بچانے کے لیے مجھ سے الٹے سیدھے سوالات کر رہے ہیں۔"

"اکیوزڈ باکس میں غفور شاہ کا قاتل نہیں بلکہ میرا بے گناہ موکل کھڑا ہے اس کی بے گناہی معزز عدالت کے علم میں آ چکی ہے۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

"عدالت کے علم میں آنے سے کیا ہوتا ہے۔" وہ تنک کر بولا۔ "ابھی اس کی بے گناہی ثابت تو نہیں ہوئی نا۔"

"میں بھی اسی کوشش میں لگا ہوا ہوں، ریحان صاحب!" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن تم تعاون کرنے کو تیار ہی نہیں ہو رہے۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ فوراً اپنے گواہ کی مدد کو لپکا۔ "وکیل صفائی استغاثہ کے گواہ کی سر عدالت بے عزتی

پبلک لائبریری

پبلک لائبریری میں ایک خاتون لائبریرین نے تہلکہ مچا رکھا تھا۔ ان کی شہرت سے مرعوب ہو کر ایک صاحب جنہوں نے رکنیت کا نیا نیا کارڈ بنوایا تھا، سیدھے کاؤنٹر پر پہنچے اور دریافت کیا۔ "کیا اس کارڈ پر میں کوئی کتاب لے سکتا ہوں؟"

"جی ہاں۔" خاتون لائبریرین نے جواب دیا۔

"محترمہ کیا میں رسالے اپنے نام جاری کرا سکتا ہوں؟"

"جی ہاں آپ یقیناً ایسا کر سکتے ہیں۔"

"کیا میں آپ کو کھانے پر مدعو کر سکتا ہوں؟"

خاتون نے ادھر ادھر دیکھا اور کاؤنٹر پر جھک کر کہنے لگیں۔ "جناب، لائبریرین بھی بیٹھ کر دیکھنے کے لیے ہے۔"

(مرسلہ: عدیل پاشا، کراچی)

گفتگو کے دوران

ہر دو اشخاص کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی بات پر ایک دوسرے سے متفق ہو جائیں۔ اس سلسلے میں دو شناساؤں کی گفتگو سنیے۔

"اتنا عرصہ کہاں رہے؟"

"میں اسپتال میں تھا۔"

"اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔"

"نہیں، بہت اچھا ہوا۔ میں نے وہاں ایک نرس سے شادی کر لی۔"

"اوہ، یہ تو بہت اچھا ہوا۔"

"نہیں، بہت برا ہوا۔ اس کے پہلے ہی نو بچے ہیں۔"

"اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔"

"نہیں، بہت اچھا ہوا۔ ایک بہت بڑا مکان اس کی ملکیت ہے۔"

"اوہ، یہ تو بہت اچھا ہوا۔"

"نہیں، بہت برا ہوا۔ چند روز قبل وہ مکان جل گیا۔"

"اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔"

"نہیں، بہت اچھا ہوا۔ وہ بھی بچوں سمیت مکان میں جل گئی۔"

"اوہ، یہ تو بہت اچھا ہوا۔"

"ہاں، یقیناً بہت اچھا ہوا۔"

(مرسلہ: ذریان سلطان، گلشن ظہور، کراچی)

کررہا ہے، یہ اخلاقی اصولوں کے منافی ہے۔"

"اگر کسی شخص سے تعاون کی درخواست کرنا کب سے بداخلاقی کے زمرے میں آنے لگا؟" میں نے وکیل مخالف سے سوال کیا۔ "خاص طور پر اس وقت جب کسی بے گناہ کی زندگی داؤ پر لگی ہو۔"

"میں تعاون کی درخواست کی بات نہیں کررہا۔" وہ جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا اشارہ اس امر کی جانب ہے جو آپ نے استغاثہ کے گواہ کو "ریحان یعقوب" کے نام سے پکارا۔"

"آپ بھی بڑی عجیب بات کررہے ہیں میرے فاضل دوست!" میں نے سلگانے والے انداز میں کہا۔ "سیب کو سیب نہیں تو کیا آم کہیں گے۔"

"جس طرح سیب، آم نہیں ہوسکتا، بالکل ویسے ہی ریحان غفور، ریحان یعقوب نہیں ہوسکتا اور آپ نے ابھی استغاثہ کے گواہ کو "ریحان یعقوب" کے نام سے پکارا ہے جو اس کی ولدیت کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔"

"یہ سب کیا چل رہا ہے؟" جج نے مجھ سے مخاطب ہوکر پوچھا۔ "آپ ریحان کو ریحان یعقوب کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"اس لیے جناب عالی کہ......!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "استغاثہ کے گواہ ریحان کے باپ کا نام یعقوب مغل تھا جو اب اس دنیا میں موجود نہیں۔ پتا نہیں لوگ مغل سے شاہ بننے کے لیے کیسی کیسی راہیں استعمال کرتے ہیں۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں..... بکواس کررہے ہیں۔" استغاثہ کا گواہ ایک دم تھے سے اکھڑ گیا۔ "میں بھری عدالت میں ثابت کرسکتا ہوں کہ میں مرحوم و مغفور غفور شاہ کی اولاد ہوں۔"

میں نے ایک خاص مقصد سے استغاثہ کے گواہ کو گرم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس مقصد میں مجھے خاطرخواہ کامیابی حاصل ہوچکی تھی۔ وہ اشتعال میں آچکا تھا اور ایسی حالت میں انسان لازمی غلطی کرتا ہے۔

"ثابت کرنا گواہ کا حق ہے۔" میں نے تحمل انداز میں کہا۔ "میں تمہاری پیشکش سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہوں گا۔ پلیز، پروو دا آئیڈینٹی۔"

"یہ رہا میرا آئیڈینٹی کارڈ۔" وہ اپنی جیب سے شناختی کارڈ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولا۔ "آپ خود دیکھ لیں میری ولدیت کے خانے میں کیا لکھا ہوا ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے وہ شناختی کارڈ لے کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور سپاٹ آواز میں کہا۔ "اس میں سے تو دھواں اٹھ رہا ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وکیل استغاثہ نے بے ساختہ کہا پھر جج سے مخاطب ہوکر فریادی لہجے میں بولا۔ "یور آنر! میرے فاضل دوست پتا نہیں کس قسم کا مذاق کررہے ہیں۔ انہیں عدالت کے قیمتی وقت کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہے۔ بھلا کسی شناختی کارڈ میں سے دھواں کیسے نکل سکتا ہے۔"

"میں نے دھواں اٹھنے والی بات محض شناختی کارڈ کے تازہ بہ تازہ ہونے کے لیے کہی تھی۔" میں نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "کیونکہ یہ کچھ عرصہ پہلے ہی بنوایا گیا ہے۔"

"تو آپ کو شناختی کارڈ کے تازہ بننے پر پریشانی ہے یا اس کے اندر گواہ کے والد کا نام یعقوب لکھا ہوا ہے؟" وکیل استغاثہ نے مجھے معاندانہ نظر سے گھورتے ہوئے استفسار کیا۔

"اس کارڈ کے مطابق ریحان کے ولدیت کے خانے میں تو غفور شاہ ہی لکھا ہوا ہے..... بلکہ لکھوایا گیا ہے لیکن میری پریشانی کا اصل سبب اس کا اجرا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کیونکہ یہ کارڈ کسی ایجنٹ کی مٹھی گرم کرکے غلط معلومات کے ساتھ بنوایا گیا ہے۔ جہاں پر یعقوب مغل کا نام ہونا چاہیے، وہاں غفور شاہ درج ہے اور یہی تبدیلی سارے فساد کی جڑ ہے۔"

"جناب عالی! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" فائزہ غفور اچانک اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "میں مرحوم غفور شاہ کی بیوی اور ریحان کی ماں ہوں۔ اپنے بیٹے کو مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔"

"بی بی! انہیں جو بھی کہنا ہے وہ وٹنس باکس میں آکر کہیں۔" جج کی سنجیدگی بردار آواز کمرۂ عدالت میں گونج گئی۔

فائزہ غفور بھی وٹنس باکس میں جاکر کھڑی ہوگئی۔ وکیل استغاثہ نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے میری کسی نامعلوم شکست کا جشن منا رہا ہو۔ میں نے اسے ستانے کے لیے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! آپ نے مقتول کی بیوہ کو وٹنس باکس میں بلاکر مجھ پر احسان عظیم کیا ہے۔"

"کیسا احسان؟" وکیل استغاثہ نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرے فاضل دوست! آپ کو مجھ سے شکوہ تھا کہ میں فضول باتوں میں الجھ کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کرتا

ہوں۔" میں نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "فائزہ غفور بی بی کے وٹنس باکس میں آجانے سے آپ کی یہ شکایت دور ہوجائے گی۔ میں ایک ہی وقت میں ان دونوں کو نمٹا کر عدالت کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچالوں گا۔ امید ہے میری بات آپ کی سمجھ میں ٹھیک سے بیٹھ گئی ہوگی۔"

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

جج نے اس کا مختصر بیان ریکارڈ کروایا پھر فائزہ سے پوچھا۔ "عدالت کو بتائیں کہ آپ ڈیفنس کونسلر سے کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"جناب عالی! میں اس بات کی تصدیق کرتی ہوں کہ ریحان میرا لخت جگر ہے۔"

"آبجیکشن یور آنر..... ناٹ ایٹ آل!" میں نے فوراً کہا۔ "میں نے یہ کب اعتراض کیا کہ ریحان، استغاثہ کی گواہ فائزہ کا بیٹا نہیں ہے۔ میں تو عدالت کے ریکارڈ پر حقیقت لانے کی سعی کررہا ہوں کہ ریحان کا باپ غفور شاہ نہیں بلکہ یعقوب مغل تھا۔"

"یااللہ.....! میں بیٹے سے پہلے مر کیوں نہیں گئی۔" فائزہ نے تڑپتے ہوئے دکھی لہجے میں کہا۔ "یہ وکیل تو میرے کردار پر کیچڑ اچھال رہا ہے۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے طیش کے عالم میں کہا۔ "ڈیفنس نے تو بداخلاقی کی ساری حدود پار کرلی ہیں۔ معزز عدالت کو اس سلسلے میں کوئی فوری اقدام کرنا ہوگا۔"

جج نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! آپ استغاثہ کی گواہ کے جواب میں کچھ کہنا چاہیں گے؟"

مجرم کے چھوٹے بھائی عارف محمود نے بڑی محنت اور کوشش کے بعد مجھے ریحان کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی تھیں۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے طور پر بھی اچھی خاصی ریسرچ کرلی تھی اسی لیے میں ہر لحاظ سے مطمئن اور پراعتماد تھا۔

"میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں جناب عالی!" میں نے مؤدب انداز میں گردن جھکا کر کہا۔ "لیکن پبلک پراسیکیوٹر مجھے موقع نہیں دے رہا۔ اگر میرے فاضل دوست چند منٹ کے لیے مجھے فری ہینڈ دے دیں تو میں وعدہ کرتا ہوں، آج میں اس کیس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر رہوں گا۔"

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ "مجھے ڈیفنس کے بولنے سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بس، جرح کے دوران میں یہ گواہ کی عزت کا لحاظ کریں۔"

"بیگ صاحب.....کیپ اٹ پلیز!" جج نے مجھ سے کہا۔

"مجھے غفور شاہ کی موت کا افسوس ہے۔" میں نے مقتول کی بیوہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ عدالتی کارروائی ہم سب کے سروں پر مجبوری کی تلوار کے مانند لٹک رہی ہے اس لیے سوال و جواب کے سلسلے کو روکا نہیں جاسکتا۔ اگر میری کوئی بات ناگوار خاطر گزرے تو معاف کردیجئے گا۔"

وہ عجیب سے معاندت بھرے لہجے میں بولی۔ "آپ سے بھلے کی امید رکھنا سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ آپ تو میرے سہاگ کے قاتل کو باعزت بری کروانے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"میں اپنے موکل کو اس لیے بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کررہا ہوں کہ یہ میری پیشہ ورانہ ڈیوٹی ہے۔" میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ "باقی جہاں تک آپ کے سہاگ کے اجڑنے کی بات ہے تو یہ پہلی بار تو نہیں ہوا۔ آپ ماضی میں بھی یہ صدمہ برداشت کرچکی ہیں۔ جب آپ کے پہلے شوہر یعقوب مغل کا قتل ہوا تھا لیکن قتل کی ان دونوں وارداتوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ....." میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں اضافہ کردیا۔ "یعقوب مغل کے قاتل کو اس وقت اس کی کم عمری کو پیش نظر رکھتے ہوئے چند سال کی سزا ہوئی تھی مگر غفور شاہ کا قاتل ابھی تک آزاد گھوم رہا ہے۔ حالانکہ وہ اب صغیر سن نہیں رہا..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا لیکن قدرے سنبھلتے ہوئے لہجے میں اس نے مجھ سے کہا۔

"وکیل صاحب! آپ کی بات میرے پلے نہیں پڑی۔"

"میری بات ابھی پتھر پر لکیر ہے لہٰذا اس میں تو سرمو تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ آپ کا بھلا اسی میں ہے کہ آپ شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے میری بات کو تسلیم کرلیں تاکہ یہ کیس اپنے منطقی انجام تک پہنچ جائے۔"

"آپ جو کچھ بھی بول رہے ہیں، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ کمال ڈھٹائی سے بولی۔

"ٹھیک ہے.....آپ کی مرضی۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"جناب عالی! اس وقت استغاثہ کا جو گواہ "ریحان

غفور" کے نام سے وٹنس باکس میں کھڑا ہے، یہ درحقیقت "ریحان یعقوب" ہے۔ فائزہ کے پہلے مقتول شوہر یعقوب مغل کا بیٹا جو کم عمری میں اپنے باپ کا قتل کر کے جیل چلا گیا تھا۔ یہ رہا اس کی سزا یافتہ زندگی کا ثبوت......"

میں نے اپنی فائل میں سے چند کاغذات کی نقول نکال کر جج کی جانب بڑھا دیں۔ یہ اہم کاغذات میں نے اپنی کوشش سے حاصل کیے تھے۔

جج نے مذکورہ کاغذات کا بغور جائزہ لینے کے بعد فائزہ سے استفسار کیا۔ "بی بی! کیا وکیل صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں؟"

وہ یکایک "نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن" ایسی صورتِ حال میں گھر گئی تھی لہٰذا بدقت تمام اس کے منہ سے نکلا۔

"ہاں، یہ بات درست ہے کہ ریحان اپنے باپ یعقوب مغل کو قتل کر کے جیل چلا گیا تھا لیکن وہ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد ہی پچھلے سال رہا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ میرے بیٹے کی آزادی سے ان وکیل صاحب کو کیا تکلیف ہے؟" اپنی بات کے اختتام پر اس نے انگلی سے میرے جانب اشارہ بھی کر دیا۔

"مجھے تکلیف تمہارے بیٹے کی آزادی سے نہیں بلکہ اس کے نئے نقلی شناختی کارڈ سے ہے۔" میں اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے "آپ" سے "تم" پر اتر آیا۔ "کیا تم اس بات سے انکار کر سکتی ہو کہ یعقوب مغل اکثر و بیشتر تمہیں زدوکوب کیا کرتا تھا اور باپ کا یہ ظلم بیٹے سے برداشت نہیں ہوا اسی لیے اس نے یعقوب مغل کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا؟"

"ہاں، یہ سچ ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "ریحان بچپن میں بہت حساس اور جذباتی ہوا کرتا تھا۔"

"یہ اب پہلے سے بھی زیادہ حساس اور جذباتی ہو چکا ہے۔" میں نے فائزہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اب اس کے پاس جوانی، طاقت اور جیل میں گزارے ہوئے بارہ دس سال کا تجربہ بھی ہے۔ اب اس کے لیے کسی ناپسندیدہ شخص کی جان لینا بہت آسان ہے۔ خاص طور پر کوئی ایسا ناپسندیدہ شخص جو اس کی ماں کو بری طرح ذلیل کرتا ہو اور...... اور وہ کسی اور خوبصورت عورت سے شادی کرنے والا ہو...... جس عورت کا نام "ش" سے شروع ہوتا ہو اور وہ اس کی عقیدت مند بھی ہو۔"

عارف محمود اور اس کی بیوی شازیہ، شاکرہ کے ساتھ مل کر طارق محمود کی رہائی کے لیے کوشاں تھے اور یہ تازہ ترین معلومات مجھے شاکرہ سے حاصل ہوئی تھیں۔

"ابے تو گھما پھرا کر کیوں بات کر رہا ہے۔" ریحان نے میری طرف دیکھتے ہوئے انتہائی بدتمیزی سے کہا۔ "سیدھی طرح بول کہ غفور شاہ میری ماں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا تھا اور...... اور وہ ملزم کی بیوی شاکرہ سے شادی کرنے والا تھا۔ وہ شاکرہ کو پوری طرح اپنے دام میں لا چکا تھا کہ بس......"

"بس یا ٹرک نہیں، ہاتھوں کی پکڑ اور جکڑ......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک بار پھر ماں کا دکھ تم سے دیکھا نہیں گیا۔ تم نے ریحان غفور کے نام سے اپنا نیا شناختی کارڈ بنایا تاکہ غفور شاہ کے بعد تم اس آستانے کے وارث بن جاؤ۔ تم نے بڑی چالاکی سے غفور شاہ کے مرید خاص یامین کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور اس کی بار ماں بھی تمہاری پشت پر کھڑی تمہارا ساتھ دے رہی تھی لہٰذا کسی بھی مرحلے پر تمہیں کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں، ریحان یعقوب؟"

"وکیل کے بچے! میں ابھی تجھے بتاتا ہوں۔" وہ کسی مشتعل سانڈ کے مانند وٹنس باکس سے نکل کر میری جانب بڑھا۔ "لگتا ہے تو بھی یعقوب اور غفور کے پاس جانے کا خواہشمند ہے۔"

قبل اس کے کہ وہ میرے نزدیک پہنچ پاتا، جج کے حکم پر متعلقہ عدالتی عملے نے اسے گرفتار کر لیا۔

میں نے بھری عدالت میں ریحان اور فائزہ کو بے نقاب کر دیا تھا۔ ان کے پاس فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔ اس موقع پر فائزہ نے بڑا جذباتی مگر احمقانہ بیان دیا۔

"ہم نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔ غفور شاہ ایک بھیڑیا، ایک دیوث تھا۔ اس کا ختم ہو جانا ہی ٹھیک تھا۔ ہم نے بھلائی کی نیت سے ایک بُرا کام کیا ہے۔ یہ ایک طرح سے نیکی کا کام ہے۔ عدالت ہمیں جو بھی سزا دے، ہمیں کوئی دکھ یا افسوس نہیں ہے۔"

عدالت انسانوں کے جذبات اور احساسات کی روشنی میں نہیں بلکہ حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کرتی ہے۔ میں نے اپنی اس کوشش سے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ میرا مؤکل بے گناہ تھا۔

اس واقعے سے سب سے زیادہ سبق شاکرہ نے حاصل کیا تھا۔ اس دن کے بعد سے اس نے کبھی کسی بغداد پیر فقیر کا رخ نہیں کیا۔

(تحریر: حسام بٹ)

یہ حادثہ جمعے کی دوپہر کو ہوا جب میں اپنی گاڑی میں بیٹھا گھر جا رہا تھا۔ سانتا ثریا فری وے پر ٹریفک تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں درمیانی لین میں گاڑی چلا رہا تھا۔ میری گاڑی پندرہ سال پرانی تھی۔ اس روز میں بہت خوش تھا کیونکہ میں نے ایک مشکل معاملہ حل کیا تھا۔ بدلے میں میرے پرس میں پانچ ہزار ڈالرز کا چیک تھا۔ یہ اچھی رقم تھی، ایک پرائیویٹ جاسوس کے لیے جو اپنے لیے کام کرتا ہے۔

کیلی فورنیا کے آسمان سے باہر فری وے پر سورج چمک رہا تھا۔ فری وے کا نام اب فری وے مرڈر پڑ گیا تھا کیونکہ پچھلے دو سالوں سے یہاں کوئی نہ کوئی ان دیکھی گولی کا شکار ہو جاتا تھا۔

ڈرائیونگ آئینے میں دیکھتے ہوئے میری نظر ایک چھوٹی سفید کار میں ایک نوجوان لڑکی پر پڑی جو میری گاڑی کے پیچھے تیزی سے آ رہی تھی۔ سرخ رنگ کی ایک کار اس کی

ایک ماہر قاتل کی مہارت اور قدرت کے انصاف پر ایک دلچسپ تحریر

بعض اوقات صیاد خود اپنے دام میں آجاتا ہے... کوئی کتنی ہی چالاکی سے منصوبہ سازی کرے، کہیں نہ کہیں کوئی سقم رہ ہی جاتا ہے... اس لیے نہیں کہ منصوبہ ناقص ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ نیت میں شامل فتور اسے مکمل اور مضبوط رہنے ہی نہیں دیتا... مفاد پرستی میں کچھ غلط ہونے کی وجہ سے کہانی میں کوئی نہ کوئی جھول رہ جاتا ہے... بس یہی نقطہ اس عقلمند کو سمجھ نہیں آیا تھا۔

چالاک

عاطر شاہین

کار سے قدرے پیچھے اور سائڈ پر تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میرے سامنے درمیانی لین میں جانا چاہتی ہے تاکہ میں اسے گزرنے دوں، اس لیے میں نے اپنی گاڑی کی رفتار کم کردی۔ میرے دائیں طرف گہرائی تھی۔ جب میں آئینے میں دیکھ رہا تھا تو میں نے ایک تیز آواز سنی۔

میں نے اپنی توجہ اپنے سامنے والی سڑک کی طرف موڑ دی۔ اچانک چھوٹی سفید گاڑی تیز لین میں واپس چلی گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کار اس لڑکی کے قابو سے باہر ہو رہی ہے۔ اگلے ہی لمحے سرخ کار اس سے ٹکرائی۔ سفید کار کا توازن بگڑا اور وہ دوسری لین سے ہو کر واپس اپنی لین میں آگئی۔ میں نے اپنی گاڑی کو روکنے کے لیے اپنے پیر کو سختی سے بریک پر رکھا۔ اس لمحے اچانک کہیں سے سبز رنگ کی مرسیڈیز نمودار ہوئی اور لڑکی کی گاڑی کی سائڈ سے ٹکرا کر اسے سڑک سے دور کر دیا۔ میرے پیچھے تمام کاریں رکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں نے ان کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی آوازیں بخوبی سنی تھیں۔

ایک لمحے میں یہ سب ختم ہو گیا۔ سڑک کے کنارے سے دھول کے بادل نے دکھایا کہ لڑکی کی گاڑی کہاں تھی۔ میں نے اپنی گاڑی سڑک کے کنارے چھوڑ دی اور سفید کار کی طرف بھاگا۔ میرے پیچھے اور بھی کئی لوگ تھے۔ لڑکی کا سر سائڈ والی کھڑکی سے گزر چکا تھا۔ وہ بے ہوش تھی اور اس کا چہرہ خون سے تر تھا۔ میں گاڑی کا دروازہ نہیں کھول سکا لیکن ایک آدمی نے اسے زبردستی کھول دیا اور لڑکی کو باہر نکالنے لگا۔

وہ چوبیس، پچیس سال کی لڑکی تھی، سیاہ بالوں اور سفید رنگت والی۔ میرے پیچھے کوئی مدد طلب کر رہا تھا۔ شاید اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسرے لوگ بھی اس حادثے میں زخمی ہوئے ہیں۔ سبز مرسیڈیز کا ڈرائیور پہلے ہی سڑک کے کنارے کھڑا ایمبولینس اور پولیس کو فون کر رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا۔ سرخ کار کا ڈرائیور ابھی وہیں کھڑا تھا، صدمے سے وہ بھی ہلنے سے قاصر تھا۔ میں نے کار سے نکلنے والے نوجوان کی طرف دیکھا جو لڑکی کی گردن پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔

”کیا یہ زندہ ہے؟“ میں نے اس سے دریافت کیا۔

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں۔ یہ زندہ ہے۔“

میں نے اسے لڑکی کے ساتھ چھوڑ دیا اور ٹوٹی ہوئی ٹانگ والے آدمی کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ پولیس اور ایمبولینس کے پہنچنے تک لوگوں کا ایک ہجوم [illegible] دیکھنے کے لیے رک چکا تھا۔ میں نے ایک [illegible] بریکٹ کو دیکھا جو مقامی اخبار کا فوٹو گرافر تھا [illegible] تصویریں بنا رہا تھا۔ پولیس بھی وہاں پہنچ چکی تھی [illegible] حادثے کے بارے میں لوگوں سے تفتیش کر رہی تھی۔ کچھ دیر میں لڑکی کو ایمبولینس میں وہاں سے لے جایا گیا۔ کچھ دوسرے ڈرائیوروں کے ساتھ مجھے بھی ایک پولیس افسر کو بتانا پڑا جو میں نے دیکھا تھا۔

جب میں نے اگلی صبح اخبار میں پڑھا کہ لڑکی مر گئی ہے تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ لڑکی کے بارے میں [illegible] کیرولین اسپریئر بائیس سال کی تھی۔ وہ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا سانتا باربرا میں اپنے آخری سال کی طالبہ تھی۔ وہ [illegible] سے آئی تھی۔ تصویر میں کندھے سے لمبے بال اور خوش گوار مسکراہٹ دکھائی گئی۔ میں نوجوان لڑکی کی موت اپنے سینے پر بھاری بوجھ کی طرح محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

شہر میں میرا دفتر پینٹ کیا جا رہا تھا، لہٰذا میں نے اگلے چند دن گھر پر کام کیا۔ وہ جمعرات کی شام تھی جب میرے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ بہرحال میں نے دروازہ کھولا۔ باہر موجود عورت کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ وہ ہو بہو حادثے میں مرنے والی لڑکی کیرولین اسپریئر کی ہم شکل تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ مرنے والی لڑکی دوبارہ زندہ ہو گئی ہے لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ یہ چالیس کی عمر کی ایک عورت تھی اور کیرولین اسپریئر کی ہم شکل تھی۔

”فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ میں نے مہذبانہ لہجے میں کہا۔

اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میں شیلا اسپریئر ہوں... کیرولین اسپریئر کی ماں۔“

”اوہ اچھا۔ اندر آجائیں۔“ میں نے کہا اور اسے اندر داخل ہونے کے لیے راستہ دیا تو وہ اندر آگئی۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ پہلے بول نہیں سکی، پھر آہستہ آہستہ بولنے لگی۔

”میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ جب میری بیٹی کیرولین اسپریئر کی کار حادثے کا شکار ہوئی تو تم بھی وہاں موجود تھے۔“

”آپ نے ٹھیک پڑھا تھا۔“ میں نے ہمدردانہ انداز میں سر ہلایا۔

”پولیس نے کیرولین کی گاڑی کی جانچ پڑتال کی ہے۔ سائڈ سیٹ کی طرف والی کھڑکی میں گولی کا سوراخ [illegible] میری بیٹی کو گولی لگی ہے۔“ یہ کہنے کے بعد وہ رونے لگی۔

میں بے اختیار چونک پڑا۔

”گولی؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ جب وہ [illegible] تو میں نے پوچھا۔ ”پولیس اس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟“

”وہ اسے قتل کہہ رہی ہے۔ جس افسر سے میں نے بات کی، وہ سمجھتا ہے کہ یہاں فری ویز پر موٹر ویز میں سے ایک پر پچھلے دو سال سے ہو رہے ہیں۔ ایک پاگل آدمی ہے جو کسی خاص وجہ سے گزرتی ہوئی کار پر گولی چلا دیتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔“

میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ ”کیرولین کیا کام کرتی تھی؟ کہاں جا رہی تھی؟“

”یونیورسٹی کے قریب ایک ریسٹورنٹ ہے۔ وہ ایک سال سے وہاں کام کر رہی تھی۔ منیجر نے مجھے بتایا کہ ایک آدمی کیرولین کو تنگ کر رہا تھا۔ وہ کیرولین کو دیکھنے ریسٹورنٹ میں بھی آتا تھا اور فون بھی کرتا تھا۔ کیرولین اس آدمی کی وجہ سے پریشان تھی۔ اس دن وہ منیجر کو کچھ بتائے بغیر ہی چلی گئی تھی۔ شاید اس سے دور ہونے کے لیے چلی گئی تھی۔“

”کیا کیرولین جانتی تھی کہ وہ شخص کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ وہ ہر ویک اینڈ پر گھر آتی تھی لیکن مجھے اس نے اس بارے میں کوئی بات نہیں بتائی تھی البتہ میں نے اسے پریشان ضرور دیکھا تھا۔ میں نے اسے کریدنے کی بھی بہت کوشش کی لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیفٹیننٹ ڈولن نے مجھے بتایا تم ایک پرائیویٹ جاسوس ہو اور میری بیٹی کے قاتل کو تلاش کر سکتے ہو اس لیے میں تمہارے پاس آئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم معلوم کرو کہ اس کی موت کا ذمے دار کون ہے۔ اسے کڑی سے کڑی سزا دلواؤ۔“

عام طور پر میں خود کو ان مقدمات سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہوں جن پر پولیس کام کر رہی ہوتی ہے۔ قتل کے مقدمات کے ذمے دار افسر لیفٹیننٹ ڈولن کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ وہ ویسے بھی مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا، اس لیے مجھے حیرت تھی کہ اس نے مسز اسپریئر کو میرے پاس بھیج دیا تھا۔

”اس نے کہا ہے کہ وہ قاتل کو تلاش کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں لیکن پرائیویٹ سراغ رساں قاتل کو تلاش کر سکتا ہے۔ مجھے اب واپس ڈیئر جانا ہے میرا شوہر بہت بیمار ہے لیکن میں تب تک نہیں جانا چاہتی جب تک میں یہ نہ جان لوں کہ میری بیٹی کی موت کا ذمے دار کون ہے۔“

کافی دیر سوچ بچار کے بعد میں نے ہامی بھر لی۔

”ٹھیک ہے، میں اس کیس پر کام کروں گا۔“

”شکریہ۔“ وہ ممنون لہجے میں بولی۔ ”میں تم سے ہر ممکن تعاون کروں گی۔“

وہ مطمئن ہو کر چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد میں پولیس اسٹیشن پہنچا جہاں میں نے پولیس رپورٹ کی ایک کاپی کے لیے پیسے ادا کیے۔ لیفٹیننٹ ڈولن اندر نہیں تھا، اس لیے میں نے ایمر اللہ سے بات کی جو ریکارڈ میں کام کرتا تھا۔

”میں اسپریئر حادثے کے بارے میں تھوڑی معلومات چاہتا ہوں۔“ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

”کیسی معلومات؟“ وہ انگلی میں قلم کو کسی تلوار کی طرح گھماتے ہوئے مستفسر ہوا۔

”کیا کسی نے دیکھا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی؟“ میں نے پوچھا۔

ایمر اللہ غصے میں نظر آیا۔ ”مسٹر ٹریک! تم جانتے ہو کہ مجھے اس طرح کی معلومات دینے کی اجازت نہیں ہے۔“

”ڈولن جانتا ہے کہ میں بھی اس کیس پر کام کر رہا ہوں۔ اس نے مسز اسپریئر کو میرے پاس بھیجا تھا۔“ میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ”اچھا ٹھیک ہے، تم مجھے صرف ایک نام بتا دو۔“

”ٹھیک ہے.... کون سا؟“ آہستہ آہستہ اس نے کچھ کاغذات نکالے۔

”اس سرخ کار والے ڈرائیور کا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اس کا نام اور ایڈریس درکار ہے۔“

ایمر اللہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر وہ کاغذات چیک کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سرخ کار کے ڈرائیور نے اپنا نام اور ایڈریس غلط بتایا ہے۔“

”اوہ۔ کیا تم نے چیک کیا؟“

”ہاں۔ میں نے اچھی طرح جانچ پڑتال کی ہے۔ اس نے اپنا نام مارشل بتایا ہے اور جو ایڈریس بتایا ہے اس ایڈریس پر اس نام کا کوئی شخص نہیں رہتا۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ گویا سرخ کار والے کا بھی اس حادثے میں ہاتھ ہے اور اس نے خود کو بچانے کے لیے غلط بیانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ دفعتاً میں نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی۔ ”تمہیں پولیس اسٹیشن دیکھ کر خوشی ہوئی ٹریک۔“ یہ لیفٹیننٹ ڈولن کی آواز تھی۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ پینٹ کی جیب میں تھے۔ میں مسکرایا۔

❁ عبدالرؤف.....مظفرگڑھ

تجھے تو شوقِ وفا ہے، مگر خدا کے لیے
میں کیا کروں گا اگر مجھ سے تُو خفا نہ رہا

❁ ڈاکٹر صابر.....پنڈی بھٹیاں

کسی کونپل کی آس میں اب تک ویسے ہی سرسبز ہو تم
اب تو دھوپ کا موسم ہے، برسات گزر گئی جاناں
اب تو فقط صیاد کی دلداری کا بہانہ ہے ورنہ
ہم کو دام میں لانے والی گھات گزر گئی جاناں

❁ آصف خان.....پاکپتن

اک اسی امید پہ ہیں سب دشمن دوست قبول
کیا جانے اس سادہ روی میں کون کہاں مل جائے

❁ [illegible].....اٹک

کبھی کبھی یہ پلکیں تیری، گرماتا روپ
تُو ہی بتا اوتار میں تجھ کو چھاؤں کہوں یا دھوپ

❁ آفتاب احمد وسیم.....منڈی بہاؤالدین

طلب زیادہ، رسد کم، معیشتِ دل میں
خوشیوں کی بھی قیمت گئی فغاں کی طرح

❁ منصور اقبال.....کراچی

عذاب کوئی بھی غرضِ فاختہ پکڑنے سے
جو گر گئی تو یونہی نیم جان چھوڑ گیا
نہ جانے کون سا آسیب دل میں بستا ہے
کہ جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا

❁ مشیر شگفتہ.....وہاڑی

آج تک مل نہ سکا اپنی تباہی کا سراغ
یوں ترے نامہ و پیغام کئی یاد آئے

❁ مبینہ راجا.....وہاڑی

ہے بہت شور سہی، کل تو کوئی پرکھے گا
ان صداؤں میں نصیبوں کی نوا اور سہی

❁ رانا شریف.....لاڑکانہ

کسی کی کھوج میں گھر کھو گیا کون
گلی میں روتے روتے سو گیا کون
جدھر دیکھوں کھڑی ہے فصلِ گریہ
مرے شہروں میں آنسو بو گیا کون

❁ زلفی ناز.....لاہور

ڈھال اب وقت کے ہاتھوں میں ہے لے تیر و تلوار
رکھ دے اک سمت کہاں، ہاتھ [illegible]
سونپ دے اپنا ہنر ان کو کہ جن کا حق ہے
وقت آیا ہے کہ اب سانپ خزانے سے اٹھے

❁ ایم افضل شہزاد.....فیصل آباد

بات تو تب ہے میرے حرف کو گونج کے ساتھ
کوئی اس لہجے کو بات پرانی سے

❁ عبدالرحیم عباسی.....حیدرآباد

جب مسافر کا ارادہ ہی بھٹکنے کا ہوا
اک چراغ اور سرِ راہ گزار کیا ہوا
اتنی مہلت ہے کہ میں مشک میں پانی بھر لوں
فاصلہ کم ہو تو پھر زادِ سفر کیا ہوا

❁ اللہ نواز راقی.....ڈیرہ اسماعیل خان

نامہ بر تو ہی بتا تُو نے تو دیکھے ہوں گے
کیسے ہوتے ہیں وہ خط جن کا جواب آتا ہے

❁ اکرم کمال.....حیدرآباد

وقت کی اتنی کمیں گاہوں سے ہو آئی ہے
زندگی! اب تو کسی طور سنبھل جانا ہے
وہ تو کہیے کہ کھلی آنکھ کہ نیند میں بھی
ورنہ ہم شب کا کوئی وار تو چل جاتا ہے

❁ حرا اطہر.....کراچی

آسیب کون سا ہے تعاقب میں شہر کے
گھر بن رہے ہیں، نقلِ مکانی بھی ساتھ ہے
ہجرت کا اعتبار کہاں ہو سکے کہ جب
چھوڑی ہوئی جگہ کی نشانی بھی ساتھ ہے

❁ پروین ناز.....سرگودھا

سانحہ پھر کوئی بستی میں ہوا ہے شاید
شام روتی ہوئی جنگل کی طرف آئی ہے

❁ الماس کامران.....کراچی

یوں مجھے بھیج کے تنہا سرِ بازارِ فریب
کیا مرے دوست مری سادہ دلی بھول گئے
میں تو بے حس ہوں مجھے درد کا احساس نہیں
چارہ گر کیوں روشِ چارہ گری بھول گئے

ادھوری واردات

خالد شیخ طاہری

لوٹ کے مال سے زندگی خوشگوار بنانے والوں کا حیرت انگیز احوال

مجبوریوں کے نام پر جرائم کی دلدل میں اترنے والے کوئی بھی یہ نہیں سوچتا کہ کب کسی کو اندھیروں میں منزل مل سکی اور اگر وہ بھی ایسا سوچ لیتا تو پھر ایسا کیسے ہو سکتا تھا جیسا ہوا... ادھوری خواہشوں کی طرح اس کی یہ آخری واردات بھی ادھوری ہی رہ گئی۔

کاشف بہت دیر سے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا، جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ چند لمحے ایسے ہی گزر گئے، پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے کے تاثرات نرم پڑتے گئے۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکراتے ہوئے، کمپیوٹر کا کی بورڈ اپنی جانب سرکایا اور جلدی جلدی ٹائپ کرنے لگا۔

"میرا بھی خوشیوں پر اتنا ہی حق ہے، جتنا دوسروں کا ہے۔ اس میں میرا کیا قصور کہ میں ایسے گھرانے میں پیدا ہوا، جہاں کھانا صرف اتنا ہوتا تھا کہ کھایا جا سکے اور پہنا جا سکے۔ یہی کیا زندگی ہوتی ہے، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترستے رہو۔"

جلیل اپنے گھر کے چھوٹے سے اسٹور روم میں گھسا، سامان کو ادھر ادھر کرتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ اسے اس ڈبے کی تلاش تھی جس میں اس کے باپ کا انگریزوں کے زمانے کا ریوالور رکھا ہوا تھا۔ [illegible] اس نے جیسے ہی ماں کے جہیز کے برتن ہٹائے، اس کی آنکھوں میں کامیابی کی چمک آگئی۔ سامنے ہی مطلوبہ ڈبا نظر آ رہا تھا۔ بہت دنوں سے وہ اس ڈبے کی تلاش میں تھا۔ [illegible] خود اس کے "اس ڈبے میں اس کا مستقبل بند ہے۔" اس نے احتیاط سے ڈبے کو باہر نکالا اور کمرے میں آکر ریوالور نکال کر اسے الٹ پلٹ کر کے

دیکھنے لگا۔ کچھ دیر دیکھنے کے بعد، کپڑا اٹھا کر صاف کرنے لگا۔ صاف کرتے کرتے وہ خیالوں میں ہی شہر کا سب سے بڑا ڈان بن چکا تھا۔ حالانکہ کسی کو کوئی مارنا تو دور کی بات، اس نے تو آج تک چھپکلی تک نہیں ماری تھی۔ باپ کی بھولی بسری تربیت نے اسے خیالوں سے نکالا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔

”ہاں تو..... ہر کام پہلی بار ہی کیا جاتا ہے۔ ضروری نہیں پہلی بار ہی کوئی بڑا ہاتھ ماروں، کچھ نہ کچھ پلان بنا کر ہی ہاتھ ڈالوں گا۔ اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ ڈنڈناتا ہوا کسی پر ٹوٹ پڑوں۔“ طنزیہ انداز میں وہ خود پر مسکرایا۔

”لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔“

اس کی گردن کبھی ہاں اور کبھی نہ کے انداز میں ہل رہی تھی۔

”شیر جو بھوکا ہو، کچھ تو کھائے گا۔“

بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ ریوالور صاف کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے مگر دماغ منصوبہ بندی میں لگا ہوا تھا۔ اس نے سر کو جھٹک کر اپنے خیالات کو دماغ سے نکال پھینکا اور ہاتھوں کی لرزش کو قابو کرنے لگا۔ ڈبے سے ملنے والی دو گولیاں ریوالور میں ڈالیں اور چیمبر گھما دیا۔

کاشف نے ایک نظر اپنے لکھے ہوئے صفحے پر ڈالی اور مطمئن ہو کر کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر دیا۔ اپنے بستر پر آ کر مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ پرسکون نیند سو چکا تھا۔

☆☆☆

کاشف کی زندگی گھریلو مسائل میں گھری ہوئی تھی۔ بیوی ناراض ہو کر میکے جا بیٹھی تھی۔ نوکری چھوٹ چکی تھی۔ باپ نے ورثے میں بس ایک مکان چھوڑا تھا جہاں وہ سر چھپائے بیٹھا تھا۔ جب تک نوکری ملتی، بچی کچی رقم سے گزارہ کر رہا تھا۔ فارغ بیٹھا، اپنے مستقبل کے لیے نہ جانے کیا کیا پلان بناتا، جب سوچ سوچ کر تھک جاتا، جھنجلا کر گھر سے نکل جاتا۔ مگر اب اس نے ایک مصروفیت ڈھونڈ لی تھی۔ اسے بچپن سے ہی لکھنے کا شوق تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ ایک کہانی لکھی جائے۔ وہ سارا دن اپنی کہانی کو ذہن میں پاتا، الفاظ ترتیب دیتا اور رات کو لکھنے بیٹھ جاتا۔ اب بھی رات کے کھانے کے بعد صحن میں لیٹا وہ اپنی کہانی کے تانے بانے بن رہا تھا۔ اچانک چائے کے ابل جانے کی آواز سن کر چونک گیا۔ بھاگ کر باورچی خانے میں پہنچا اور چولہا بند کر دیا۔ چائے کپ میں ڈال کر وہ کمپیوٹر کے سامنے آ بیٹھا اور لکھنا شروع کر دیا۔

غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے لوگوں کے بے شمار مسائل ہوتے ہیں جن میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں ایمانداری اور شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں وہ کسی کام کے نہیں ہوتے ہیں، وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

”جنید کے باپ نے بھی اپنی ساری زندگی ایمانداری اور شرافت کے گنے بندھے اصولوں پر گزار دی۔ جنید اپنے باپ کی نصیحتیں سر جھکا کر سنتا رہتا اور یہ ظاہر کرتا، جیسے وہ اپنے باپ کی نصیحت اپنے پلے باندھ رہا ہے، مگر بعد میں ان کا مذاق اڑاتا اور … ہی سوچنے لگا تھا۔ بیمار ماں، باپ کا سبزی کا ٹھیلا … ہفتے کے چھ دن تو سبزی کھانے … اور ایک دن دال یا چاول۔ گوشت مہینے میں ایک آدھ بار ہی … ہی وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترستا … سے اس کے ذہن میں منفی خیالات جنم لینے لگے تھے۔ جب جنید پیدا ہوا، ماں کی … بیماری کی وجہ سے … کرنے سے محروم ہو گئی تھی۔ زچگی کے بعد ہی اس کے … سارا انتظام نکالنا پڑا، جب جا کے اس کی ماں کی زندگی بچی تھی لیکن وہ ہمیشہ کے لیے ہی بیمار ہو گئی۔ جب تک جنید کا باپ زندہ تھا، پیٹ کاٹ کاٹ کر بیوی کی دوا پوری کرتا اور جنید کی پڑھائی کا خرچ بھی پورا کرتا۔ اس کا باپ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بھی غربت کی زندگی گزارے مگر جنید … ماحول میں … پسند کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا، جو بڑے لوگ ہوتے ہیں ان کی زندگی معتدل ہوتی ہے۔ ان کے جینے میں … ہوتا ہے۔ یہ لوگ بڑے شاپنگ مال میں ہزاروں روپے خرچ کر کے شاپنگ کرتے ہیں، پھر کسی شاندار ہوٹل میں کھانا کھا کر بل خوشی خوشی ادا کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی اتفاق سے کسی غریب ٹھیلے والے سے کوئی چیز خریدنی پڑ جائے تو مول تول شروع کر دیتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی تو یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ”تم ٹھگی کر رہے ہو۔“

جنید اس ماحول سے نکلنا چاہتا تھا۔ گھر کے حالات دیکھ کر وہ میٹرک کے بعد ہی بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگا، جس سے کچھ نہ کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ جب تک ہمت رہی جنید کی ماں نے گھر سنبھالا، جب بالکل بستر سے لگ گئی، تو جنید کی شادی کر دی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی جب باپ کا انتقال ہوا تو گھر چلانے اور ماں کی دوا کے لالے پڑ گئے۔ جب باپ کا انتقال ہوا اس وقت جنید اٹھارہ سال کا ہی تو تھا۔ حالات ایسے بگڑے کہ ماں جو اٹھارہ سال سے بیماری سے لڑ رہی تھی، آخرکار ہمت کے ساتھ ساتھ زندگی بھی ہار بیٹھی۔ جنید چاہتا تو باپ کا ٹھیلا سنبھال سکتا تھا مگر وہ ہمیشہ سے ہی اس کام میں شرم محسوس کرتا تھا۔ باپ نے بھی کبھی اس پر زور نہیں دیا تھا۔ آج

ہوتا ہے کہ ان کا بیٹا کسی دفتر میں بابو لگ جائے، مگر اس کی … قسمت نے یہ خواہش پوری نہیں ہونے دی۔ مگر جنید اپنی اور سکینہ کی ہر خواہش پوری کر کے اپنے آنے والے بچے کو اس غربت کی دلدل سے نکال کر ایک اچھی زندگی دینا چاہتا تھا جس کے لیے اس نے ایک طریقہ اپنانے کا سوچا جس کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ باپ کا ریوالور نکالنا ہی اس طریقے پر عمل کرنے کا پہلا قدم تھا۔ دو دن کی سوچ بچار کے بعد وہ ریوالور ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔“

ایک پیراگراف لکھنے کے بعد کاشف کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری تھی۔ اس نے فائل سیو کی اور ایک لمبا سانس لے کر دوسرا فولڈر کھولا جس میں اس کی شادی کی تصاویر تھیں۔

☆☆☆

حسنین کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی۔ عالیہ آئینے کے سامنے تیار ہو رہی تھی۔ ایک تو رات بارہ بجے ہی کیک کاٹا جا چکا تھا … کمرے میں … کھانا کھانے کے لیے جانے والے تھے۔ حسنین … باہر کھانا کھانے کا کہہ کر گیا ہوا تھا۔

کہتے ہیں زیور عورت کی کمزوری ہوتے ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہو، کچھ زیور خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، جو وہ خاص موقعوں پر ہی پہنتی ہے۔ عالیہ بھی … ایک … تھی، مگر ہر عورت … اس کی بھی کمزوری تھے۔ وہ تقریباً تیار ہو چکی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑی اپنا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی۔ گلے میں بڑے خوبصورت ہار کو سیٹ کیا اور … کنگن اٹھا لیے، جو اسے سب زیورات میں بہت زیادہ عزیز تھے۔ یہ کنگن اسے حسنین نے شادی کی پہلی رات منہ دکھائی میں بطور تحفے میں دیے تھے۔ کنگن تھے بھی بہت خوبصورت، چاروں طرف چھوٹے چھوٹے اور درمیان میں تھوڑے بڑے نگینوں زرقون لگے ہوئے تھے، جو ان کنگنوں کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ جب روشنی میں چمکتے تو لگتا ہر طرف ستارے سے جگمگا اٹھے ہوں۔ … بڑے چاؤ سے انہیں اپنی کلائیوں میں چڑھایا اور … کر دیکھنے لگی، پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز سے اپنے خیالات سے نکل آئی، گھوم کر دیکھا تو حسنین اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”ارے تم ابھی تک تیار ہی ہو رہی ہو؟“ حسنین آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

”بس ہو گیا تیار، بس آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“ عالیہ [illegible] اپنا پرس اٹھانے لگی۔ جیسے ہی پرس اٹھا کر مڑی حسنین سے ٹکرا گئی، جو اس کے بالکل قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”اوہ.... سوری....“ عالیہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

لیکن جب اس کی نظر حسنین کے مسکراتے ہوئے چہرے پر پڑی تو فوراً دور ہو گئی، کیونکہ حسنین کی شکل میں شرارت کا عنصر نمایاں تھا۔ اس کے ارادے بھی خطرناک لگ رہے تھے۔ عالیہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ لپ اسٹک دوبارہ لگائے جو اس نے بڑی مہارت سے لگائی تھی۔

”ہاہاہا....“ عالیہ کے اس طرح گھبرا کے دور ہونے پر حسنین کا قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا۔

”بہت بدتمیز ہیں آپ، چلیں دیر ہو رہی ہے۔“ عالیہ شرماتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

کی بورڈ کی ٹک ٹک پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ کاشف کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔

”شہر قائد کی شاموں کا منظر بھی ایک دلفریب نظارہ ہوتا ہے۔ ایک طرف سورج دن بھر کا تھکا ہارا سمندر میں ڈوب رہا ہوتا ہے تو دوسری جانب شہر میں بھاگتی دوڑتی زندگی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے پورا شہر ہی سڑکوں پر نکل آیا ہو۔ ہر کوئی اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی میں ہوتا ہے، جس کی وجہ سے کہیں ٹریفک جام تو کہیں فٹ پاتھوں پر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی جستجو کرتے عوام نظر آتے ہیں۔ انہی فٹ پاتھ پر چلنے والوں میں جنید بھی شامل تھا، جو ایک ہاتھ سے اپنے آگے جانے والے لوگوں کو دھکیلتے ہٹاتا اور اپنی جگہ بنا کر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ تین بجے گھر سے نکلا تھا اور پیدل ہی اپنے علاقے سے نکل کر دوسرے علاقے میں پہنچ چکا تھا۔ یہ بھی اس کے پلان کا ایک حصہ تھا کہ وہ اپنی پہلی واردات اپنے گھر سے بہت دور علاقے میں کرنا چاہتا تھا۔ اب وہ بھیڑ سے نکل کر ایک چوک پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کس طرف جائے۔ رات ہونے میں ابھی بہت دیر تھی، گرمیوں کے دن تھے۔ قریبی مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ اسے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ اس نے سڑک کراس کی اور فٹ پاتھ پر رکھے ایک کیبن نما دکان سے چائے لے کر وہیں بیٹھ کر پینے لگا۔ وہ بار بار پینٹ پر ہاتھ رکھ کر ریوالور کی موجودگی محسوس کرتا اور چائے کا کپ منہ سے لگا لیتا۔ چائے پی کر وہ وہیں بیٹھا آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ کافی وقت گزار کر جب وہ اٹھا تو لوگ … جانے والے تھے۔ وہ چلتا ہوا اس سڑک کی جانب بڑھنے لگا، جہاں فاسٹ فوڈ کے ٹھیلے لگے

خوبصورت ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ وہ چلتا ہوا پارک کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ہوٹلوں میں آنے والے اپنی گاڑی سڑک کے کنارے پارک کرتے اور اپنے مطلوبہ ہوٹل میں داخل ہو جاتے۔ جنید دیوار سے ٹیک لگائے، آتے جاتے لوگوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک کار پر پڑی، جو اس کے سامنے سے گزر کر سو قدم کے فاصلے پر جا کر سڑک کے کنارے پر رک گئی۔ جنید کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ اس نے اپنا شکار منتخب کر لیا تھا کیونکہ اس کا شکار اپنے ریکارڈ کے اس کے پلان کے مطابق تھا۔ وہ وہیں کھڑے ان کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔" آج کاشف نے اپنی کہانی کا یہ حصہ بہت سوچ سمجھ کر لکھا تھا کیونکہ اس کی کہانی بہت دلچسپ موڑ پر پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆

حسنین زیادہ امیر کبیر تو نہیں تھا۔ فیملی بھی چھوٹی سی تھی۔ ایک بہن تھی، جو بیاہ کر امریکا چلی گئی تھی۔ ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ورثے میں ایک مکان اور دکان ملی تھی۔ دکان تو حسنین نے خوب اچھے سے سنبھالی ہوئی تھی اور مکان کرائے پر دے رکھا تھا۔ حسنین شادی کے بعد دوسرے علاقے میں شفٹ ہو گیا تھا جو پہلے والے علاقے کی نسبت زیادہ صاف ستھرا تھا لیکن دکان وہیں تھی۔ حسنین اور عالیہ کی زندگی بہترین اور پُرسکون گزر رہی تھی۔ وہ دونوں ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوٹل سے باہر نکلے اور سڑک کراس کر کے جیسے ہی اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے لگے۔ اچانک ایک دبلا پتلا سا نقاب پوش نوجوان نمودار ہوا اور حسنین کے پہلو میں کھڑے ہو کر پستول کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔

"شور کیا تو گولی مار دوں گا۔" نوجوان کی دھمکی تو سخت تھی، مگر لہجہ دھمکی کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ حسنین اور عالیہ دونوں چونک کر رک گئے۔ عالیہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے حسنین کے پہلو میں کھڑے نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔

"خاموشی سے جو کچھ ہے، اس شاپر میں ڈال دو ورنہ...." نقاب پوش نوجوان ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا اور ہاتھ میں پکڑا شاپر دونوں کے آگے کر دیا۔

حسنین نے جب عالیہ کی حالت دیکھی تو آنکھوں کے اشارے سے پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا اور اپنا موبائل اور پرس جیب سے نکال کر شاپر میں ڈال دیا۔

نوجوان حسنین کے ساتھ اس طرح لگ کر کھڑا تھا کہ آنے جانے والوں کو پستول نظر نہ آئے۔

"میرے پاس بس یہی تھا۔" [illegible]

حسنین نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"بھابی آپ بھی اپنا موبائل اور [illegible] شاپر میں ڈالیں۔" حسنین نوجوان کا مہذب لہجہ سن کر حیرت سے [illegible] دیکھنے لگا اور سوچنے لگا یہ نوجوان یقیناً کوئی اناڑی [illegible] سے الجھنا کسی بھی طرح عقلمندی کے زمرے میں نہیں [illegible] جانتا تھا اناڑی ڈاکو، ماہر ڈاکو سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے [illegible] گھبرا کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ عالیہ نے سوالیہ نظروں سے [illegible] کی طرف دیکھا۔

"دے دو....! جو مانگ رہا ہے۔" حسنین نے [illegible] کہا تو عالیہ نے اپنا موبائل اور پرس بھی شاپر میں ڈال دیا۔

"اور یہ ہار اور کنگن بھی ڈالیں، جلدی۔" نوجوان نے پستول حسنین کے پہلو میں چبھوتے ہوئے کہا۔

"ڈال دو۔" حسنین نے جب عالیہ کو پس و پیش کرتے ہوئے دیکھا تو قدرے غصے سے بولا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ ڈراما جلد از جلد ختم ہو۔

عالیہ روہانسی ہو رہی تھی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ہار اور کنگن اتار کر شاپر میں ڈال دیے اور رونے لگی۔ جیسے ہی عالیہ کا ہاتھ شاپر سے دور ہوا نوجوان نے حسنین کو عالیہ کی طرف دھکا دیا اور جس طرح اچانک نمودار ہوا تھا اسی طرح اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ حسنین نے آگے بڑھ کر عالیہ کو اپنے ساتھ لگا لیا جو اب باقاعدہ رونے لگی تھی۔

☆☆☆

کاشف کی کہانی دلچسپ انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کی کہانی کے کردار نے اپنی پہلی واردات کامیابی سے انجام دے ڈالی تھی۔ کاشف کے لیے اب آگے لکھنا مشکل لگ رہا تھا مگر کاشف اپنی کہانی کو منطقی انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ تین دن گزر چکے تھے، اسے اپنی کہانی کو ترتیب دیتے ہوئے۔ وہ اس وقت رات کا کھانا کھا کر ہوٹل میں بیٹھا کہانی کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے، اچانک اس نے کاؤنٹر پر کھانے کا بل دے کر گھر آ گیا اور اپنے کمرے میں پہنچ کر کمپیوٹر آن کر کے کی بورڈ پر اپنی انگلیاں چلانے لگا۔ اب کاشف کی کی بورڈ کی ٹک ٹک بھی تیز ہو گئی تھی۔ وہ لکھنے لگا۔

"جنید کامیاب واردات کے بعد جب گھر پہنچا تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔ اس نے سارا سامان جب اپنے بستر پر منتقل کیا تو اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے جلدی جلدی پیسے گنے۔ بیس ہزار کے کرنسی نوٹ دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ باقی سامان دیکھ کر خوشی کے مارے

اس کی بھوک ہی مٹ گئی تھی۔ حالانکہ اس نے صبح گیارہ بجے ناشتا کیا تھا اور شام کو بس چائے پی تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ بستر پر لیٹا تو ہزار ہزار کے نوٹوں اور دیگر سامان کے ساتھ اس کی نیند بھی اڑ چکی تھی۔ ان کو کیسے اور کب اپنے استعمال میں لائے۔ یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔"

کاشف اتنا لکھ کر کچھ سوچنے لگا جیسے وہ کچھ یاد کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے ایک لمبی سانس لی اور دوبارہ لکھنے لگا۔

"جنید بہت احتیاط سے رقم خرچ کر رہا تھا۔ کچھ دن تک وہ پہلوان کے ہوٹل تک جاتا اور کھانا کھا کر واپس اپنے گھر آ جاتا۔ تیسرے دن کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ باقی سامان کا کیا کرے، جو اسے کسی بھی وقت مصیبت میں پھنسا سکتا ہے۔ سامان کو ٹھکانے لگانے کا پلان بنا کر وہ مطمئن ہو گیا۔ واردات تو وہ کامیابی سے کر چکا تھا، مگر ابھی ایک مرحلہ باقی تھا، جو اسے اپنے پُراعتماد رویے سے سر کرنا تھا۔ یہی مرحلہ سب سے مشکل تھا جو اسے کافی عرصے تک مالی پریشانیوں سے بچا سکتا تھا۔"

کاشف کی انگلیاں جب کی بورڈ سے اٹھیں تو وہ اپنی کہانی سے کافی حد تک مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کی کہانی آہستہ آہستہ اپنے منطقی انجام تک پہنچ رہی تھی۔ کاشف چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ اس کہانی کو جلد از جلد مکمل کر دے۔

☆☆☆

عالیہ کے آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ گھر پہنچ کر حسنین نے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ اسے اس سے اچھے اور خوبصورت ہار اور کنگن لا کر دے گا۔ عالیہ کے پاس زیورات کی کمی نہیں تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی سیٹ اس کے پاس موجود تھے، مگر حسنین جانتا تھا کہ وہ کنگن عالیہ کے لیے کتنے قیمتی تھے... وہ کر بھی کیا سکتا تھا، سوائے دلاسا دینے کے۔ حسنین کے سمجھانے پر عالیہ نے رونا تو بند کر دیا، مگر اس کے چہرے پر دکھ اور ملال صاف نظر آ رہا تھا۔ دونوں نے اس رات کو خوبصورت بنانے کے لیے کیا کیا سوچا تھا، سب دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ عالیہ کو منانے اور کھانے میں رات کے تین بج گئے تھے لیکن نیند دونوں کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ عالیہ اپنے کنگنوں کے غم میں جاگ رہی تھی اور حسنین عالیہ کو پریشان دیکھ دیکھ کر جاگ رہا تھا۔ [illegible] کی بات دونوں کو اس حال میں پہنچانے والا [illegible] کی نیند سو بھی چکا تھا۔

"واقعے کو گزرے چار دن ہو چکے تھے۔ حسنین دکان کے لیے نکل چکا تھا۔ عالیہ ماسی کو کام سمجھا کر ابھی اپنے کمرے میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ ڈور بیل بج گئی۔ وہ کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی تو ماسی دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ عالیہ وہیں کھڑی دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔ ماسی واپس آئی اور عالیہ کو کھڑے دیکھ کر کہنے لگی۔

"بیگم صاحب! وہ باہر ڈاک خانے والا آیا ہے، کہہ رہا ہے صاحب کو بلاؤ.... کوئی تحفہ آیا ہے۔"

"اچھا.... میں دیکھتی ہوں.... تم اپنا کام کرو۔" عالیہ کو حیرت ہو رہی تھی کہ حسنین کی ڈاک ہمیشہ دکان کے پتے پر جاتی ہے، گھر کے پتے پر کس نے بھیج دی۔ یہ سوچتی ہوئی وہ دروازے تک پہنچ گئی۔

"جی بھائی! حسنین تو گھر پر نہیں ہیں، اگر کوئی

کھلاڑی

کرکٹ کے کھلاڑی نے ڈاکٹر سے کہا۔ "میں ایک عجیب مرض میں مبتلا ہوں۔ ہر وقت سر چکراتا رہتا ہے، نہ مجھ سے رن بنتے ہیں اور نہ مجھ سے باؤلنگ کی جاتی ہے۔ فیلڈنگ کرتے وقت میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ کیچ کے وقت بال نظر نہیں آتی۔ بتایئے ڈاکٹر صاحب میں کیا کروں؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "تمہارے مرض کا ایک ہی علاج ہے۔ کرکٹ کھیلنا چھوڑ دو۔"

"ناممکن!" کھلاڑی بولا۔ "مجھے تو اب قومی ٹیم میں شامل کیا جا چکا ہے۔"

....

کراچی کے ایک دفتر میں کام کرنے والے ایک کلرک صاحب کی آواز پہلے ہی کافی اونچی تھی اور جب وہ فون پر کسی پر ناراض ہوتے تھے یا بحث میں الجھتے تھے تو اور بھی زیادہ زور زور سے چلانے لگتے تھے۔ ایک روز وہ اسی طرح چلا رہے تھے کہ آواز جنرل منیجر صاحب کے کمرے میں بھی پہنچ گئی۔ جی ایم صاحب نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور پوچھا "یہ کون صاحب چلا رہے ہیں؟"

"سر! یہ منصور صاحب لاہور بات کر رہے ہیں۔" چپراسی نے بتایا۔

"تو یہ کمبخت فون کیوں نہیں استعمال کرتے؟ آخر یہ فون کس لیے لگوائے ہیں؟" منیجر صاحب غصے سے بولے۔

ڈاک ہے تو میں وصول کر لیتی ہوں۔ میں ان کی واقف ہوں۔" عالیہ نے دروازے کی اوٹ سے کہا۔

"یہ پارسل ہے.....اور اس جگہ پر دستخط کر دیں۔" کوریئر والے نے پارسل، پین اور ایک کاغذ عالیہ کی جانب بڑھا دیا۔

عالیہ نے دروازے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آتے ہوئے پارسل کو پکڑا اور کاغذ پر دستخط کر کے واپس کوریئر والے کو دے دیا۔ عالیہ پارسل لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ چھوٹا سا پارسل تھا۔ عالیہ نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا تو نیچے ایک مشہور شاپنگ مال کا ٹیگ لکھا ہوا تھا۔ عالیہ نے پارسل یہ سوچ کر ایک طرف رکھ دیا کہ ہو سکتا ہے حسنین نے کوئی چیز منگوائی ہو۔ عالیہ نے اپنا چھوٹا والا موبائل نکالا، جو حسنین نے پرسوں ہی لا کر دیا تھا اور حسنین کو کال کرنے لگی۔

☆☆☆

حسنین کی دکان اس کے پرانے علاقے کے بازار میں تھی۔ حسنین نے صرف اپنے آئی ڈی کارڈ کے گم ہونے کی ایف آئی آر درج کروائی تھی اور کریڈٹ کارڈز عارضی طور پر بند کروا دیے تھے۔ حسنین جانتا تھا کہ تھانے میں اصل بات بتانے میں اسے کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ جاتا۔ اس نے یہ بات صرف اپنے دوست انسپکٹر ذیشان کو ہی بتائی تھی اور شکایت کرنے سے بھی منع کر دیا تھا کیونکہ اس کا نقصان اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا۔ بس عالیہ کے کنگن اور ہار عالیہ کے جذبات کی وجہ سے قیمتی تھے۔ ورنہ حسنین اس سے بڑھ کر خوبصورت ہار اور کنگن عالیہ کو دے سکتا تھا۔ آج جب وہ اپنی دکان کے اندر بنے اپنے چھوٹے سے آفس میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ عالیہ کی کال آ گئی۔ عالیہ نے جب اسے کسی پارسل کا بتایا تو اسے خود بھی حیرت ہوئی۔ 'شام کو پتا چل جائے گا۔' یہ سوچ کر وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ شام کو جب گھر پہنچا تو اس کے دماغ سے پارسل والی بات نکل چکی تھی۔ چائے پینے کے بعد جب عالیہ نے پارسل اس کے سامنے رکھا تو وہ چونک گیا۔ اس نے پارسل اٹھا کر دیکھا اور سرسری انداز میں بڑبڑایا۔ "کیا ہو سکتا ہے؟" اور پھر پارسل کھولنے لگا۔ عالیہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ پارسل کھولتے ہی جب اندر سے چیزیں باہر نکلیں تو وہ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اندر دونوں کے موبائل اور پرس رکھے ہوئے تھے۔ حسنین نے جلدی سے اپنا پرس اٹھا کر دیکھا تو ایک اور حیرت کا جھٹکا لگا۔ سوائے رقم کے سب چیزیں جوں کی توں موجود تھیں۔ عالیہ نے اپنا پرس نکالا اور اسے چیک کیا تو وہ بھی اسی حالت میں تھا جیسا تھا۔ پھر عالیہ اور حسنین نے اپنا اپنا موبائل اٹھایا اور آن کر کے چیک کرنے لگے۔ موبائل میں بھی تصویریں اور ویڈیوز اور دوسری چیزیں محفوظ تھیں۔ عالیہ نے جلدی سے پارسل اٹھایا اور اندر ہاتھ مارنے لگی اور پھر اسے الٹا کر کے جھاڑنے لگی۔ عالیہ کی بے قراری دیکھ کر حسنین سمجھ گیا کہ وہ کیا تلاش کر رہی ہے۔ عالیہ کی جب پارسل سے اور کچھ نہیں نکلا تو اس نے غصے سے اسے دروازے کی جانب پھینک دیا۔

"ارے.....ہم اپنی ملکہ عالیہ کے لیے ویسے ہی ہار اور کنگن بنوا دیں گے، بلکہ ان سے خوبصورت۔" حسنین نے جب عالیہ کا موڈ خراب ہوتے دیکھا تو فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کے رومانٹک انداز میں بولا۔

عالیہ نے نم دیدہ نظروں سے حسنین کی طرف دیکھا۔ حسنین نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اقرار کے انداز سے گردن ہلائی اور عالیہ کو اپنے قریب کر لیا۔

☆☆☆

جب سے کاشف نے کہانی لکھنا شروع کی تھی عادت کے مطابق ہمیشہ رات کو لکھتا تھا مگر آج تین گھنٹوں کے بعد وہ صبح سویرے ہی اٹھ گیا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد اس نے کمپیوٹر آن کیا اور اپنی کہانی کا اختتام لکھنا شروع کر دیا۔

"بس دن تو جنید نے خوب کمائی کرتے ہوئے گزارے۔ جب پیسے ختم ہونے لگے، تو باقی سامان بیچنے کا خیال آیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ سامنے رکھا سامان بیچ کر وہ کوئی بھی چھوٹا موٹا کاروبار کر سکتا ہے۔ پلان کے مطابق اس نے ایک کپڑے کے تھیلے میں سامان رکھا اور بس میں ڈیڑھ گھنٹے سفر کر کے اپنے علاقے سے دور بازار میں ایک دکان پر پہنچ گیا۔ جنید کی قسمت اچھی تھی۔ اس وقت دکان میں کوئی گاہک نہیں تھا۔

"السلام علیکم!" دکان میں داخل ہو کر جنید نے کاؤنٹر پر بیٹھے ایک گنجے سے دکاندار کو سلام کر کے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

"وعلیکم السلام.....جی جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" دکاندار نے کاروباری لہجے میں سلام کا جواب دے کر اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور رسمی سا ہاتھ ملا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"جناب..... یہ کچھ میری خاندانی چیزیں ہیں۔ میں انہیں بیچنا چاہتا ہوں۔ ان کی رسید تو گھر شفٹ کرنے میں نہ جانے کہاں گم ہو گئی ہے۔" جنید نے اپنے لہجے میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا اور کپڑے کا تھیلا کاؤنٹر پر رکھ کر کھول دیا۔

بظاہر تو خود کو پُراعتماد ظاہر کر رہا تھا، مگر اندر اس کی کیا حالت تھی جنید ہی جانتا تھا۔

"ہوں..... ذرا اپنے دکھائیے!" دکاندار نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا اور ہاتھ کے اشارے سے تھیلا مانگا۔

جنید نے تھیلا آگے کر دیا۔ دکاندار نے تھیلے سے سامان باہر نکالا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ باری باری سامان کو اٹھا کر کے ان کا وزن کرنے لگا۔ وزن کرنے کے بعد ایک کیلکولیٹر پر حساب لگایا۔ جنید اب خود کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا لیکن بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت اس کی اندرونی بے قراری ظاہر کر رہی تھی مگر وہ خود کو کنٹرول کیے بیٹھا رہا۔

حساب کر کے دکاندار ایک کاغذ پر سامان کی تفصیل کے ساتھ ساتھ ان کی قیمت خرید بھی لکھتا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ لکھتا، ویسے ویسے جنید کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر جب بھاری بھرکم رقم جنید کے ہاتھ میں آئی تو جنید کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی سانس پھولنے لگی۔ اس نے اپنی کیفیت کو کنٹرول کیا اور رقم جیب میں ڈال کر دکاندار سے ہاتھ ملا کر دکان سے باہر آ کر ایک لمبا سانس لیا۔ جنید اب تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ٹیکسی کی جانب جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہیں سے اپنے سسرال جائے اور سکینہ کو گھر لے آئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اس واردات کے بعد اس کا دل کھل چکا تھا۔ بظاہر وہ اطمینان سے بیٹھا تھا، مگر اس کے دماغ میں دوسری واردات کی پلاننگ چل رہی تھی۔

ختم شد"

کاشف کی انگلیاں جب کی بورڈ سے ہٹیں تو وہ ایک مکمل کہانی لکھ چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی اور کرسی سے پشت لگائی۔ کچھ دیر اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے گردن گھما کر جب گھڑی پر نظر ڈالی تو چونک گیا۔ اسے ایک گھنٹے کے اندر اندر ایک جگہ پہنچنا تھا کیونکہ وہ جس کام کے لیے جا رہا تھا اس کام میں ٹائم کی بہت اہمیت تھی۔ وہ جلدی سے اٹھا، کی بورڈ پر رکھا، ایک سفری بیگ اٹھا کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

حسنین اور عالیہ کی زندگی اب پُرسکون ہو چکی تھی۔ عالیہ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب اسے وہ کنگن کبھی نہیں مل سکتے۔ حسنین نے ویسے ہی ڈیزائن کے کنگن عالیہ کو لا کر دے دیے تھے اور ایک انگوٹھی ہار اور بھی لا دیا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اپنی دکان میں حسنین اپنے ملازمین کے ساتھ کھانا کھا کر اپنے آفس میں آ کر حساب کتاب میں لگ گیا اور وقتاً فوقتاً سامنے لگی اسکرین پر سی سی ٹی وی کیمروں کی ریکارڈنگ کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ حسنین نے میز پر رکھی بل بک کے ایک بل پر دستخط کیے اور بل بک ایک طرف رکھ دی۔ بک رکھنے کے بعد اس نے کال کرنے کے لیے جیسے ہی موبائل کی جانب ہاتھ بڑھایا، اس کی نظر اسکرین پر دکان میں بیٹھے واحد گاہک پر پڑی جو کاؤنٹر کے دوسری جانب بیٹھا پہلو بدل رہا تھا۔ کاؤنٹر پر ایک تھیلا رکھا ہوا تھا۔ ملازم نے جیسے ہی تھیلے سے سامان نکالا، حسنین اچھل پڑا۔ اچھلنے کی وجہ گاہک کا حلیہ اور وہ زیورات تھے۔ وہ زوم کر کے تصدیق کرنے لگا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے، وہی کچھ ہے یا جو وہ سوچ رہا ہے وہ ہے۔ جب یقین ہو گیا کہ جو کچھ وہ سوچ اور دیکھ رہا ہے، دونوں ہی سچ ہیں۔ اس وقت اس کا ملازم کنگن چیک کر رہا تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا اور کال کرنے لگا۔ اس کی کیفیت ہیجانی سی ہو رہی تھی۔

"کہاں ہے جلدی بتا.....!" جیسے ہی دوسری جانب سے کال ریسیو ہوئی، حسنین تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

دوسری جانب سے نہ جانے کیا کہا گیا۔

"اوئے یار! مذاق بعد میں کر لینا۔ میری بات غور سے سن۔ مجھے لوٹنے والا مجرم اس وقت میری دکان میں بیٹھا ہے۔ اس نے آسمانی رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی ہے۔ جلدی فرصت میں میری دکان پر پہنچ..... باقی تفصیل فون پر بتاتا ہوں۔ دس منٹ سے ایک منٹ بھی اوپر نہیں ہونا چاہیے۔ اوکے خدا حافظ۔" حسنین نے موبائل رکھ دیا۔

اب وہ اطمینان سے کرسی سے ٹیک لگا کر اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر اسکرین پر نظر آنے والے نوجوان کو غور سے دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ اسے پتا تھا پولیس اسٹیشن سے موبائل دس منٹ میں پہنچ جائے گی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوا، واردات والے دن اس نے بہادری نہیں دکھائی۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ دس منٹ انتظار کرنے کے بعد اس نے انسپکٹر ذیشان کو دکان میں گھستے ہوئے دیکھا اور ایک منٹ بعد ہی وہ نوجوان کو گدی سے پکڑ کے باہر کھڑی پولیس موبائل میں پھینک چکا تھا۔ بے چارہ نوجوان موبائل کی سیٹوں کے درمیان اکڑوں بیٹھا حیرت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ اس کے پلان میں کوئی کمی بھی نہیں تھی اور یہ تو اس کی کہانی کا سین ہی نہیں تھا۔ وہ تو کہانی میں ٹیکسی میں بیٹھا سسرال جا رہا تھا۔

XXX

جنگ باز
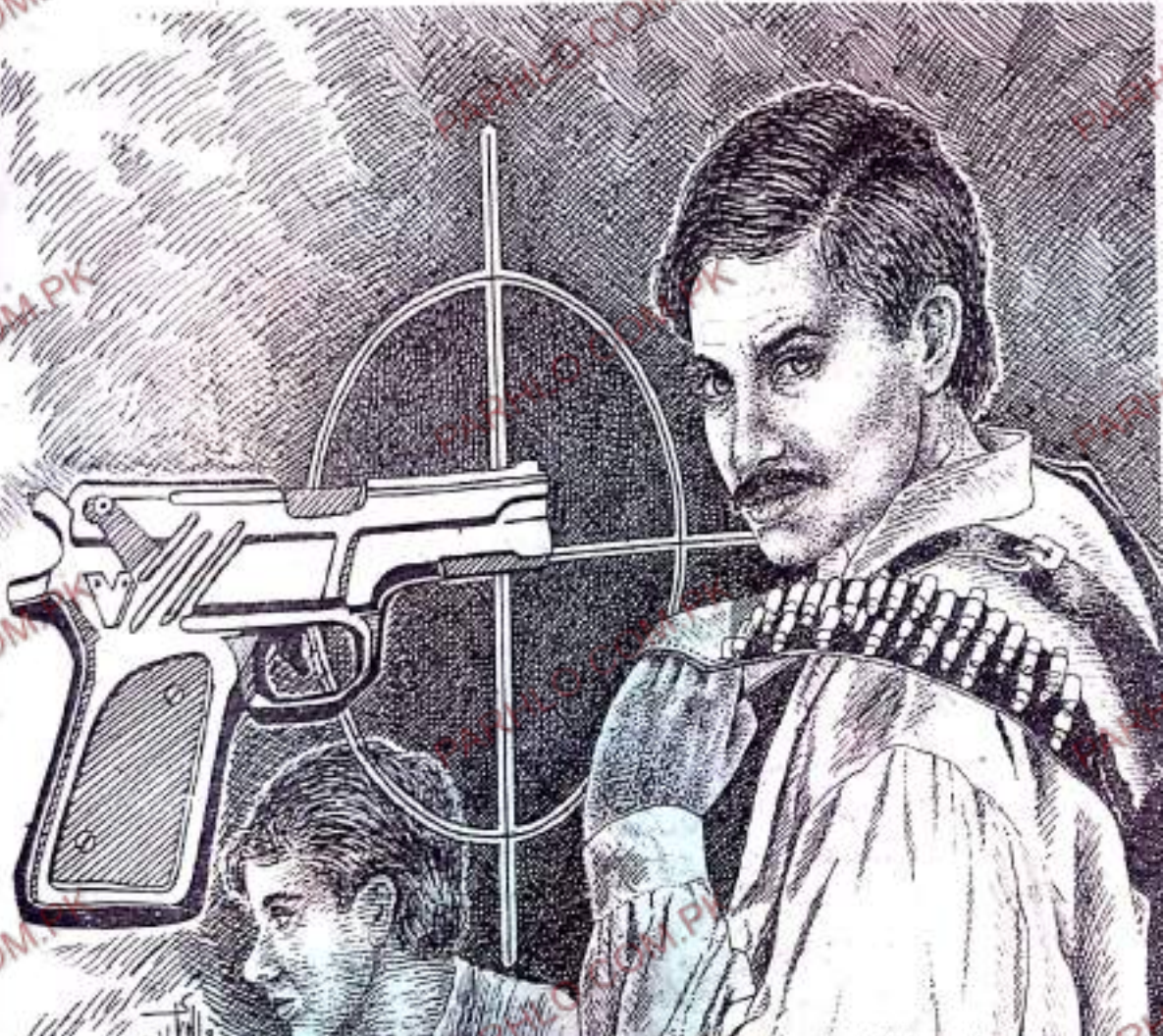
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر 12

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم

زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

بنگلے کے اندر کال بیل کی ابھرتی آواز مجھے بھی سنائی دی تھی۔ میں نے اپنے اعصاب پر قابو پا رکھا تھا کیونکہ حتمی طور پر میرا اپنے دیرینہ دشمن اقبال کے ساتھ سامنا ہونے والا تھا۔

ذرا ٹھہر کر میں نے دوبارہ بیل بجائی تو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔ سامنے ارشد تھا۔ میری بھانپتی ہوئی نظروں نے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھے لیکن مجھے دیکھتے ہی وہ ایک دم جیسے کھل کر بولا۔

''ارے آپ، سہراب صاحب! آیئے، اندر تشریف لایئے، آیئے نا!'' مجھے اس کے تخاطب کرنے کے انداز سے لگا جیسے وہ کسی ایسے ہی شخص کا منتظر ہو جو اس کی پریشانی رفع کر سکتا ہو۔

''میں نگہت کے گھر گیا تھا۔'' بغلی دروازے کے راستے میں نے اندر ایک قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہاں تالا تھا۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟ ادھر تو نہیں آئی؟'' میں نے دانستہ اقبال کا ذکر نہیں کیا۔

''نگہت بی بی بالکل ٹھیک ہیں مگر ایک ذرا مسئلہ ہو گیا ہے۔ اچھا ہوا آپ آ گئے۔'' وہ بولا۔ ''نگہت بی بی بھی اندر ہی ہیں اور بڑے صاحب بھی کراچی سے آئے ہوئے ہیں۔''

کہتے ہوئے اس نے داخلی دروازہ کھولا اور مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ نشست گاہ خالی پڑی تھی۔ متبول کہیں گیا ہوا تھا۔ ارشد نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا کہا اور خود ایک دوسرے اندرونی گوشے میں کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ''بڑے صاحب'' کی آمد کا مطلب پاس اقبال ہی ہو سکتا تھا۔ نگہت کے بارے میں البتہ فی الحال اس نے کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں بتائی تھی جیسا کہ وسیم نے دانستہ سنسنی پھیلانے یا مجھے پریشان کرنے کی نیت سے اس کا ادھورا ذکر کیا تھا۔ تاہم باوصف ان سب باتوں کے کچھ ایسا تھا جو پریشانی کا سبب تھا۔ کم از کم ارشد کا چہرہ یہی بتا رہا تھا۔

اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ اندر کس کو بلانے یا میری آمد کی اطلاع دینے گیا ہے۔

ذرا دیر بعد میں نے نگہت کو دیکھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ارشد ساتھ تھا۔ وہ اسے اندر چھوڑنے کے بعد دوبارہ مڑ گیا۔ میں نے نگہت کے چہرے کو دیکھا اور چونک سا گیا۔

اس کا پھول سا چہرہ بری طرح کملایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں سرخی تھی۔ یوں جیسے وہ روتی رہی ہو۔ وہ اچھی خاصی مضمحل بھی دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ تو ایسا ہوا تھا جس کے قریب قریب وسیم نے ذکر کیا تھا۔ تاہم اسے صحیح سلامت سامنے دیکھ کر گونہ تسلی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے ہولے سے سلام کیا۔ پژمردہ چہرے پر پھیکی سی استقبالیہ مسکراہٹ ابھری۔ میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے غور سے اس کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے کہا۔

''خیریت تو ہے؟ تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ گھر بھی گیا تھا تمہارے مگر وہاں تالا پڑا تھا۔ وسیم سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے تمہارے بارے میں ادھوری بات کر کے مزید پریشان کر دیا تو میں یہاں چلا آیا۔''

''بیٹھو۔'' اس نے ہولے سے کہا۔ [illegible] وقت بھی وہ شاید اندر کہیں بیٹھی روتی رہی تھی۔ میری اس [illegible] نے شاید اس پر مزید حساسیت طاری کر دی اور وہ آنچل سے اپنی کشادہ آنکھوں کے گوشے صاف کرتی ہوئی میرے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ڈیڈی آ گئے ہیں اور اندر موجود ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا مگر خاص لہجے میں پوچھا۔ ''تمہیں کیا ہوا ہے؟ اور بہن جی......؟''

''سب گڑبڑ ہو گئی ہے سہراب!'' وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''یہ سب چلتا ہی رہتا ہے۔ آخر بتاؤ تو ہوا کیا ہے؟''

اس نے سر اٹھا کر اور متورم سی آنکھوں سے مجھے یوں دیکھا جیسے وہ مجھ سے کچھ امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہو پھر بولی۔

''سہراب! میں بہت بدنصیب ہوں۔ پہلے میرے ماں باپ کی آپس میں نہ بن سکی، وہ الگ ہو گئے۔ میں ماں کے ساتھ رہنے لگی پھر باپ کی محبت نے دل میں جوش مارا۔ میں ان سے بھی ملتی رہی۔ خوش تھی کہ چلو مجھے تو ماں اور باپ دونوں کا پیار مل ہی رہا ہے۔ پر...... پر...... اب لگتا ہے جیسے میں دونوں کا ہی پیار کھونے والی ہوں۔''

کہتے ہوئے وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ دیے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔ یہ سب میرے خدشات اور خیالات کے بالکل الٹ تھا کیونکہ جس طرح وسیم نے فتنہ انگیزی سے مجھے نگہت کی طرف سے تشویش میں مبتلا کیا تھا ویسا تو نہیں تھا۔ میں یہی سمجھا تھا کہیں اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی اور نکلا۔ میں ابھی اس سے کچھ استفسار کرنے یا اسے تسلی کے دو جملے بولنے ہی والا تھا کہ دفعتاً ایک گمبھیر مگر نفرت اور عداوت میں ڈوبی ہوئی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔

''ہاں بیٹی! ہماری زندگی کو اسی زہریلے سانپ نے ڈسا ہے۔'' پل کے پل میں نے ہی نہیں، نگہت نے بھی سر اٹھا کر [illegible] دیکھا۔ میری آنکھوں میں سیاہ دھند اتر آئی تھی۔ سامنے وہی نفرت انگیز شخص کھڑا تھا جس کی وجہ سے میں آج اس نہج پر پہنچا تھا کہ میں در بدر ہو رہا تھا۔ میری زندگی [illegible] اسی شخص کی وجہ سے آج میں عام ڈگر سے ہٹ کر ان ہی راستوں کا راہی بن کر رہ گیا تھا جہاں سکون اور [illegible] کسی احساس، کسی امنگ کا پتا نہ رہا تھا۔ میری [illegible] کرنے والا کس قدر منافق اور جھوٹا تھا۔ سارا زہر پھیلایا ہوا اس کا اپنا تھا اور الزام مجھ پر لگا رہا تھا۔

میں اس اقبال کو اپنے سامنے دیکھ کر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ [illegible] ہرگز کسی احترام کا جذبہ شامل نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک [illegible] اور دشمنی کا جذبہ کارفرما تھا لیکن ساتھ ہی میں اندر سے اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر تھوڑا چونکا بھی تھا۔

آج کافی عرصہ دراز بعد ہی اس سے میرا آمنا سامنا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے کافی ضعیف اور ناتواں محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے قویٰ جو کبھی بہت مضبوط تھے، اب مضمحل سے نظر آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے عمر رفتہ سے زیادہ اس پر کسی بیماری نے حملہ کر رکھا ہو۔

''سانپ کون ہے اور کس نے کس کی زندگی کو ڈسا ہے، یہ کسی اور سے تو کیا خود تمہارے اپنوں سے بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے اقبال صاحب!''

بالآخر میں نے بھی اسی زہرخند انداز میں اسے جواب دے ڈالا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھا اور لگتا تھا جیسے اب اس کا کام بس بستر پر پڑے رہنا ہی تھا۔ وہ جیسے برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ملازم متبول اور ارشد بھی کھڑے تھے۔ دونوں کو اقبال نے اشارے سے روانہ کر دیا۔ اب نشست گاہ میں صرف ہم تین ہی تھے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اقبال نے مجھے گھورتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا اور میں اسے گھورتا ہوا آہستگی سے بیٹھ گیا۔ وہ نگہت والی سیٹ کے قریب صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا اور اپنا ایک ہاتھ محبت و شفقت سے نگہت کے کاندھے پر دھر لیا تو نگہت سسک کر باپ کے ساتھ لگ گئی۔

دونوں باپ بیٹی کا یہ پیار دیکھ کر میرے اندر کئی سوالات اٹھنے لگے۔ اس قدر جانکاری کے باوصف نگہت کا اپنے باپ سے اس قدر لگاؤ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے اندر [illegible]۔

''سہراب! پلیز، پاپا سے آرام سے بات کریں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' نگہت نے آہستگی سے باپ سے الگ ہو کر مجھ سے کہا۔ اس کے لہجے میں التجا تھی مگر میں نے اس بار نگہت کا بھی لحاظ نہیں رکھا اور بولا۔

''مجھ سے جیسا اور جس انداز میں سوال کیا جائے گا، میں اسی انداز میں جواب دینے کا حق رکھتا ہوں۔''

''کسی بھول یا خوش فہمی میں مت رہنا سہراب!'' اقبال نے اچانک اسی طنطنے سے مخاطب ہو کر مجھ سے کہا جس طرح وہ اپنے کارندوں سے بات کرنے کا عادی تھا۔

''تم بھی مت بھولنا اقبال کہ میں اس وقت تمہارا کوئی ملازم یا کارندہ نہیں ہوں۔'' میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''پلیز، پاپا!'' نگہت نے اس بار اپنے باپ سے بھی التجا کر ڈالی۔ اقبال مجھے زہرخند نظروں سے گھورنے لگا۔ میری جارحانہ نظریں بھی اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''تم میرے آلۂ کار تھے، میرے کارندے تھے لیکن بڑی مکاری سے جب تمہارا مفاد نکلا تو لالچ میں آ کر میرے دشمنوں سے مل کر میرے ہی خلاف سازش تیار کر ڈالی۔'' وہ بڑی مکاری سے جھوٹ بولتے ہوئے اپنا لہجہ نرم کیے ہوئے تھا۔ نگہت میرے چہرے کو تکنے لگی۔ وہ ایک لمحہ ٹھہر کر دوبارہ درشتگی سے بولا۔

''تم بھوکے ننگے تھے۔ تمہارا خاندان ایک سڑی سی اور گھر اڑتے محلے میں جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہا تھا۔ یہ میں ہی تھا جس نے تمہیں اور تمہارے خاندان کو آرام و آسائش والی زندگی سے ہمکنار کیا مگر تم پھر بھی احسان فراموش نکلے۔''

''کیا یہ درست ہے سہراب؟'' نگہت نے جیسے اپنے باپ کی حمایت میں مجھ سے پوچھا۔

''یہ سب جھوٹ ہے۔'' میں نے بھی متحمل لہجہ اختیار کرتے ہوئے ہولے سے جواب دیا۔

''تو پھر سچ کیا ہے؟ وہ جو پاپا نے مجھے بتایا ہے یا پھر وہ جو تم مجھے بتا چکے ہو۔'' نگہت نے عجیب سے لہجے کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

اس کے سوال کرنے کا یہ انداز مجھے ناگوار گزرا۔ میں نے پھر بھی صبر اور برداشت سے کام لیا۔ از بس ضروری سمجھا کیونکہ مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ جب نگہت نے اپنے باپ سے میرے بارے میں بات کی ہوگی تو اقبال نے بڑے مکارانہ جھوٹ سے کام لیتے ہوئے اس کی ''برین واشنگ''

کرتی ہوگی۔ کم از کم نگہت کے انداز تخاطب سے مجھے یہی محسوس ہوا تھا۔ آج مجھ سے بھی اس کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ میں نے اس کے لہجے میں کسی قسم کی نرمی یا اپنا پن محسوس کیے بغیر ٹھنڈی ہوئی حقارت سے جواب میں نگہت سے کہا۔

"یہ وہی ہے جو میں تمہیں بتا چکا ہوں اور تمہاری ماں نے بھی اس شخص کے بارے میں غلط نہیں بتایا تھا۔" میں نے بھی مکاری سے کام لیتے ہوئے دانستہ شگفتہ خاتون کا ذکر کرنا ضروری سمجھا۔ اقبال پھر غصے سے اکھڑ گیا۔ میں نے اس کی دکھتی رگ پر وار کیا تھا۔ وہ یک دم بھڑک کر بولا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔ میری بیوی کا ذکر کر کے تم اپنا بدلہ پورا نہیں کرسکتے۔"

"تمہاری بیوی.....؟" میں نے زہریلے طنز سے مسکرا کر کہا۔ "کون سی بیوی.... جو آج سے پچیس سال پہلے تمہارے کالے کرتوتوں کی وجہ سے تم سے ہر قسم کا رابطہ توڑ چکی تھی؟"

"لگام دو اپنی زبان کو..... سہراب!" میری بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ مارے طیش کے لال پیلا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا مگر اس کے ساتھ اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ وہ سینہ پکڑے کھانستا چلا گیا اور دوبارہ صوفے پر گر پڑا۔ نگہت پریشان ہوگئی اور اس نے باپ کو فوراً سنبھال لیا۔

"پاپا! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" پھر میری جانب دیکھ کر بولی۔ "کیا آپ کو ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ ایک شخص کس قدر بیمار ہے اور تم..."

"بیمار آدمی کو پھر ایسے حساس موضوع پر صبر اور برداشت کے ساتھ گفتگو کرنا چاہیے۔" نگہت کے لہجے میں اپنے لیے تلخی کی رمق محسوس کر کے میں نے بھی روکھے پن سے جواب دیا۔ وہ مجھ سے مزید اور بھی تیکھے جملے بازی کرنا چاہتی تھی۔ کم از کم اس کی پیشانی کی شکنیں تو یہی ظاہر کر رہی تھیں مگر کچھ سوچ کر وہ پھر اپنے باپ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"نگہت بیٹی! اسے بولو یہاں سے چلا جائے۔" اقبال ہانپتے ہوئے بولا۔ ساتھ ہی ایک ہاتھ کا اشارہ بھی میری جانب کیا تھا۔ میرے اندر بھی نفرت کا طوفان اُبل رہا تھا۔ وہ مزید بولا۔

"اسے نہیں معلوم کہ میں اس کا کیا حشر کرسکتا ہوں۔ میں صرف تمہاری وجہ سے...."

"بس، اقبال صاحب!" میں نے بھی اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ "پہلے اپنے موجودہ حشر اور روزِ حشر کی خیر مناؤ پھر مجھ سے نمٹنے کی بات کرنا۔"

"تم خاموش نہیں ہوسکتے؟" نگہت یک دم میری طرف دیکھ کر چیخ پڑی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر کا زہر زبان پر آ گیا ہو۔ میں نے اسے بھی آج پہلی بار سنسناتی نظروں سے گھورتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

"مجھے اندازہ تو تھا مگر شک کی حد تک لیکن آج یقین آ گیا کہ انسان کا احساسِ محرومی اسے کسی نہ کسی صورت جرم کی طرف مائل کرتا ہے۔ افسوس ہوا مجھے نگہت صاحبہ کہ کل آپ میری باتوں سے متفق تھیں اور آج...."

"پاپا کی طبیعت دیکھ نہیں رہے ہو؟" وہ تڑخ کر بولی۔ "تم یہاں اپنی مرضی سے آ ہی گئے ہو تو آرام سے بات نہیں کرسکتے؟"

"آرام سے ہی تو بات کر رہا تھا میں۔" میں نے جواب دیا۔

"اسے کہو یہاں سے چلا جائے..... بس۔" مبادا اقبال نے بیٹی سے کہا۔ وہ کچھ سنبھل گیا تھا۔

"پلیز! آپ جائیں یہاں سے۔" نگہت نے بھی باپ کی حمایت میں مجھ سے کہا۔ "میں خود بھی بہت پریشان ہوں۔"

میں نہیں جانتا تھا کہ اس کی اور کیا پریشانیاں ہوسکتی تھیں۔ تاہم میں مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ واپسی میں میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اقبال کی اچانک خرابیٔ طبیعت کا حال دیکھ کر مجھے بھی ایک جھٹکا تو لگا تھا مگر آج نگہت کے بدلے ہوئے رویے نے مجھے افسوس سے زیادہ ایک نامعلوم سی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ اس نے مجھے آس دلائی تھی کہ وہ اپنے باپ سے میرے سلسلے میں اس دیرینہ دشمنی کو ختم کرنے کی بات کرے گی وغیرہ...... مگر یہاں معاملہ مجھے اس کے برعکس نظر آ رہا تھا۔ الٹا نگہت ہی میری بیری ہو چلی تھی۔

اب تشویش اس لیے ہو رہی تھی کہ اقبال کو میری یہاں موجودگی کا پوری طرح علم ہو چکا تھا اور یہ میرے مفاد میں خطرناک ہوسکتا تھا۔ نگہت کے دل میں باپ کی محبت نے اس قدر جوش مارا تھا کہ وہ میرے ساتھ بھی تلخ ہونے لگی تھی۔

وسیم کا طنزیہ انداز بھی میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ اسے بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ نگہت اور میرے درمیان کیسی دراڑ پڑنے والی تھی۔ وہ اسی لیے حظ اٹھانے کے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا تھا اور دانستہ معلوم نہیں کیا مجھے جتا گیا تھا۔

"بہن جی!" اچانک میرے تیزی سے سوچتے

ہوئے ذہن ہی میں یہ نام ابھرا تھا۔ وہ کہاں تھی؟ مجھے اس سے اس تازہ صورت حال کے بارے میں بات کرنا تھی۔

یہ سوچ کر میں نے کار کی رفتار بڑھا دی اور ایک بار پھر رحیم کے گھر جا پہنچا مگر حسب سابق گھر پر تالا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آخر بہن جی کدھر چلی گئی؟ اقبال والے بنگلے پر اس کی موجودگی کا امکان تھا تو پھر..... میں ابھی انہی سوچوں میں الجھا واپس اپنے گھر پہنچا تو وہاں ایک چونکا دینے والی اطلاع میری منتظر تھی۔

☆☆☆

"بہن جی ہمارے ہاں آئی ہوئی تھی۔ گھر کا دروازہ کھولتے ہی رحیم..... نے مجھے بتایا تھا۔ مجھے الجھن آمیز حیرت ہوئی۔

"کہاں بٹھایا ہے انہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جی اندر بیٹھک والے کمرے میں ہیں۔" رحیم نے جواب دیا۔ "خاصی پریشان نظر آتی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ مجھے سہراب بیٹے سے ضروری بات کرنا ہے اور میں ان سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔ میں نے بٹھا دیا اندر اور....."

"چائے پانی کا پوچھا؟"

"جی ہاں، بالکل جی۔"

"فوزیہ اور راحیلہ ان کے ساتھ ہیں؟"

"نہیں۔" رحیم نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں سودا سلف لینے گیا ہوا تھا، وہ کہیں جا چکی تھیں۔ شاید گھومنے گئی ہیں۔"

"اچھا!" مجھے حیرت ہوئی کیونکہ وہ اکثر رحیم کے ساتھ ہی باہر کہیں جایا کرتی تھیں۔ میں سوچوں میں الجھا ہوا بیٹھک والے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اندر شگفتہ خاتون ایک صوفے پر ٹکی بیٹھی براجمان تھیں۔ یوں کہ ایک کہنی صوفے کے ہتھے پر ٹکائے اپنا سر دبائے سوچوں میں گم۔

میں نے ہولے سے کھنکار کر انہیں سلام کیا تو وہ چونک گئیں پھر مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تم آ گئے بیٹا! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" وہ قدرے پریشانی سے بولیں تو میں نے ملامت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔

"کیا بات ہے بہن جی! آپ بہت فکر مند اور پریشان نظر آ رہی ہیں؟" میں نے ان کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تو آپ کے گھر کے بھی دو تین چکر لگا چکا ہوں۔ وہاں تالا تھا۔"

"بس بیٹا! بری قسمت اور تقدیر نے پھر میرا پیچھا پکڑ لیا ہے۔" وہ مغموم لہجے میں بولیں۔

"پلیز! آپ بیٹھیں تو سہی۔ آرام سے بات کرتے ہیں۔" ان کی پریشانی دیکھتے ہوئے میں نے نرمی سے کہا۔

ہم دونوں آمنے سامنے کے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"میں پہلے آپ کے لیے کچھ منگواتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں نے جنت کو آواز دینا چاہی۔ وہ پہلے ہی وہاں آن پہنچی تھی۔ شاید رحیم نے اسے میرے پیچھے اندر بھیج دیا تھا۔

"نہیں، نہیں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پانی میں پی چکی ہوں۔ بس اسی کی طلب تھی۔ پلیز! میری بات سنو۔" شگفتہ خاتون نے کہا اور جنت کی طرف دیکھا۔

میں نے جنت کو جانے کا اشارہ کر دیا۔ اس کے جاتے ہی شگفتہ خاتون نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کیا نگہت بیٹی سے ملے ہو؟"

"ہاں۔"

"کب، کہاں؟"

"میں ابھی ابھی وہیں سے آ رہا ہوں۔ گھر پر مستقل تالا دیکھ کر میں نے وہیں کا رخ کیا تھا۔" میں نے انہیں ساری بات بتا ڈالی اور پھر آخر میں تاسف آمیز انداز میں نگہت کے رویے کا شکوہ بھی ان سے کر ہی دیا تو یہ سب سننے کے بعد شگفتہ خاتون نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولیں۔

"نگہت بیٹی کا رویہ مجھ سے بھی اس قدر بدل چکا ہے تو تمہاری کیا بات ہے بیٹا! لیکن تم پھر بھی ہمارے لیے فرشتہ ہی ہو۔"

"کیوں؟ وہ اس قدر کیوں بدل گئی ہے؟"

"اس مکار آدمی اقبال نے بیٹی کی محبت کو دیکھتے ہوئے اسے جذباتی طور پر بلیک میل کر رکھا ہے۔" وہ تلخی اور نفرت سے بولیں پھر مزید کہا۔

"میں تمہیں پوری بات بتاتی ہوں۔" اس کے بعد وہ بتانے لگیں کہ اقبال کے کراچی سے آتے ہی حسب سابق نگہت اس سے ملنے اقبال کے بنگلے پر پہنچ گئی۔ کافی دیر بعد وہ لوٹی تو شگفتہ خاتون نے اسے پریشان اور تشویش زدہ پایا۔ پوچھنے پر نگہت نے ماں سے بڑے صدمے بھرے انداز میں کہا کہ پاپا (اقبال) کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ بیمار رہنے لگے ہیں۔ انہیں دل کا عارضہ لاحق ہوگیا ہے اور ساتھ ہی خون میں بھی قدرتی طور پر کوئی بیماری پیدا ہوگئی ہے جس سے ان کے خون میں "کلاٹس" بننے کا خدشہ ہو چلا تھا جس کے سبب انہیں DVT(deep vein thrombosis) ہوا اور ان کی دائیں ٹانگ اور بائیں

مارکیٹ نہ چلی گئی ہوں۔" میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

"چلیں جی، وہاں بھی چل کر دیکھ لیتے ہیں۔" رحیم بولا۔ ہم دونوں مارکیٹ پہنچے۔ وہاں بھی فوزیہ اور راحیلہ کو ڈھونڈتے رہے لیکن وہ نہیں ملیں۔

"اب کیا کریں؟" میں نے تھکے تھکے انداز میں پریشانی سے کہا۔ تاہم اب میرے دماغ میں فوزیہ کی راحیلہ سے متعلق اس رات والی گفتگو بھی گونجنے لگی تھی جس میں اس نے مجھے راحیلہ کی پراسرار حرکات وسکنات کے بارے میں بتایا تھا۔

"آپ گھر چلیں، میں دوبارہ انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔" رحیم بولا۔ "فکر نہ کریں، وہ مل جائیں گی۔"

میں گھر چل دیا۔ ابھی میں دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا کہ دیکھا، ایک رکشا دروازے کے قریب رکا ہے اور اس میں سے وہ دونوں اتر رہی تھیں۔ میں نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ اگلے ہی لمحے بری طرح ٹھٹکا بلکہ جیسے مجھے ایک سکتہ سا ہو گیا۔

راحیلہ، فوزیہ کو سہارا دے کر رکشے سے اتار رہی تھی جس کی حالت خراب اور ناگفتہ بہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ یوں جیسے فوزیہ رکشے میں نہیں بلکہ میلوں دور سے دوڑتی ہوئی آ رہی ہو۔

راحیلہ شاید رکشے والے کو پہلے ہی کرایہ دے کر فارغ کر چکی تھی اسی لیے وہ ان دونوں کے اترتے ہی اپنا رکشا لیے آگے بڑھ گیا تھا۔

میں تیزی سے ان کی جانب لپکا۔ ان کے قریب پہنچا ہی تھا کہ فوزیہ نے ایک بڑی سی قے کر ڈالی۔

"کیا ہوا فوزیہ کو؟" میں نے گہری تشویش تلے راحیلہ سے پوچھا۔ ساتھ ہی میں نے بھی بڑھ کر فوزیہ کو سنبھالا۔ "میں اور رحیم تم دونوں کو ڈھونڈنے نکلے تھے۔"

راحیلہ مجھے اس طرح اچانک دیکھ کر گھبرا سی گئی پھر قدرے بوکھلا کر بولی۔

"ہم پارک تک ہی گئے تھے کہ راستے میں اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔"

"تو تم اسے یہاں لانے کے بجائے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاتیں۔" میں نے اسے گھور کر دیکھا تو فوزیہ ہانپتے ہوئے مجھ سے بولی۔

"اس کی ضرورت نہیں سرتاب! میں ٹھیک ہو جاؤں گی، پلیز! مجھے اندر لے چلو۔" اس کے لہجے میں عجیب سی التجا تھی۔ مجھے اب پریشانی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ اس کے چہرے کی رنگت پھیکی سی پڑ چکی تھی۔ ہونٹ خشک تھے اور آنکھیں متورم۔

ہم اسے اندر لے آئے۔ جنت بھی فوزیہ کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ قے ہونے کے بعد فوزیہ کو ابکائی بھی آ رہی تھی۔ جنت نے فوراً نہ جانے کون سا گھریلو ٹوٹکا آزمایا اور اس کے لیے گلاس میں کوئی نمکین شربت لے آئی۔

وہ پینے کے بعد فوزیہ کی حالت کچھ سنبھلی۔ اس درمیان میں راحیلہ وہاں سے کھسک چکی تھی۔ میں نے فوزیہ کو کمرے میں بیڈ پر لٹا دیا تھا اور اس کے قریب ہی بیٹھ کر اس کا نرم ونازک ہاتھ تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

اس کا ہاتھ مرتعش تھا۔ بدن کا درجہ حرارت بھی پہلے مجھے چھو کر بالکل یخ محسوس ہوا تھا۔ اب کچھ بحال تھا۔ اس کی سانسوں میں ترتیب اور چہرے پر رونق آ گئی تھی۔

بلاشبہ گھریلو ٹوٹکے والا شربت پینے کے بعد اس کی حالت کچھ سنبھلنے لگی تھی۔

"فوزیہ! تم ٹھیک تو ہو نا؟ کہو تو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں ابھی؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"نن... نہیں... میں... اب ٹھیک ہوں۔" وہ بولی۔

"مجھے بہلا تو نہیں رہی ہو؟ آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے، تمہاری طبیعت زیادہ....."

"میں نے کہا نا میں ٹھیک ہوں اب۔" وہ دوبارہ بولی۔ جنت پاس ہی کھڑی تھی۔ میں نے فوزیہ سے پوچھا۔

"اور شربت چاہیے؟"

"نہیں۔" اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ خاموش رہی۔ یوں لگا جیسے بولنا چاہتی ہو مگر اس میں ہمت نہیں ہو پا رہی تھی یا پھر ابھی وہ کچھ کہنے سننے کے موڈ میں نہ تھی۔ وہ خاصی پریشان بھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے کچھ سوچا پھر ملاطفت آمیزی سے پوچھا۔

"کچھ کہنا چاہو گی؟"

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے لب نے جنبش تو کی مگر الفاظ ادا نہ کر سکے۔

"تم آرام کرلو۔ باتیں کرنے کے لیے بہت وقت ہے۔" میں نے ہولے سے مسکرا کر کہا۔ میرا خیال تھا کہ جس قدر کچھ بتانے کے لیے وہ بے چین نظر آ رہی تھی، فوراً بول پڑے گی لیکن شاید وہ اس قدر مضمحل یا اعصاب زدہ ہو رہی تھی کہ اس نے سکون لینا ضروری سمجھا۔ اس قدر کہ اس میں مجھ سے مزید کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ ہو پائی اور اس نے تکیے پر اپنا سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

اس کی پشت کنڈی پر ایک بار پھر مجھے اندر سے اس کی فکر ہونے لگی۔ ایسا کیا ہوا تھا اس کے ساتھ؟ یا پھر یہ کسی ذہنی ہیجان سے گزری ہے کہ کچھ بولنا چاہتی ہو مگر اس میں ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جو بات مجھے بتانا چاہتی ہو اس کے لیے وہ خود کو پہلے دلی اور دماغی طور پر پرسکون کرنا چاہتی ہو۔

یہ سوچ کر میں اسے آرام کی غرض سے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور جنت سے دھیمی آواز میں بولا۔

"فوزیہ کا خیال رکھنا۔ وہ ابھی آرام کر رہی ہے۔"

"جی بہت بہتر!" جنت نے کہا۔

"راحیلہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ دوسرے کمرے میں ہے۔" جنت نے جواب دیا۔ "میں اسے پوچھنے تو گئی تھی مگر اس نے جانے کیوں اندر سے دروازہ بند کر رکھا ہے۔ دستک پر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ پہلے میں نے پکارا اور چائے وغیرہ کا پوچھا تو عجیب سے انداز میں مجھے واپس چلے جانے کو کہا۔ پہلے تو کبھی راحیلہ بی بی نے ایسا مجھے نہیں کہا تھا مگر شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہ ہو۔"

"ہاں، شاید یہی بات ہو۔" میں نے خفت زدہ لہجے میں کہا۔ جنت اور اس کا شوہر رحیم ہمارے ملازم نہیں تھے۔ وہ مدیروں کی وجہ سے ہماری خدمت پر مامور تھے۔ یہاں ان کی رہائش تھی۔ اسی لیے میں نے کہا۔

"آپ دل پر نہ لیں۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

"نہیں جی، ایسی کوئی بات نہیں۔" جنت فراخ دلی سے بولی۔ "میرے لیے تو یہ دونوں ہی سدرہ بی بی کی طرح بچیاں ہیں۔"

"تمہارا شکریہ جنت!" میں نے ہولے سے کہا۔

ذرا دیر بعد میں راحیلہ کے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ اندر سے بند تھا حالانکہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں دستک دے کر اندر داخل ہو جایا کرتا تھا۔

میں نے ہولے سے دستک دی تو اندر سے راحیلہ کی ہذیانی سی آواز ابھری۔

"کہہ جو دیا، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ ضرورت پڑی تو آواز دے دوں گی۔ دفع ہو جاؤ اب یہاں سے۔ بار بار مجھے پریشان مت کرو۔"

میں راحیلہ کے اس انداز تخاطب پر پہلے تو حیران رہ گیا مگر پھر غصہ بھی آیا۔ میں نے لمحہ بھر ہونٹ سختی سے بھینچے کے بعد آواز دی۔

"راحیلہ! دروازہ کھولو..... یہ میں ہوں، سرتاب.....!"

اندر جیسے یکلخت خاموشی طاری ہو گئی۔ یوں لگا جیسے راحیلہ میری آواز سن کر پشیمان ہو گئی ہو۔ اس کے چند لمحے بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے راحیلہ کا چہرہ ابھرا۔

میں نے اندر داخل ہونے میں جلدی نہیں کی بلکہ دروازے سے باہر ہی کھڑا اس کے چہرے کو گھورتا رہا۔ وہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں اس کے عجیب سی کیفیت تھی۔ ہونٹ بھی لرزیدہ سے تھے۔ ایک وحشت کی تصویر بنا اس کا چہرہ دیکھتے ہی میں نے نرمی سے پوچھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں، میں آرام کرنے لگی تھی۔" اس نے روکھے پن سے کہا۔ میرے دل پر گھونسا سا لگا جو خدشہ اس رات فوزیہ نے میرے سامنے ظاہر کیا تھا، آج مجھے اس پر یقین سا ہونے لگا۔ میں اسے ہاتھ سے ایک طرف کرتا ہوا اندر آ گیا اور اسے دروازہ بند کرنے کو کہا۔

اس نے آہستگی سے دروازہ بھیڑ کر بند کر دیا۔

"مت بھولو کہ یہ ہمارا گھر نہیں، ہماری ملکیت نہیں ہے اور ہم یہاں ایک پناہ گزین کی حیثیت سے رہ رہے ہیں اور نہ ہی جنت اور رحیم ہمارے تنخواہ دار ملازم ہیں۔" میں نے اسے سب سے پہلے یہی سمجھانا ضروری جانا تو وہ میری طرف عجیب نگاہوں سے تکتے ہوئے بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔"

"نہیں، تمہیں معلوم نہیں ہے۔" میں نے پھر سختی سے کہا۔ "معلوم ہوتا تو تم جنت سے اس قدر غصے اور برہمی کا برتاؤ نہ کرتیں۔"

"اب ایسا نہیں ہوگا۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"اب ادھر آ جاؤ اور آرام سے بیڈ پر بیٹھ جاؤ۔ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"کل کر لینا، آج میری....."

"ادھر آ جاؤ فوراً....." میں نے اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں کہا۔ وہ جھنجلاتی ہوئی بڑھی اور بیڈ پر ٹک کر بیٹھ گئی۔

میں نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھال لی۔ غور سے پہلے اس کے چہرے کو تکتا رہا پھر ٹھہری ہوئی حالت سے پوچھا۔

"کیا ہوا تھا فوزیہ کے ساتھ؟ اور تم دونوں کہاں گئی تھیں؟"

"تم تو ایسے مجھ سے پوچھ رہے ہو جیسے میں نے....." وہ تڑخ سے بولی تو میں نے پھر اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں کہا۔

"میرے سوال کا جواب دو۔"
"کیا فوزیہ نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"
"وہ آرام کر رہی ہے۔"
"ہم قریبی پارک میں چہل قدمی کے لیے گئے تھے۔ وہاں چاٹ کھائی تھی۔ اس کے بعد جانے فوزیہ کو کیا ہوا کہ ذرا دیر بعد ہی اسے الٹیاں آنا شروع ہو گئیں۔"
بالآخر اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔
میری بھانپتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اب بھی کچھ چھپا رہی تھی۔
"چہل قدمی کے بعد تم دونوں نے کہاں کا رخ کیا تھا؟"
"ہم ذرا دیر کے لیے مارکیٹ چلے گئے تھے۔ کچھ سوٹ اور کپڑے دیکھنے۔"
"اس کے بعد؟"
وہ تھوڑا جھجکی پھر بولی۔ "اس کے بعد ہم نے رکشا کروایا واپس گھر کے لیے۔"
اب مجھے لگا کہ وہ صاف جھوٹ بول رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا۔ "میں اور رحیم تم دونوں کی تلاش میں پہلے پارک ہی گئے تھے۔ اس کے بعد مارکیٹ لیکن ہمیں تو تم دونوں کہیں نظر نہیں آئی تھیں؟"
"ہو سکتا ہے آگے پیچھے ہو گئے ہوں۔" کہہ کر اس نے پیچھا چھڑانا چاہا۔ میں ہونٹ بھینچے اسے سوچتی نظروں سے گھورنے لگا تو وہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔
"پلیز! مجھے آرام کرنے دو۔"
"ایک بات یاد رکھنا۔ فوزیہ سے تو میں حقیقت پوچھ ہی لوں گا لیکن اگر تمہاری باتوں میں ذرا بھی جھوٹ ہوا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" تنبیہ آمیز انداز میں یہ کہتا ہوا میں اس کے کمرے سے لوٹ آیا۔
میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ جنت اور رحیم نے کھانے کا پوچھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میری بھوک مر چکی تھی۔ فوزیہ اور راحیلہ نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔
میرا دماغ پہلے ہی ان گنت معاملات اور مسائل میں الجھا ہوا تھا کہ اب راحیلہ کی پراسرار حرکتوں نے مزید مجھے پریشان سا کر دیا تھا۔ پھر میں نے ذہن پر زیادہ زور دینے اور اپنے اعصاب کو تھکانے کے بجائے پرسکون نیند لینے کا فیصلہ کیا۔ مجھے تسلی تھی کہ فوزیہ جب آرام کر کے اٹھے گی تو خود ہی حقیقت سامنے آ جائے گی۔
میں بیڈ پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔
☆☆☆

صبح ہلکے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ معلوم ہوا سدرہ کراچی سے آ گئی تھی۔ فوزیہ نے سب سے پہلے کمرے میں آ کر یہ اطلاع دی تھی۔ وہ اب بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی تھی۔
میں نے غسل خانے میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اس کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ معلوم ہوا کہ سدرہ اکیلی نہیں آئی تھی، محمود بھی ساتھ تھا۔ دونوں ہی پریشان، اداس اور مغموم تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے اترے اترے بشروں پر تازگی کی لہر سی ابھری۔
"اللہ کا شکر ہے کہ آپ لوگ خیریت سے یہاں پہنچ گئے۔" سلام دعا کے بعد میں نے کہا۔ فوزیہ اور راحیلہ بھی ان کے پاس ہی موجود تھیں۔ راحیلہ کچھ ٹھیک موڈ میں دکھائی دے رہی تھی۔ سدرہ کی ماں کی وفات کا بھی افسوس کیا گیا۔
ناشتے کا وقت ہو رہا تھا۔ جنت مطبخ کر کے جا چکی تھی۔ ناشتے کی میز پر ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ چائے کا دوسرا کپ نشست گاہ میں پیا گیا۔
راحیلہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ صرف میں اور فوزیہ ہی سدرہ اور محمود کے پاس موجود تھے۔
"یہ راحیلہ کو کیا ہو گیا ہے؟ کمزور کمزور سی نظر آ رہی ہے۔ کافی کمزور بھی ہو گئی ہے۔ کیا بیمار رہی ہے؟" سدرہ کو چھوٹتے ہی گویا راحیلہ کے بارے میں ایسا پوچھنا کوئی حیرت کی بات نہ تھی لیکن مجھے یہ ضرور احساس ہوا کہ راحیلہ کی جسمانی بلکہ ذہنی تبدیلی کا بھی سدرہ نے فوراً نوٹس لیا تھا۔ حالانکہ وہ خود بے چاری پریشان تھی۔
اب یہ وقت تو راحیلہ کے موضوع پر بات کرنے کا نہ تھا اس لیے میں نے بھی بہانہ بنا دیا۔
"ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔ تم بتاؤ، سفر خیریت سے گزرا؟ کوئی تکلیف، پریشانی تو نہیں ہوئی؟ میری مراد کسی خطرے سے ہے۔"
سدرہ نے ایک گہری سانس لی مگر جواب محمود نے دیا۔ بولا۔
"سہراب میاں! کراچی کے حالات تو بہت خراب ہو گئے تھے۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ وہاں کیا چل رہا ہے۔ بڑی مشکل اور احتیاط کے ساتھ ہمیں وہاں سے نکلنا پڑا۔"
"میں نے ہی سدرہ کو مشورہ دیا تھا۔ سجاد اب کھل کر دشمنی پر اتر آیا ہے۔" میں نے بھی گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ان حالات میں ان کا زیادہ عرصہ وہاں رہنا خطرے سے خالی نہ ہوتا۔"

"سب کچھ تو ختم ہو گیا۔" سدرہ پژمردہ اور دکھی لہجے میں بولی۔ "پہلے پاپا چلے گئے اور اب ماما بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ میں تو دنیا میں اکیلی رہ گئی۔" کہتے ہوئے وہ آخر میں سسک پڑی۔ بے بسی سے چائے کا کپ اس نے تپائی پر رکھ دیا تھا۔
"حوصلہ رکھو سدرہ!" فوزیہ نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ جا بیٹھی۔ سدرہ کو فوزیہ کے رویے نے کچھ حوصلہ دیا اور اس نے فوزیہ کے اپنے قریب بیٹھتے ہی اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ فوزیہ بہت پیار سے اسے تھپکنے لگی۔
"سہراب میاں! اب تو بس آپ ہی سدرہ بی بی کی امید ہیں۔" محمود میری طرف دیکھ کر بولا۔ "اس مردود اور سفاک انسان نے تو اس کو کہیں کا بھی نہ چھوڑا۔ ڈر تھا کہ وہ اب سدرہ بی بی کو نقصان پہنچا دیتا، اس لیے میں انہیں یہاں لے آیا۔"
"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" میں نے محمود کی طرف دیکھ کر کہا۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا، انکل مشتاق کی طرح محمود بھی سیٹھ شکور کے اولین وفاداروں میں سے ایک تھا۔ گورا چٹا اور درمیانی عمر کا یہ آدمی غیر شادی شدہ تھا۔ البتہ مشتاق نے تو اپنے مالکان پر جان نثار کر دی تھی اور پسماندگان میں ایک بیوہ اور دو بچے چھوڑے تھے۔ ان کی کفالت کا مستقل بندوبست بقول سدرہ کے، ہی کر دیا گیا تھا۔ اب محمود تھا، جس نے سدرہ کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔
"محمود صاحب! انکل مشتاق کی وفاداری کی طرح آپ کی بھی سدرہ سے وفاداری ہر شک و شبے سے پاک ہے۔"
"نہیں سہراب میاں! میں تو جتنا بھی کروں، وہ سیٹھ صاحب مرحوم کے احسانوں کے آگے کچھ نہیں جو وہ مجھ پر کرتے رہے ہیں۔ کبھی موقع ملا تو آپ کو بتا دوں گا۔ تب آپ فوری فیصلہ کیجیے گا کہ میں نے تو اب تک ان کی بیٹی کے لیے کچھ بھی کیا، ان کے احسانوں کے بدلے میں۔"
"نہیں محمود! ایسا مت کہیں۔ آپ نے بھی میری خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال رکھی ہے۔" سدرہ دھیرے سے فوزیہ سے الگ ہو کر بولی۔ "ورنہ مشتاق کی موت کے بعد تو میں یہی سمجھی تھی کہ آپ میرا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔"
"پلیز سدرہ بی بی!" محمود نے ٹوک دیا۔ "ایسی باتیں مت کریں۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ایک دن سب نے ہی مرنا ہے لیکن دیکھا جائے تو سب سے بڑا ایثار و قربانی سہراب میاں نے دی ہے۔" کہتے ہوئے اس نے میری جانب توصیفی نظروں سے دیکھا۔

"اس میں بھلا کیا شک ہے۔" سدرہ نے بھی اس کی تائید میں فوراً میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "سہراب نے تو وفاداری کی انتہا کرتے ہوئے اپنا گھر بار سب ہی قربان کر دیا اور اب بھی میری خاطر اپنی اور اپنے پیاروں کی جانیں خطرے میں ڈالے ہوئے ہے۔ حالانکہ میں نہیں سمجھتی کہ پاپا نے ان پر کوئی احسان کیا ہوگا۔" سدرہ کی یہ صاف گوئی قابل داد تھی۔ محمود بولا۔
"اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ ہم پر اصل اور بالفرض احسان اپنے سہراب میاں کا ہے۔"
"نہیں محمود صاحب! ایسا مت کہیں۔ سیٹھ صاحب مرحوم، اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت بخشے، ان سے فیکٹری کا ہر ملازم خوش اور مطمئن تھا۔" میں نے کہا۔
"ہم تو ان کے نمک خوار تھے۔ میں کیسے یہ سب برداشت کر لیتا کہ جرائم پیشہ عناصر انہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ میں کچھ بھی نہ کر سکا اور دشمن اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہوتے رہے۔" کہتے ہوئے میں نے بھی اپنا سر ایک طرح کی ندامت تلے جھکا سا لیا۔
محمود یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آن بیٹھا اور میرے کاندھے پر محبت اور شفقت سے ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔
"ایسی بات نہ کرو سہراب میاں! تم نے اپنے سیٹھ صاحب کے لیے بہت بڑی قربانیاں دی ہیں اور کیا کیا ہے کہ اب بھی دے رہے ہو۔ باقی یہ تمہارا کہنا غلط ہے کہ تم نے کچھ نہیں کیا۔ اگر تم بروقت سیٹھ صاحب کو مطلع نہ کرتے تو فیکٹری تباہ ہو جاتی۔ نہ صرف یہ کہ ہزاروں غریب لوگوں کی جان بھی خطرے میں پڑ جاتی اور وہ بے روزگار بھی ہو جاتے۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعد میں سیٹھ صاحب دشمنوں کی سازش کا شکار ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، تو بیٹا! یہ سب تقدیر میں لکھا تھا۔ تمہاری مدد کے سبب ہی تو سدرہ بی بی آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے، تم نے تو ان کے دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں ورنہ ان کی چیرہ دستیاں جانے مزید کیا کیا گل کھلاتیں۔ اب بھی وہ تمہاری طرف سے بہت ڈرے ہوئے ہیں۔"
"محمود صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سہراب!" سدرہ نے بھی اس کی تائید میں مجھ سے کہا۔ وہ اب خود کو کافی سنبھال چکی تھی پھر ایک ممنون بھری نگاہ فوزیہ پر ڈالتے ہوئے مجھ سے دوبارہ مخاطب ہو کر بولی۔

"دنیا میں ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔ تمہارے باپ کے پاس لوگوں اور دولت کی کیا کمی ہے۔ وہ بیرونِ ملک جا کر بھی تو اپنا علاج کروا سکتے ہیں؟"

"یہ بلڈ کینسر کی ایک خطرناک قسم ہے۔ لاعلاج ہے۔" نگہت آنسو پونچھ کر بولی۔ اسی اثنا میں شگفتہ خاتون اندر داخل ہوگئیں۔ ان کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ انہیں شاید نگہت نے سب بتا دیا تھا۔ وہ خاموش تھیں۔ قریب رکھی تپائی پر انہوں نے ٹرے رکھ دی۔

"بیماری، صحت یابی اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "مگر ایسے انسان کو اپنے گناہوں سے تائب ہو کر بارگاہِ الٰہی کے حضور سجدہ ریز ہو جانا چاہیے مگر افسوس اور معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کے برعکس میں نے کل بھی ان سے ملاقات کے دوران ایسی ذرا جھلک بھی نہ دیکھی۔ وہ اب بھی اپنی فرعونیت پر قائم ہے۔ اسے کوئی شرمندگی یا احساسِ ندامت تک نہیں۔ گناہ اور لذتِ گناہ پر انسان اپنے دل میں ذرا سی شرم اور ندامت بھی پیدا کر لے تو بھی خدا معاف کر دیا کرتا ہے مگر......"

"تمہاری انہی باتوں نے انہیں طیش دلا دیا تھا ورنہ وہ......" نگہت کہتے ہوئے ایک دم خاموش ہوگئی۔ شاید اس کے پاس میرے تبصرے کے بعد کہنے کو کچھ بچا ہی نہ تھا۔ آگے بولی۔

"تم پاپا کو معاف کر دو۔"

"میرے معاف کرنے سے کیا ہوگا؟"

"میں نے تمہارے لیے پاپا سے بات کی تھی۔ وہ تم سے دشمنی ختم کرنا چاہتے ہیں۔"

"میرے لیے اب اس بات میں کوئی کشش نہیں رہی ہے۔" میں نے روکھے انداز میں کہا۔ "جو شخص خود لاچار، بے بس اور مکافاتِ عمل کی زد میں آیا ہوا ہو، بھلا وہ کسی کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔" میرے لہجے میں طنزیہ تلخی کی کاٹ اتر آئی تھی۔

"ان سے کہو اپنے جرائم کا اعتراف کریں اور خود کو قانون کے حوالے کر دیں۔ اپنی گزشتہ گناہ آلود زندگی سے تائب ہو کر بچی کھچی زندگی کا ایک ایک پل مسجد میں رہتے ہوئے اللہ کی عبادت میں گزار دیں۔" شگفتہ خاتون جو چائے کی ٹرے رکھنے کے بعد ہمارے قریب ہی ایک کرسی پر خاموشی سے براجمان تھیں، ایک دم درمیان میں بولیں۔

ان کی بات غلط نہ تھی۔ یہی کچھ میں بھی چاہتا تھا البتہ نگہت نے تڑپ کر ماں کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں اور چہرے سے جھلکتا [illegible] معدوم بھی ہوگیا۔ وہ شاید جواب میں ماں سے کچھ جلا کٹا کہنے والی تھی لیکن میرے سامنے ان کا لحاظ کر گئی۔ میں نے بات بدلنے کی خاطر کہ کہیں دونوں ماں بیٹی کے درمیان کوئی نیا تنازع شروع نہ ہو جائے، نگہت سے پوچھا۔

"چودھری جی برادران اور ان کے خطرناک کارندوں کے بارے میں تم نے کوئی بات کی تھی اپنے پاپا سے؟"

"ہاں۔" نگہت نے اثبات میں سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ اس درمیان میں شگفتہ خاتون نے چائے بنانے کے لیے ہمیں متوجہ کیا۔

وہ چائے بنا رہی تھیں اسی لیے مجھے بھی ایک کپ اٹھانا پڑا۔ ایک گھونٹ لیتے ہوئے میں نگہت کے چہرے کی طرف تکتا رہا۔

"وہ کہہ رہے تھے یہ معاملہ بہت آگے جا چکا ہے۔ انہوں نے میرے سامنے اسی وقت ان لوگوں سے ٹیلی فون پر رابطہ بھی کیا تھا۔ بڑے چودھری شاہ جی نے تمہارے بارے میں بڑے گھناؤنے الزامات لگاتے ہوئے پاپا کو بتایا تھا کہ تم نے ان کے گھر پر ان کی عزت اور غیرت پر حملہ کیا ہے۔ ان کی جوان بیوی کو ورغلا کر بھگا کر لے گئے ہو۔ یہی نہیں، اس کے یار (بھولا) کی بھی اس سلسلے میں پوری پوری مدد کی جسے بعد میں ہلاک کر دیا گیا۔"

"لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ میری بہن اور منگیتر فوزیہ کا انہوں نے کیا حشر کیا؟" میں نے تڑپ کر کہا۔ "کیا دونوں خواتین میری عزت اور غیرت نہیں تھیں؟ پھر مجھے بھی قید میں رکھا حالانکہ ہم نے تو ان کا (چودھری جی برادران کا) کچھ نہیں بگاڑا تھا۔"

"ہاں، تم نے اس بارے میں مجھے جو کچھ بھی تفصیل سے بتایا تھا، وہ میں پاپا کے گوش گزار کر چکی ہوں۔ پاپا نے بھی اس حوالے سے انہیں سمجھایا تھا مگر......"

"یہ ان کی ہٹ دھرمی ہے۔" میں نے درمیان میں اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ جب تک میرے مقابلے میں رہیں گے، میری ان سے دشمنی چلتی رہے گی۔"

"ہو سکتا ہے آگے جا کر پاپا یہ سب سنبھال لیں۔" نگہت نے ہولے سے کہا۔ اس کی آواز مجھے کھوکھلی محسوس ہوئی۔ یوں جیسے وہ مجھے ٹال رہی ہو۔

میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک شگفتہ خاتون درمیان میں بولیں۔ مخاطب اپنی بیٹی ہی تھی۔

"میرا خیال ہے بیٹی! تم اب سہراب بیٹے سے مقصد

[illegible] بھی دیکھتے رہیں گے۔"

[illegible] نے چونک کر شگفتہ خاتون کو دیکھا [illegible] منتظرانہ نظریں وہاں سے گھوم کر نگہت کے [illegible]

"[illegible] مقصد کی بات؟ وہ کیا ہے؟" میرے منہ سے [illegible] نگہت نے ایک گہری سانس لی اور [illegible] پہلے اس کی طرف دیکھا نہ جانے یہ کوئی اشارہ [illegible] شگفتہ خاتون خالی کپ اور ٹرے اٹھا کر [illegible] کمرے سے نکل گئیں۔

[illegible] اندر سے مضطرب...... اور الجھن آمیز تجسس کا [illegible] کہ جانے اب نگہت کیا کہنے والی تھی؟

"[illegible] پاپا نے تم سے ایک اور اہم موضوع پر بھی [illegible] مقصد ہرگز ہرگز تم سے اس دن بحث [illegible] کرنا نہ تھا۔"

[illegible] آہستہ آہستہ اور دھیرے سے بولنے [illegible] اس کے چہرے پر جمی رہیں۔ ایک ذرا توقف کے بعد وہ آگے کہنے لگی۔ "لیکن [illegible] اچانک وہاں دیکھ کر ان کے اندر کا دبا ہوا غبار [illegible] ان پر جنون طاری رہنے لگا ہے [illegible] تمہاری بحث اور تلخ کلامی کے سبب میں بھی خود [illegible] اور تم سے بھی میری بدمزگی ہوگئی۔ میں اس کی معذرت چاہتی ہوں۔"

"مجھے وہ مقصد کی بات بتاؤ جس کے لیے تم نے یہاں یعنی اپنی ماں کے گھر میں قدم رکھا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ اب مجھے لگا جیسے وہ ماں کی محبت میں یہاں نہیں آئی تھی۔

"مقصد کی بات یہ ہے کہ اس وقت پاپا کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ وہ شاید اپنی انا یا اور کسی خاطر تم سے [illegible] پلیز! میں تم سے اپنے پاپا کی مدد کے لیے درخواست کرتی ہوں۔" کہتے ہوئے اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور اس کی آنکھیں پھر نمناک ہو گئیں۔

"تم یہ مجھے کون سا لطیفہ سنا رہی ہو نگہت صاحبہ؟" [illegible] اور بگڑا اجنبی لہجے میں اس سے کہا۔ "یا پھر تمہارے اس باپ کی یہ کوئی نئی سازش ہے؟" نہ چاہتے [illegible] میرے لہجے میں طنزیہ تلخی گھل آئی۔

نگہت نے مجھے بڑی دردبھری نگاہوں سے دیکھا پھر الجھی الجھی بولی۔ "سہراب! تم تو ہمارے ہمدرد اور خیرخواہ تھے پھر اب تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ تم ایک دم میرے ساتھ دشمنی پر کیوں اتر آئے ہو؟"

"تھا...... لیکن اب نہیں ہوں۔" میں نے بدستور بے رخی اور سنگدلی سے کہا۔ "تمہارے کل والے رویے نے مجھے زبردست شاک پہنچایا ہے نگہت صاحبہ!" میرے لہجے میں اجنبیت گھل آئی تھی۔ آگے بولا۔

"مجھے وقت اور تمہارے اس روز کے سلوک نے باور کرا دیا تھا کہ سچ اور سچائی کو تسلیم کرنا ایک الگ حقیقت ہے، اس کا ساتھ دینا دوسری۔ تمہیں اپنے باپ کے کالے کرتوتوں کا اچھی طرح علم ہو چکا ہے مگر باوجود اس کے تم نے اس کی حمایت میں میرے ساتھ ہی نہیں بلکہ اپنی ماں کے ساتھ بھی ناروا برتاؤ کیا اور ایک مجرم شخص کی حوصلہ افزائی کی۔"

"میں نے ان کے غلط کاموں پر سرزنش کی ہے۔ میں نے ان کے کسی غلط کام پر کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی اور نہ ہی کرنا چاہتی ہوں۔ نہ ہی کبھی ان کا ساتھ دیا۔" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

"میں تو...... میں تو مشکل وقت میں ان کا ساتھ دینا چاہتی ہوں۔ وہ بیمار ہیں، عارضۂ قلب کے ہی نہیں عارضۂ خون کے ایک خطرناک مرض میں بھی مبتلا ہیں۔ وہ چند دنوں کے مہمان ہیں۔ آخر تمہیں اور امی کو یہ بات کیوں نہیں سمجھ میں آرہی ہے؟ کیا ایک بیٹی اپنے باپ کو مرتا ہوا دیکھ سکتی ہے؟" وہ رو پڑی۔ میرے دل کو تھوڑا دھچکا سا لگا۔ سوچا کہیں میں اس کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کرنے لگا تھا۔ چند لمحے اسے غور سے روتا اور سسکتا ہوا دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"یہ رونا دھونا بند کرو اب...... رہی بات تمہارے پاپا کی مدد کی تو میرا ابھی اس سلسلے میں وہی جواب ہے جو تمہیں امی (شگفتہ خاتون) دے چکی ہیں۔ یعنی انہیں اپنے جرائم کا اعتراف کرتے ہوئے خود کو قانون کے حوالے کر دینا چاہیے اور گناہوں کی معافی کے لیے اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جائیں۔"

"تم کوئی مدد نہیں کرو گے؟" وہ ایک دم رونا بند کر کے میری طرف دیکھ کر بولی۔

"میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم سنو گے تو تمہیں معلوم ہوگا نا۔"

"اچھا بولو، میں سن رہا ہوں۔"

"تم چاہو اور ان کی مدد کرو تو میرا خیال ہے کہ پاپا کی حالت کافی حد تک سنبھل جائے گی۔" وہ پُرامید ہو کر بولی۔

دروازے سے بھی نکل سکتا تھا مگر ظاہر ہے وہ میں استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

رانگا بابا کے بے سدھ وجود کو کاندھے پر لادے میں تیزی سے چلتا ہوا پہلی والی گلیاری میں آ گیا۔ یہاں آتے ہی کسی نے مجھے عقب سے پکارا۔

شام اتر آئی تھی اور دھند بھی گہری ہوتی محسوس ہوئی مگر دیکھنے والے نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں اس کے پکارنے پر رکا نہیں بلکہ دوڑنا شروع کر دیا۔ تب اس کمبخت نے شور مچا دیا۔

یکدم سرے پر ایک درمیانے قد و قامت کا آدمی برآمد ہوا۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا پھر جب تک اس کی سمجھ میں کچھ آیا، میری ایک لات اس کے پیٹ پر چل چکی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر اپنے دونوں ہاتھ گرنے سے بچاؤ کے لیے پھیلاتا ہوا گلیاری کی دونوں دیواروں کے درمیان میں گرا تو میں اس کے سینے اور پیٹ پر چڑھ کر راستہ پار کر گیا۔

کچھ آنے جانے والے لوگوں نے حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثر سے میری طرف دیکھا بھی اور یکدم مجھے۔۔ راستہ دینے کے لیے ایک طرف کو ہٹ گئے۔ وہ شاید اسے بھی کوئی جادو ٹونا سمجھے تھے۔ یہ میرے حق میں بہتر ہی رہا۔

میں تیزی سے نیم تاریک گلی میں دوڑتا ہوا اپنی کار تک پہنچا اور جب اس بارہ من کی لاش کو کار کی پسنجر سیٹ پر ڈال کر ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا، سامنے سے تین چار ہیولے دوڑتے ہوئے آتے نظر آئے۔

ایک نے پستول نکال لیا مگر کسی وجہ سے وہ فائر کرنے سے معذور ہی رہا۔ شاید مجھے ڈرانا چاہتا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے اس کی غصے بھری چیخ سنائی دی۔

”رک جاؤ، ورنہ گولی چلا دوں گا۔“

میں اس کی پروا کیے بغیر سیٹ سنبھال چکا تھا اور کار کا انجن بھی اسٹارٹ کر دیا تھا۔

میں اس کی مجبوری سمجھ چکا تھا۔ میں نہایت مہارت سے کار کو تیزی سے ریورس کرتا ہوا گلی سے نکل گیا پھر کار مین روڈ پر چڑھا دی اور اس کی رفتار بتدریج بڑھاتا چلا گیا۔

یہ سب کچھ میں نے اتنی تیزی سے نمٹایا تھا کہ کسی کو میرے اس جارحانہ عمل کی توقع بھی نہ ہو سکتی تھی۔

میں آناً فاناً کار لے کر سیدھا جگنو کے ذاتی ٹھکانے فارم ہاؤس پر پہنچا۔

وہ تو نہ ملا البتہ نزاکت اور راڑاں وہاں موجود تھے۔ شبیر کو کچھ دنوں کے لیے آرام کرنے اس کے گاؤں بھیج رکھا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی نزاکت اور راڑاں بے حد خوش ہوئے مگر دوسرے ہی لمحے فوراً میرا حکم ماننے کے لیے مؤدب ہو گئے۔

”کار میں شکار موجود ہے۔ اسے نکالو اور اس کی اچھی طرح مشکیں کس ڈالو۔“ میں نے کہا۔ دونوں نے پلک جھپکتے ہی یہ کام نمٹایا۔

اس دوران میں نے اس کی انگلی سے وہ سیاہ مہروالی انگوٹھی اتار لی تھی۔

چند منٹوں بعد رانگا بابا کو ہوش آ گیا۔ اسے میرے سامنے ننگے فرش پر ڈال دیا گیا تھا۔ نزاکت نے پانی کی بالٹی اس پر الٹ دی تھی۔

میں سرکنڈوں کے مونڈھے پر براجمان تھا اور اسے ہوش میں آتے دیکھ کر دانت پیستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

راڑاں اور نزاکت گن بدست ہو چکے تھے۔ میرے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ رانگا بابا کو ہوش آیا تو وہ بری طرح بوکھلایا اور گردن گھمانے لگا پھر سر ادھر ادھر مارنے لگا جیسے کوئی کوڑیالا سانپ ہو پھر خود کو رسن بستہ حالت میں یوں پایا کہ اپنی ہیئت کذائی پر اس کے منہ سے بھیڑیے جیسی غراہٹیں برآمد ہونے لگیں۔

میں اپنی ٹانگیں پھیلائے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ نزاکت اور راڑاں اس کے دائیں بائیں مستعد موجود تھے۔

مجھے دیکھتے ہی رانگا بابا سمجھ گیا کہ یہ کارستانی میرے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ انگارے برساتی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے وہ شعلہ فشاں آواز میں بولا۔

”کس نے جرأت کی ہے یہ؟“

”یہ جرأت کہاں ہے رانگا جی!“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”ابھی یہ میرا ایک ہلکا پھلکا نمونہ ہے۔“

”بھسم ہو جاؤ گے...... راکھ ہو جاؤ گے۔“ رانگا بابا غرایا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے نفرت و غیظ کے شعلے پھوٹنے لگے۔

”یہاں تمہاری یہ ڈرامے بازی نہیں چلے گی، رانگا بابا!“ میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

وہ اب یک ٹک میری ہی جانب گھورنے لگا۔ ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ اس کے بدہیئت ہونٹ بدبدانے لگے۔ دفعتاً مجھے ایک جھٹکا لگا۔

میری سانسیں یکلخت ہی بے ترتیب سی ہونے لگی تھیں۔

> معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی طلوع داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

خون آشام

عائشہ نصیر

ڈھلتے حسن سے خوفزدہ ہو کر اور بچے کُھچے حسن کو سنبھالنے کی خاطر اکثر لوگ ظلم کی تمام حدیں پار کرلیتے ہیں اور ستم یہ کہ انہیں یہ ظلم کبھی ظلم ہی نہیں لگتا بلکہ اسے تو وہ اپنی بیماریوں کا علاج سمجھتے ہیں... وہ بھی حسن کی حفاظت کا ایسا ہی مرکز تھا جہاں عجیب طریقے سے علاج کیا جاتا تھا کیونکہ... ڈھلتے حسن کی حفاظت بھی کرنا ضروری تھا۔

انتہائی عبرت اثر خونیں کھیل اور دولت کمانے کا

سفاک عمل

ایڈنبرگ، 1910ء

یہ ایک خوبصورت چھوٹا سا پرائیویٹ پارک تھا۔ ان عمدہ مکانات کے سامنے بنے اس پارک میں صرف یہاں کے رہائشیوں کو ہی داخل ہونے کی اجازت تھی۔

"میں نے اسے یہیں پایا۔" پارک کیپر اینگس میک کوری نے ہانپتے ہوئے کہا۔ وہ اب بھی حیران تھا، جیسا کہ باقی سب تھے کیونکہ پولیس افسران کے سامنے سیاہ چغے میں پڑی ہوئی وہ دبلی لڑکی غیر معمولی طور پر سفید تھی۔ چہرہ، سینہ،

میں ایسے بخارات ہیں جو ان بیماریوں اور وباؤں میں حصہ ڈالتے ہیں جن سے شہر دوچار ہے۔ اس کے علاوہ جو آپ نے پوچھا، پرنس اسٹریٹ گارڈنز، سبز رنگ کا پھولوں والا حصہ آپ نے دیکھا ہوگا جو پرانے اور نئے ٹاؤن کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک گندی جھیل کا مقام تھا جس میں سارا پانی بہہ جاتا تھا۔ اسی میں لاشیں پھینک کر سڑنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ لوگوں نے اسے ویمپائر سے منسوب کر لیا اور طرح طرح کی کہانیاں بنالیں۔''

اوکٹیویا نے غور کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ویمپائر؟''

''یہ ایک عجیب بات ہے مس ٹین بیکرا لیکن اٹھارویں صدی میں ایک قیاس شدہ ویمپائر کے شکار کی لاشیں اولڈ ٹاؤن میں ملی تھیں۔ گردن پر زخم کے ساتھ خوبصورت، نوجوان خواتین جن کے جسموں میں خون ایک قطرہ بھی نہیں تھا لیکن گزشتہ چند ہفتوں میں جو دو لاشیں ملی ہیں، وہ نیو ٹاؤن میں ملی ہیں اور انہیں بھی اسی طریقے سے قتل کیا گیا ہے۔''

''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کا ویمپائر اولڈ ٹاؤن سے نئے شہر میں منتقل ہو گیا ہے؟''

اوگلوی دھیرے سے ہنسا۔ ''درمیان میں ڈیڑھ صدی کے طویل آرام کے ساتھ..... اور ایک اخبار نے دعویٰ کیا ہے کہ نیو ٹاؤن بنانے کے لیے کی جانے والی کھدائی نے جھیل میں پڑے ایک ویمپائر کو پریشان کر دیا ہے اور اس نے پھر سے اپنی سرگرمیاں شروع کر دی ہیں۔''

''اور آپ کو کیا لگتا ہے؟''

''ایک طبی آدمی کے طور پر میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ دونوں لاشیں بے خون تھیں لیکن میں نے پیتھالوجسٹ کی رپورٹس نہیں دیکھی ہیں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تاہم اتنا یقین ضرور ہے کہ یہ ایک دلچسپ معاملہ ثابت ہوگا لیکن میری پیاری مس ٹین بیکرا براہ کرم اس تاثر سے گھبرائیں نہیں کہ ہمارے شہر میں ایک ویمپائر موجود ہے۔ یہ معاملہ بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔ آپ کو ڈریکولا کی نسل یا ایسی کسی مخلوق کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں بالکل پریشان نہیں ہوں۔ محض تجسس کا شکار ہوں، ڈاکٹر! لیکن کیا یہ بھی کوئی یادگار ہے؟''

اس گلی کا دہانہ جس طرف کھلا، اوکٹیویا کو نقش و نگار سے مزین ایک شاندار عمارت کا احاطہ نظر آیا۔

''سینٹ جائلز کیتھیڈرل۔'' اوگلوی نے جواب دیا۔

''میں آپ کو کسی وقت اندر لے جاؤں گا اور مونٹروز کے گریٹ مارکوئیس کا مقبرہ دکھاؤں گا جو بادشاہ کا وفادار تھا۔ اسے اس جگہ سے [illegible]''

وہ متاثر تھی اور اسے عجیب بھی لگ رہا تھا [illegible] کی قابل تاریخ اس شہر میں قدم قدم پر بکھری ہوئی ہے [illegible] پیچیدہ، خمدار گلیوں سے گزرتے ہوئے [illegible] ان کی بھی اب پہاڑی کے دامن میں [illegible] کھڑے سیاہ پتھر سے بنے اس بلیک ہاؤس کو [illegible] اوکٹیویا کو احساس ہوا [illegible] محافظ کی طرح [illegible] کے بھاری [illegible]

شیلڈ اٹھائے ہوئے دو دم والا عقاب [illegible] ریڈ ورلڈ کے الفاظ تھے۔ وہی کوٹ آف آرمز [illegible] بھی اس نے دیکھا تھا۔ اوگلوی نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ''بلیک ہاؤس میں خوش آمدید۔'' اس نے خوشدلی سے کہا۔ وہ ایک اونچی چھت والے بڑے ہال میں کھڑے تھے۔ اوکٹیویا نے اردگرد کی دیواروں پر نظر ڈالی۔ چمکتی، گھورتی ہوئی آنکھیں بارہ سنگھے کے سروں میں سے کچھ کے درمیان جالے تھے۔

''آہ ہاں، میں [illegible] ذوق رکھتا ہوں۔'' اوگلوی نے کہا۔ ''مجھے امید ہے [illegible] ان کا خیال رکھیں گی لیکن وہ یہاں آئیں گی۔ مجھے [illegible] ہماری شادی کے بعد۔''

''ہاں..... میں نے آپ کی منگنی کے بارے میں سنا تھا اور جان کر بہت خوشی ہوئی تھی۔'' لیکن اوکٹیویا کو [illegible] یقین نہیں تھی۔ ویلری بروڈرک جس سے اس کی ملاقات آکسفورڈ میں ہوئی تھی، جواب اس پُرجوش نوجوان ڈاکٹر کی منگیتر تھی، ایک بہت ذہین اور قابل اسکالر تھی۔ کیا پرانے سینگوں اور ان اونچی تاریک دیواروں کے لیے اپنا کیریئر ترک کر دے گی؟

اس نے اوگلوی سے پوچھا۔ ''کیا وہ اپنے آکسفورڈ کالج کی پرنسپل نہیں رہے گی؟''

''شاید..... اگر وہ چاہے۔'' اوگلوی نے گلا صاف کر کے کہا۔ ''یہ گھر اصل میں میرے جیکب آبا و اجداد کی طرف سے میری میراث ہے۔ وہ میری نئی تحقیق میں دلچسپی لے سکتی ہے۔ آئیں میں آپ کو اپنی لیبارٹری دکھاؤں۔''

بلوط کے ایک بھاری دروازے کے پیچھے جدید اور قدیم تضادات کا امتزاج تھا، جس میں ایک بھاری گندگی بھری ہوئی تھی۔

''اوہ!'' اوکٹیویا نے کہا۔ ''آپ کے پاس یہاں

بھی یہ کیمسٹری روم ہے۔ کاش آکسفورڈ میں سینٹ ہیلینا میں بھی ایسی لیبارٹری ہوتی جس میں طالبات تجربات کرتیں لیکن یہ قدیم گھر [illegible] گیس کی سپلائی سے منسلک نہیں ہے۔ برنرز کو گیس کیسے فراہم کرتی ہے؟''

اوگلوی نے بینچ کے نیچے اشارہ کیا۔ ''ایک پروپین ٹینک جس میں ربڑ کی ٹیوب ہے جسے برنر سے جوڑا جا سکتا ہے، جب میں اسے استعمال کرنا چاہوں۔ میری تحقیق ہیماٹولوجی میں ہے۔ خون کا مطالعہ لیکن یہ آپ کو بور کر دے گا اور اس کے علاوہ یہاں کی ہوا بھی تازہ نہیں ہے۔ آیئے ہم ہال میں واپس چلتے ہیں۔''

جیسے ہی وہ واپس آئے، اوگلوی نے دیوار پر نصب تمام بارہ سنگھوں کے سروں کو دیکھا۔ ''اپنی لیبارٹری لگانے کے علاوہ میں نے گھر میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں لیکن مجھے اردگرد کے ان تمام مردہ جانوروں کی پروا نہیں ہے۔ کیا آپ نے بھی شکار کیا ہے، مس ٹین بیکر؟''

''اوہ..... کبھی نہیں۔'' اوکٹیویا نے جھرجھری لی۔ وہ کچھ اور کہتی مگر پتھر کی سیڑھیاں اترتی اس بھورے بالوں والی بوڑھی خاتون کو دیکھ کر اس نے اوگلوی کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ مسز لاٹن ہیں، میری ہاؤس کیپر۔'' اوگلوی نے کہا۔ ''اس وقت سے یہاں موجود ہیں جب میں ایک چھوٹا بچہ تھا لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ جلدی ہمیں چھوڑ کر جانے والی ہیں۔''

''خوش آمدید، مائی ڈیئر!'' مسز لاٹن نے کہا۔ ''آؤ، کچھ ناشتا کرو۔''

اوکٹیویا کو چائے اور اسکونز کے لیے ڈرائنگ روم میں لے جایا گیا۔ گھر حیرت انگیز طور پر آرام دہ تھا۔ دبیز قالین بچھا ہوا، اگرچہ بروکیڈ کے پردے اس کی اسٹونز ونڈوز پر تھوڑے عجیب لگ رہے تھے۔

اوکٹیویا کو بھوک لگی تھی۔ اس نے ایک بسکٹ توڑ کر منہ میں رکھا اور مخملی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے یہاں بلائے جانے کی وجہ جاننے کے لیے بے تاب تھی اور اوگلوی کے بات شروع کرنے کی منتظر تھی جو اس کے ساتھ والی کرسی سنبھال چکا تھا مگر اس کے بجائے اس نے مسز لاٹن کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ اوکٹیویا کو حیرت ہوئی۔ کیا یہ کہانی مسز لاٹن سے شروع ہوئی تھی؟

''مسئلہ میرا ہے مس ٹین بیکرا مسٹر اوگلوی کا نہیں۔ انہوں نے مجھے آپ سے بات کرنے کا مشورہ دیا ہے۔'' مسز لاٹن اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر بولی۔ ''آپ نے دیکھا، میں جلد ہی ریٹائر ہونے والی ہوں اور سچ کہوں تو میرے لیے اب ان سیڑھیوں پر چڑھنا، اترنا مشکل ہو گیا ہے اس لیے میں نے سوچا کہ مجھے نیو ٹاؤن میں ایک گھر مل جائے گا جہاں ہر طرح کی سہولت، نئی سیڑھیاں اور جدید پلمبنگ ہوگی۔ میں اسے ایک پرتعیش گیسٹ ہاؤس کے طور پر چلانا چاہتی ہوں۔ آپ جانتی ہیں کہ آرام دہ ماحول کے متلاشی لوگ ایسی جگہوں کے لیے اضافی ادائیگی کرنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔''

''ایک بہترین تصور لگتا ہے۔'' اوکٹیویا نے کہا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اوگلوی ایک وفادار پرانی ملازمہ کو سیٹل ہونے میں بھرپور مدد کرتا۔ ''تو مسئلہ کیا ہے؟'' اوکٹیویا سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

مسز لاٹن کے چہرے پر اضطراب چھا گیا۔ ''دراصل..... مجھے وہاں ایک گھر پسند آیا اور میں نے اسے پانچ سال کے لیے لیز پر لے لیا لیکن اب مجھے بالکل یقین نہیں ہے کہ یہ گیسٹ ہاؤس کے لیے ایک موزوں جگہ ہوگی۔ کم از کم اس طرح کا نہیں جس طرح میں نے سوچا تھا۔ اوہ ڈیئر! مجھے دوسری عورت کے بارے میں بات کرنا ہمیشہ مشکل لگتا ہے۔''

اسی وقت اوگلوی کھنکھارتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میری پیاری مس ٹین بیکرا میرے کچھ معاملات ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

''پلیز، آگے بڑھیے۔'' اوکٹیویا اب تجسس کا شکار ہو گئی تھی۔

''یہ معاملہ میرے گھر کے سامنے والے گھر کا ہے۔'' مسز لاٹن آگے کو جھکتے ہوئے رازداری سے بولی۔ ''عورتیں وہاں بہت جلدی جلدی پہنچتی ہیں اور رات کے وقت بھی مجھے باہر بگھیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔''

''آپ کے خیال میں یہ کیا ہو سکتا ہے؟ بس ایک خراب شہرت والے گھر کا معاملہ؟'' اوکٹیویا کو اس میں کوئی سنگینی نظر نہیں آئی۔

مسز لاٹن نے اپنے چہرے کے سامنے رومال رکھا، جب اس نے سرگوشی کی۔ ''مجھے ڈر ہے..... بات اس سے کچھ زیادہ ہے۔''

''پھر یقیناً متعلقہ حکام سے.....''

''مس ٹین بیکرا ایک موقع پر جب ایک خاتون آئی اور میں اپنی کھڑکی سے دیکھ رہی تھی، اس نے اپنے چہرے پر شال گرائی ہوئی تھی۔ دوسری بار میں نے اسے پہچان

"اور وہ آدمی؟" اوکٹیویا کی نظر پھر سے سڑک کے پار گئی۔

"مجھے نہیں معلوم، مس!"

ایک بہت ہی مختلف حلیے کی لڑکی نمودار ہوئی تھی۔ دبلی پتلی، سرخ چمکیلی کیپ میں ملبوس جس کے نیچے اوکٹیویا ایک گندا اور پھٹا پرانا لباس دیکھ سکتی تھی۔

وہ بے چینی سے گھر کے سامنے منڈلا رہی تھی جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی ہو کہ اندر جائے یا نہیں پھر آخر کار اس نے سیڑھیاں چڑھ کر دروازے پر دستک دی تو ایک بازو باہر آیا اور اسے اندر کھینچ لیا۔

"وہ بھی ان لڑکیوں میں سے ایک لگتی ہے جو اسٹیشن پر منڈلاتی ہیں۔" ایلس نے کہا۔ "وہ شہر کے اس سرے پر کیا کر رہی ہے؟ مجھے حیرت ہے۔"

اوکٹیویا کو وہ لڑکیاں یاد آگئیں جو اس نے ویورلے اسٹیشن کے باہر دیکھی تھیں۔ عامیانہ لباس میں کسی مرد کی توجہ پانے کی امید میں۔

"ہمیں دیکھتے رہنا چاہیے۔" اس نے پھر سے کرسی سے ٹیک لگائی۔

"آپ نے بہت صبر کا مظاہرہ کیا، مس!" ایلس متاثر تھی۔

"جیسے چوہے کے سوراخ میں بلی۔" اوکٹیویا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تفتیش میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

اس کے بعد سڑک کے اس پار گھر میں کچھ خاص نہیں ہوا۔ اوکٹیویا نے ایک صاف ستھری سی کیب پکڑی اور سڑک پار کی۔ دروازے کے پاس ایک چھوٹی سنہری تختی تھی اور وہ اسے نیچے سے بھی پڑھ سکتی تھی۔

"امبی!" خوبصورت حروف میں اور نیچے لکھا تھا۔

"میڈم امبلیک!"

وہ واپس آئی اور ایلس سے پوچھا۔ "کیا تم نے کبھی میڈم امبلیک یا 'امبی' کے بارے میں سنا ہے؟"

"نہیں مس! ابھی نہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

"اس وقت کوئی سوال نہ کرو۔ میں اسی مشہور ڈیپارٹمنٹل اسٹور تک جانا چاہتی ہوں جہاں وہ لباس ملتے ہیں۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟ میں یہاں کی دکانوں سے واقف نہیں ہوں۔"

☆☆☆

یہ ایک عظیم الشان عمارت تھی جس میں وہ دونوں داخل ہوئیں۔

"کافی شاندار ہے۔" حال ہی میں بنائے گئے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی گیلریوں کے اوپر رنگین شیشوں کی شاندار چھت کو دیکھتے ہوئے اوکٹیویا نے تبصرہ کیا۔

"آپ سب سے پہلے کون سا شعبہ دیکھنا چاہیں گی؟ اس طرف جیولری ہے، بہت ہی خوبصورت ڈیزائن کی۔" ایلس نے پوچھا۔

"مجھے پہلے ریشم کے لباس دیکھنے چاہئیں۔"

ایلس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "اس عورت کی طرح جو بگھی سے نکلی تھی؟ ٹھیک ہے کہ یہ دوسری منزل پر ہے لیکن ہم لفٹ لے سکتے تھے۔ مجھے لگتا ہے اسکاٹ لینڈ میں صرف ایک ہی ہے۔"

ایک وردی والا لڑکا انہیں اندر لے گیا۔ سنہری لوہے کے کام کے ساتھ آئینے دار لفٹ۔ اوکٹیویا کے پاس اپنے عکس پر غور کرنے کے لیے چند لمحے تھے۔ ایک متناسب جسامت کی عورت جس کے سنہرا سیاہ بال پیچھے بندھے ہوئے تھے اور گہری سبز آنکھیں۔

دبیز قالین والے "لیڈیز ڈریسز" کے فلور پر کھڑی نیچرز والے ماڈلز کھڑے مختلف رنگوں کے ملبوسات کی نمائش کر رہے تھے۔ گلابی، ست رنگی اور سنہری ریشم سے لپٹے ربن لگے اسکرٹس اور ایک طرف چمکتے ہوئے لکڑی کے کاؤنٹر پر ایک سیلز مین کھڑا تھا۔

اوکٹیویا نے سرخ اور گلابی رنگوں میں کچھ لمبے لباس دکھانے کو کہا۔ ایلس، جو واضح طور پر اس کی ملازمہ کے طور پر ساتھ گئی تھی، اس وقت اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔

"نہیں...... کچھ اور گہرے رنگ میں۔" اوکٹیویا نے کہا اور تب ہی ایک اسٹرابیری پنک ان کے سامنے نمودار ہوا۔

"پیارا ہے۔" ایلس نے سرگوشی کی۔

"یہ ٹھیک ہے۔" اوکٹیویا نے اطمینان سے کہا۔

"اسے پیچ اسکن سلک کہا جاتا ہے میڈم!" اسسٹنٹ نے کہا۔ "یہ ہمارا سب سے مہنگا میٹریل ہے اور صرف شیڈز میں ملتا ہے۔"

"ہاں...... اور مجھے یاد آرہا ہے کہ میں نے ایک خاتون کو ایسا ہی لباس پہنے دیکھا ہے۔" اوکٹیویا نے سرسری انداز میں کہا۔

"اوہ ہاں، میڈم! بہت ہی منفرد اور یادرہ جانے والا لباس ہے نا؟ وہ خاتون یقیناً کاؤنٹیس آف......" اس نے کچھ کہتے کہتے بروقت پھسلتی زبان کو روک لیا۔

اوکٹیویا نے روایتی نسوانی جوش و خروش کا مظاہرہ

کرتے ہوئے فوراً اس کی بات اچک لی۔ "اوہ...... واقعی؟ کاؤنٹیس؟ آپ کا مطلب ہے کہ میں ایک کاؤنٹیس جیسی لگ سکتی ہوں؟"

"جی ہاں، میڈم! ابھی حال ہی میں ہمارے پاس اتنا میٹریل تھا کہ کاؤنٹیس آف ڈنبرک کے لیے لباس بنایا جاسکے۔ ہم نے جتنا کپڑا خرچ کیا، اس کے بعد ہمارے پاس کچھ بچا ہوا اسٹاک میں ہے لیکن اگر آپ کہیں تو ہم فرانس سے مزید میٹریل منگوا سکتے ہیں اور میں نے آپ کے سامنے اس معزز خاتون کا نام ظاہر کر دیا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ آپ سمجھ دار ہیں، میڈم!" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا جو یہی ظاہر کر رہا تھا، اوکٹیویا سمجھ گئی۔

"ہاں بالکل، آپ بے فکر رہیں۔" اوکٹیویا نے اسے تسلی دی۔ "آپ مجھے کچھ اور ملبوسات دکھا سکتے ہیں؟ شاید کم قیمت والے میٹریل میں۔"

"یقیناً میڈم! ہمارے پاس کچھ ریڈی میڈ ہے۔ ہم اسے آپ کے سائز کے مطابق فٹ کر دیں گے۔" اس نے ایک نوجوان عورت کو اشارہ کیا جو انہیں اس حصے میں لے گئی جہاں ایک قطار میں تیار ملبوسات لٹکے ہوئے تھے۔

تمام رنگوں کو دیکھنے کے بعد اور ایلس کے مختلف مشوروں کے بعد اوکٹیویا نے سبز رنگ میں ایک اونچے کالر والے لباس کا انتخاب کیا جو اسے اتنا فٹ لگا جیسے اس کے لیے بنا گیا ہو۔

"مجھے خاص طور پر یہ پسند ہیں۔ لانگ پف سلیوز۔" اوکٹیویا نے کہا جب وہ ایک قدآدم سنہری فریم والے آئینے کے سامنے اپنا جائزہ لے رہی تھی، یہ سوچتے ہوئے کہ یہ چونکا ہے۔ دوسرے مواقع پر ہمیشہ اپنے آپ سے بحث کرتی رہتی تھی۔

اسسٹنٹ نے کہا۔ "جی ہاں، یہ چوڑی آستینیں آج کل فیشن میں ہیں۔"

"اچھا میٹریل ہے اور کافی نرم بھی۔ مجھے یہ پسند آیا۔" اوکٹیویا نے اسے فائنل کر دیا۔

"سبز رنگ ہر کسی پر نہیں جچتا لیکن آپ کی سبز آنکھوں پر بالکل مکمل کھلتا ہے۔ آپ خود کو ایک اور ماڈرن لگ رہی ہیں۔ ایک نئے میز کٹ میں بالکل اسی طرح جیسے ملکہ الیگزینڈرا لگتی ہے۔" ایلس جوشیلے انداز میں بولتی جا رہی تھی۔

اسسٹنٹ نے لباس پیک کرتے ہوئے تاہم کان اسی طرف لگا رکھے تھے۔ "اوہ ہاں، میڈم! ہمارے پاس نچلے فلور پر خواتین کا ہیئر ڈریسنگ سیلون بھی ہے۔"

"شکریہ...... مگر اس کی ضرورت نہیں۔" اوکٹیویا نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے اپنی تازہ ترین شاپنگ وصول کی۔

مسز لافٹن کے گھر واپس آکر اس نے وہ لباس اسی وقت پہن لیا۔

"یہ آپ پر پیارا لگ رہا ہے، مس!" ایلس کی نظروں میں ستائش تھی۔ "بالکل ایڈنبرگ کی کسی امیر خاتون کی طرح۔"

اوکٹیویا نے آئینے میں دیکھا اور اعتراف کیا کہ یہ واقعی اس پر جچ رہا تھا۔

"شکریہ میرے ساتھ آنے کے لیے، ایلس! لیکن اب مجھے اس گھر کے اندر اکیلے جانا پڑے گا۔ پہلے کچن سے آٹا لے آؤ۔"

ایلس کچھ نہیں سمجھی مگر بھاگ کر اس کا حکم بجالائی۔

کچھ دیر بعد وہ سڑک کے اس پار گھنٹی بجا رہی تھی۔

دروازہ اس سنہری بالوں والے آدمی نے کھولا جس کی وہ پہلے بھی جھلک دیکھ چکی تھی لیکن اس بار اس کا چہرہ دیکھ کر جو جھٹکا لگا وہ بہ مشکل خود کو سنبھال پائی۔ کبھی خوبصورت رہا ہوگا وہ چہرہ مگر اب گہرے زخم کے نشانوں کے باعث کافی بھیانک لگ رہا تھا۔ خاص طور پر وہ بدنما زخم جو پیشانی سے ہونٹوں تک آتا ہوا چہرے کو دو حصوں میں بانٹ رہا تھا۔

"میں یہاں امبی کے سلسلے میں آئی ہوں۔" اوکٹیویا نے نارمل سا انداز اپنانے کی کوشش کی۔

اس نے ایک نظر اسے دیکھا پھر سر جھکا کر وہ اپنی گہری اور نرم آواز میں بولا۔ "کیا آپ یہاں چند منٹ انتظار کریں گی میڈم؟"

کچھ دیر بعد وہ یہ کہتے ہوئے واپس آگیا۔ "مجھے افسوس ہے میڈم کہ ابھی کنسلٹنٹ آج دستیاب نہیں ہے۔ آپ کو کل آنا چاہیے۔ اور ویسے میڈم! آپ تو سفید پڑ گئی ہیں۔ کیا ہوا؟"

"میں کچھ اچھا محسوس نہیں کر رہی۔ کیا آپ مجھے اپنے باتھ روم کو استعمال کرنے کی اجازت دیں گے؟" اس نے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھتے ہوئے درخواست کی۔

اس میں کچھ منٹ لگے لیکن خوبصورت سیرامک ٹائلوں والے بے عیب باتھ روم میں واضح طور پر کوئی عجیب بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ ربڑ کی ٹیوب باتھ ٹب کے اوپر لٹکی ہوئی تھی۔ چھت سے لٹکا ہوا شاور فٹ تھا۔ کسی بھی صورت میں، کسی قابل احترام شہری کے خلاف یہ کوئی جرم نہیں تھا کہ وہ یہ سامان باتھ روم میں رکھتے ہوں۔ اس کے

بعد وہ واپس آگئی۔

☆☆☆

اوکٹیویا اور ایلس نے اپنی نگرانی جاری رکھی تھی لیکن ان ملاقاتیوں میں سے کوئی بھی انہیں دوبارہ نظر نہیں آیا جو نکل آئے تھے۔

رات میں ایلس نے ڈرائنگ روم میں سو کر گزارا تاکہ اوکٹیویا کو اپنی سیٹ چھوڑنے کی ضرورت نہ پڑے اور آخرکار ... رات کے وقت وہی گل والی خوبصورت عورت گھر سے نکلی اور گھر کے سامنے موجود بگھی کی جانب بڑھی۔ ملازمہ بھی تھی جس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی مدد کی۔ اوکٹیویا اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی۔ اس کے بعد وہ سونے کے لیے اپنے بستر پر چلی آئی تھی۔ کھڑکیاں اس نے کھول دی تھیں کہ اگر رات میں کوئی بھی آئے تو اسے پتا چل سکے۔

"ایلس! مجھے کپڑے بدلنے ہیں۔ کیا تھوڑی دیر کے لیے تم آکر دیکھو گی؟" اگلی صبح اس نے ایلس کو بلایا۔ اوکٹیویا کوئی بھی لمحہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔

سات بجے کے قریب جب اوکٹیویا اپنے بالوں کو باندھ رہی تھی، ایلس نے اسے آواز دی اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر سیڑھیوں سے نیچے گھر سے باہر بھاگتے ہوئے نکلی۔

اوکٹیویا نے بالوں کو کھلا چھوڑ کر کافی افراتفری میں دوڑ کر کھڑکی کی طرف آئی تو دیکھا کہ ایلس سڑک کے اس پار والے گھر کے سامنے ایک موٹے لڑکے سے گتھم گتھا تھی جو کسی اجنبی زبان میں کچھ چلا رہا تھا پھر اس نے ایک زوردار دھکے کے ساتھ ایلس کو تقریباً ایک طرف پھینک دیا اور اندر جا کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

ایلس لرز رہی تھی جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر اوکٹیویا سے ٹکرائی۔

"تم وہاں کیا کرنے گئی تھیں اور وہ کیا کہہ رہا تھا؟" اوکٹیویا اسے شانوں سے تھامے بدحواسی سے پوچھنے لگی۔

"یہ اس کی باتوں کو سمجھنے کا وقت نہیں ہے میڈم!" موٹے لڑکے کے ساتھ زور آزمائی میں ایلس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"مگر تم وہاں کرنے کیا گئی تھیں؟"

ایلس نے جواب دینے کے بجائے اپنا ہاتھ اوکٹیویا کی سمت بڑھایا۔ اس کی سفید بھنچی ہوئی انگلیوں میں ایک سفید کپڑا دبا ہوا تھا۔ ایلس نے مٹھی کھولی تو اوکٹیویا کو اس سفید رومال کے ایک کونے میں سرخ نشان نظر آیا۔

"وہاں دیکھیے میڈم!" ایلس نے سامنے والے گھر کی ایک نالی کی جالی کی طرف اشارہ کیا۔ "انہوں نے بالٹی الٹی ... ساتھ بہہ گیا لیکن میں نے اسے ہمارے سامنے کی کھڑکی سے دھوپ میں چمکتے دیکھا۔"

"کیا دیکھا ایلس؟" اوکٹیویا نے بے تابی سے پوچھا۔

"خون، مس!" اس نے سرسراتی آواز میں سرگوشی کی۔ "اسی لیے میں بھاگ کر گئی اور رومال اس میں ڈبویا تاکہ اگر کوئی مجھ پر یقین نہ کرے تو میرے پاس ثبوت ہو اور اس موٹے نے مجھے دیکھ لیا۔" اس نے بات ختم کر کے ایک گہری سانس لی۔

"لیکن ایلس تم نے کیوں سوچا کہ تمہیں اس طرح کے ثبوت کی ضرورت ہوگی؟" اوکٹیویا نے پرسوچ انداز میں سڑک کے پار دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مس! میں صرف ایک نوکر ہوں اور اس گھر میں رہنے والی کوئی اہم عورت ..... اگر وہ اپنی نالی میں خون کی موجودگی کی کوئی جھوٹی کہانی بنائے گی تو کون ایک نوکر کی بات پر یقین کرے گا اسی لیے ..... میرے ذہن میں یہ آئیڈیا آیا۔" ایلس سنجیدگی سے بولی۔

"ویل ..... تم نے بہت ہوشیاری دکھائی ایلس!" اوکٹیویا نے ایک نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "لیکن اس مرحلے پر پولیس کو خون کی اطلاع دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ کچن میں موجود کسی میٹ کی کٹنگ کا بہانہ بنا سکتے ہیں۔ انہیں سرچ وارنٹ کے لیے اس رومال سے زیادہ کی ضرورت ہوگی۔"

"تو کیا میں اس رومال کو پھینک دوں؟" ایلس مایوس سی ہو گئی۔

"اوہ نہیں، ایلس ابھی اس پر کام کرنا ہے۔ کیا تم ڈاکٹر اوگلوی کو جا کر میرا پیغام دے سکتی ہو؟"

☆☆☆

آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کے ساتھ ایک لمبا نوجوان بھی تھا جس نے اسکاٹش اسکرٹ پہن رکھا تھا۔

"یہ لچلن ہے، منگو کا پوتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں اپنی آنکھیں کھلی رکھے۔ یہ آپ دونوں خواتین کی دیکھ بھال کرے گا اور چونکہ اس گھر کے سامنے پارک میں سے ایک راستہ ہے اس لیے وہ رات کو اس گیٹ پر بھی نظر رکھے گا۔"

"مجھے یقین ہے کہ ہم زیادہ محفوظ محسوس کریں گے۔" اوکٹیویا نے کہا۔ "مجھے بتاؤ لچلن! کیا تم گیلک بول سکتے ہو؟"

نوجوان نے سر ہلایا۔ "ہاں میڈم! لیکن میں نے

صرف خرگوش اور اپنے چھوٹے موٹے جانوروں کو ہی شکار کیا ہے۔ ابھی تک گن چلانے کی نوبت نہیں آئی ہے۔"

"بہتر، امید ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" اوکٹیویا نے کہا۔ "لیکن لچلن کے پاس پھر بھی حفظ ماتقدم کے طور پر ایک گن کا ہونا ضروری ہے اور ..... ایک اور معاملہ بھی ہے جس پر مجھے پیغام بھیجنا پڑا۔ سائنس روانہ ہو گیا ہے۔ اس کے لیے ہمیں سکنگن ہال واپس جانا پڑے گا۔" اس نے اوگلوی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا خیال ہے، یہ انسان کا خون ہوگا یا جانور کا؟" اس نے رومال کو احتیاط سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ اس وقت اوگلوی کی لیبارٹری میں تھے۔ "کیا ایسا کوئی ٹیسٹ ہے؟" اوکٹیویا نے پوچھا۔

"ہاں ایک ٹیسٹ کیسل میئر کچھ سال پہلے آیا تھا۔ 1903 میں میرے خیال میں۔ اگر یہ انسانی خون ہے تو یہ گلابی رنگ میں تبدیل ہو جائے گا۔ میں ابھی دکھاتا ہوں۔"

ایلس نے احتیاط سے رومال اس کے حوالے کر دیا۔

"اچھا، اب ہمیں پہلے یہ طے کرنا ہے کہ کیا یہ سرخ بھورے داغ درحقیقت خون کے ہیں یا کسی اور چیز کے، جیسے چقندر، بوٹ پالش ..... کیونکہ عدالت ثبوت مانگے گی۔" اوگلوی نے شیلف کے اوپر ایک شیلف سے ایک چھوٹی سی بوتل اتاری۔ "اسے phenolphthalein کہتے ہیں۔ میں اسے یہاں ایڈنبرگ میں اپنے سائنسی سپلائرز سے حاصل کرتا ہوں۔" اس نے تھوڑی سی روئی لے کر بوتل میں ڈبوئی اور پھر اسے داغ کے ایک حصے پر لگا دیا۔ "اب ہمیں تھوڑا سا ہائیڈروجن پیرو آکسائیڈ شامل کرنا ہوگا۔"

اوکٹیویا کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے داغ پہلے گلابی اور پھر آرکڈ پنک میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

اوگلوی بے اختیار مسکرانے لگا۔ "سائنس کوئی بے رنگ پیشہ نہیں ہے۔ اب یہ تو ثابت ہو گیا کہ داغ واقعی خون کا ہی ہے لیکن انسانی ہے یا نہیں اس مرحلے تک پہنچنے کے لیے مجھے کسی سے ... یہاں ایڈنبرگ میں ایک آدمی ہے جو اس پر کام کر رہا ہے۔ انسانی خون کا پتا لگانے کے طریقوں پر اس کی تحقیق ابھی جاری ہے۔ ہمیں اولڈ ٹاؤن میں اس سے ملنا پڑے گا۔"

اگلی صبح ایک بگھی کو سکنگن ہال میں طلب کیا گیا۔ منگو، اوگلوی اور اوکٹیویا کے پیچھے کھڑا ہوا۔ "سیڈی؟" اوکٹیویا نے پوچھا۔

"وہ آرام کر رہی ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن ہمیں راستے کے اس حصے پر پیدل جانا پڑے گا جہاں سے کوئی بگھی بھی نہیں گزر سکتی۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ واقعی بہت تنگ گلیوں سے گزر رہے تھے۔ اوکٹیویا ان گلیوں میں ایک ویمپائر کا تصور کر سکتی تھی۔ ایک تاریک شخصیت ایک دیوار سے دوسری دیوار تک اڑتی ہوئی۔ یہ اولڈ ٹاؤن ویمپائر کے لیے ایک بہترین رہائش گاہ اور شکار کے لیے ایک بہترین میدان تھا۔

اوگلوی نے بات جاری رکھی۔ "اور ہم یونیورسٹی کے قریب ہیں۔ ایڈنبرگ یونیورسٹی سولہویں صدی میں قائم ہوئی تھی اور یہاں سے یونیورسٹی کی عمارتیں اولڈ ٹاؤن اور نیو دونوں میں ہیں۔"

مختلف گلیوں میں انہیں گھومتے ہوئے نہ جانے کتنی دیر ہو گئی اور تب ڈاکٹر اوگلوی پیچھے کی طرف ایک وسیع گلی کی طرف مڑ گیا جہاں ایک گھر باقی گھروں سے زیادہ بڑا تھا جس میں کھڑکیوں کے بغیر سیاہ دیواریں تھیں۔

اوگلوی نے اوکٹیویا کی سمت دیکھا۔ "آپ ایڈنبرگ کے ایک عظیم شخص سے ملنے والی ہیں۔ وہ ذرا عجیب لگ سکتا ہے لیکن شہر کے بہترین دماغوں میں سے ایک ہے اور مجھے علم ہے کہ میں بھی اس کا شاگرد ہوا کرتا تھا۔"

اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر لگی لوہے کی ایک پرانی کنڈی کو کھڑکھڑایا۔

منگو نے کہا۔ "جناب! میں باہر انتظار کروں گا۔ میں ان ٹیسٹ ٹیوبوں اور کیمیکلز سے دور رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے گھر کی ایک دیوار کے ساتھ پوزیشن سنبھال لی۔

دروازہ ایک ادھیڑ عمر ملازمہ نے کھولا۔

"آہا، ڈاکٹر اوگلوی .....! آپ یہاں انتظار کریں۔ میں پروفیسر کو آپ کی آمد سے مطلع کرتی ہوں۔" وہ انہیں ہال میں لے کر آئی، وہ ان خوفناک بیرونی گلیوں کے بالکل برعکس تھا جس سے وہ گزر کر آئے تھے۔ فرش پر بچھا گہرا سرخ قالین اور چمڑے کی کرسیاں، دیواروں پر اسکاٹ لینڈ کے مناظر کی آئل پینٹنگز۔

وہ بوڑھا آدمی جب کمرے میں داخل ہوا تو نہایت گرمجوشی سے اوگلوی کو گلے لگایا۔

"آہ، لارنس، میرے لڑکے! تمہیں یہاں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔" پھر وہ اوکٹیویا کی طرف متوجہ ہوا۔

"اوہ مائی ڈیئر لارنس! ہمارا تعارف کرواؤ ..... اور بتاؤ یہ دورہ کام کے متعلق ہے یا صرف مجھ سے ملنے آئے

اور اس کے خون کے نشانوں والے رومال کی گواہی نہیں بلکہ برطانیہ کے سب سے ممتاز سائنس دانوں میں سے ایک کی حمایت بھی ہے۔''

''بہترین۔'' اوگلوی بھی پُرجوش ہوئی جو ایک آرام دہ رات کی پُرسکون نیند کے بعد تازہ دم ہو کر پہنچی تھی حالانکہ خواب میں ایک کریہہ صورت ویمپائر اس کے پیچھے پڑا رہا تھا۔

''ایک اور چیز۔'' اوگلوی نے مزید کہا۔ ''پروفیسر نے اپنے نوٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ہمیں ٹیسٹ کا رزلٹ تو بھیج رہا ہے لیکن اس کے بدلے ہمیں اس کو اپنی تفتیش میں شامل کرنا ہوگا۔''

''اوہ اچھا...... ہم اسے اس کیس سے دور رکھ بھی نہیں سکتے تھے۔'' اوکٹیویا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''وہ ہماری ٹیم میں ایک بہترین اضافہ ہوگا۔''

اس دن اوگلوی اور پروفیسر کالن براؤن کے ساتھ اوکٹیویا پولیس اسٹیشن پہنچی۔ ڈیسک کے پیچھے چہرے پر بھاری بھرکم مونچھیں لیے اور چمکتے بٹنوں سے مزین یونیفارم میں موجود وہ آفیسر پولیس سپرنٹنڈنٹ میکٹن تھا۔

وہ ان کی کہانی سن کر بے یقینی سے لہجے میں بولا۔ ''میں ایک آدمی بھیج سکتا ہوں جو اس معاملے کی تحقیقات کرے...... لیکن اگر یہ خون انسانی ہے۔''

''ہے!'' کالن براؤن نے اس کی بات کاٹی۔ ''یہ انسانی خون ہی ہے۔''

''اچھا جناب! لیکن یہ پھر ایک نجی معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔ اسقاطِ حمل یا اس طرح کے خواتین سے متعلق مسائل۔ اگر میں نے ایسے کسی پرائیویٹ بزنس میں اپنی ناک گھسائی تو میں پھنس بھی سکتا ہوں۔''

''یہ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ ہمارا یقین کرو، یہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔'' اوکٹیویا نے جس انداز میں کہا، میکٹن اس کے لہجے سے جان گیا کہ وہ ایسی عورت ہے جو کبھی ہار نہیں مانے گی۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم [illegible] قسم کی ہو۔'' وہ اوکٹیویا کی سمت دیکھ کر مسکرایا۔

ان کے جانے کے بعد میکٹن نے ادھیڑ عمر اور قابلِ اعتماد سارجنٹ جیمیسن کو بلایا۔

''جیمیسن! میں تمہیں اسپیشل پروٹیکشن ڈیوٹی پر بھیج رہا ہوں۔ اس معاملے میں اسکاٹ لینڈ کا ایک مشہور سائنس دان شامل ہے اور ہمیں اس کا بہت خیال رکھنا ہے۔ تم [illegible] لے سکتے ہو اور ہوشیار رہنا۔''

☆☆☆

اس دوپہر اوکٹیویا [illegible] چلی آئی جہاں اوگلوی اور کالن براؤن اس کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں سارجنٹ جیمیسن بھی آ گیا۔

اب وہ سڑک پار کر کے اس گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سارجنٹ نے دروازے کی سیڑھیاں چڑھیں جس پر سنہری پلیٹ کے الفاظ تھے۔ ''[illegible]''

وہی موٹا ملازم دروازے پر [illegible] ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ وہ اب بھی [illegible] کراہنا بند کر لیا اور ایک طرف ہو گیا۔

''اندر آئیے...... میں میڈم [illegible] کو بلاتا ہوں۔'' وہ بڑبڑایا۔ اس کی کھردری آواز سے [illegible]

وہ انہیں ایک پُرتعیش [illegible] روم میں [illegible] چلا گیا۔ یہاں کے پردے گلابی تھے اور بڑی بڑی کھڑکیوں سے آنے والی سورج کی کرنیں [illegible] رہی تھیں۔ اوکٹیویا نے [illegible] جگہوں سے کتنے مختلف [illegible]۔ وہ اس [illegible] سجی ہوئی آئی اور اسے ایک عجیب چیز نے چونکا دیا۔ [illegible] پھر وہ جانی پہچانی تھی مگر عجیب اس لیے لگ رہی تھی کہ اس ماحول سے میل نہیں کھا رہی تھی۔

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں اور پھر سیڑھیاں اترتے قدموں کی۔

ایک مختصر سی خوبصورت عورت نمودار ہوئی۔ وہ قد میں پانچ فٹ سے بھی کم تھی۔ بالوں میں پھول پروئے، چہرے پر غازے کی تہ چڑھائے اس کا لباس سیاہ تھا اور بازو پر وائٹ پرلز کا بریسلٹ جھول رہا تھا۔

''میں میڈم [illegible] ہوں۔ آپ کو یہاں کیا چیز کھینچ کر لائی ہے سارجنٹ؟'' اس نے بڑی نخوت سے سارجنٹ کو مخاطب کیا تھا۔

''میرے پاس سرچ وارنٹ ہے میڈم! اور ہم آپ کا اصل نام جانتے ہیں۔ ہم نے اسے نیو ٹاؤن اور شپ کے سٹی ریکارڈ میں پایا۔'' جیمیسن نے میکٹن کے دستخط اور سیاہی کی مہر کے ساتھ ایک کاغذ نکالا۔ ''[illegible]، کیا آپ ہی ہیں؟''

''ہاں...... میں ہوں۔'' اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔

''کیا میں اس سرچ وارنٹ کی وجہ جان سکتی ہوں؟''

توجہ ہٹ جائے۔''

اس نے وہ چاندی کی سیٹی واپس اپنے ویسٹ پاکٹ میں ڈالی۔

''ہاں، یہ آستینیں تو مونس میک کو بھی چھپالیں گی۔''

منگو ابھی تک اپنی لاٹھی کو چوکنا انداز میں پکڑے ہوئے تھا۔

''میں نے آپ کا پیچھا کیا ماسٹر اوگلوی۔ مجھے اپنے قبیلے کے سردار کا دفاع کرنے سے کوئی چیز نہیں روک سکے گی۔ حالانکہ آپ نے مجھے پیچھا نہ کرنے کا کہا تھا لیکن مس ٹیمن بیکر نے مجھ سے کہا کہ میں تھوڑی دیر بعد آؤں اور سگنل کا انتظار کروں اور پھر جیسے ہی میں نے اشارہ سنا تو ہائی لینڈ ہرن کی طرح چھلانگ لگادی۔''

''تو مس ٹیمن بیکر! آپ اور منگو نے پہلے سے ہی بیک اپ تیار کر رکھا تھا۔'' پروفیسر کاکس براؤن متاثر تھا۔ ''قابلِ تعریف۔''

اینجلیک وونچ ہتھکڑی میں اپنے ہاتھوں کو گھما رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔ غصے سے اس کے نقوش بگڑ گئے تھے۔ جیمیسن نے اب اسے پکڑ رکھا تھا۔

''اور وہ رہا آپ کا ایڈنبرگ ویمپائر۔'' اوکٹیویا نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اور اس کا ساتھی کافی عرصے سے یہ گھناؤنا کاروبار کر رہے تھے۔ اسٹیشن ایک بہترین جگہ تھی بدقسمت مایوس لڑکیوں کو گھیرنے کی۔ ایسی ضرورت مند، غریب لڑکیاں جو اپنے چھوٹے قصبوں سے کام کی تلاش میں آتی ہیں، یہ انہیں ملازمت کا جھانسا دے کر پھنسا لیتے اور یہاں لے آتے اور پھر عمل شروع ہوجاتا۔ لڑکی کو باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر اور ریسیور پہلے سے ہی تیار ہوتا۔''

''ریسیور؟'' جیمیسن نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں...... سوسائٹی کی ایک معزز اور امیر مگر ڈھلتی عمر کی عورت جو اپنی جوانی اور خوبصورتی کھو رہی ہوتی۔ کیا آپ نے کاؤنٹیس الزبتھ باتھوری کے بارے میں نہیں سنا؟''

''آں...... مم...... مبہم طور پر۔'' اوگلوی نے سوچ کر کہا۔ ''ہنگری کی ایک رئیس عورت، جس نے اپنی جوانی بحال کرنے کے لیے نوجوان لڑکیوں کا خون پیا؟''

''ہاں، سولہویں صدی میں...... لیکن یہ جو کر رہے تھے یہ ایک جدید ورژن تھا۔ ایک نوجوان لڑکی سے ایک بوڑھی عورت کو خون کی منتقلی جو وصول کنندہ ہوتی۔ لڑکی کو باندھ کر غسل خانے میں رکھا جاتا تاکہ خون کے کسی بھی نشان کو آسانی سے ختم کیا جاسکے۔ گلے میں ایک کٹ لگا کر ربڑ کی ٹیوب ڈالی جاتی پھر ''وصول کرنے والے'' کے پہلو میں ایک چھوٹا سا کٹ لگایا جاتا۔ 17 ویں صدی میں ایسی کوششوں کے واقعات موجود ہیں۔ ان کے بعد سے کسی نے بھی یقیناً کام نہیں کیا۔ غریب بچیاں مر گئیں۔ جہاں تک خواتین کا تعلق ہے تو جنہیں ٹی بی جیسی بیماری تھی، انہیں خون کے انتقال سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ اپنے مقررہ وقت پر ہی مریں لیکن پھر بھی خواتین اپنی رنگت کو بہتر بنانے کے لیے ایسے خوفناک طریقے اپنانے سے نہیں چوکیں۔''

''ٹرانسفیوژن۔'' اوگلوی نے کہا اور کاکس براؤن کی طرف رخ موڑا جو کہہ رہا تھا۔

''طبی سائنس صدیوں سے کوشش کر رہی ہے لیکن یہاں ایڈنبرگ میں بیسویں صدی کے آغاز میں...... یہ واقعی سائنس کا ایک خوفناک اور غلط استعمال ہے۔''

''اور کبھی کبھی ماضی کی طرح یہ خوفناک حد تک غلط ہو جاتا ہے۔'' اوکٹیویا نے کہا۔ ''حقیقت میں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس نے کبھی کام کیا ہے۔ تم تو خود اس کا ثبوت ہو۔ کاربیری ہے نا؟''

نیم بے ہوش کاربیری نے آہستہ سے سر ہلایا اور اپنا چہرہ اوپر کیا۔

''تمہارے لیے یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو خوفناک حد تک غلط ثابت ہوا تھا اور ڈنبروک کی کاؤنٹیس کے لیے جس نے خود کو دنیا سے دور کرلیا، اس کے بھیانک نتائج نکلے۔ پتا نہیں وہ غریب عورت لوگوں کو کبھی اپنا چہرہ بھی دکھا پائے گی۔ وہ خون اس کے جسم میں بہہ تو گیا لیکن رخساروں اور ہونٹوں میں جم گیا جس سے نیکروسس کا عارضہ ہوگیا، یعنی گوشت کی موت ہوگئی۔ اس کی پلاسٹک سرجری ہوگی لیکن مجھے شک ہے کہ اس سے شاید ہی کچھ فائدہ ہو...... اور میڈم اینجلیک! اگر تم سمجھتی ہو کہ وہ اپنے چہرے کی ایسی حالت کے باعث تمہارے خلاف گواہی دینے نہیں آئے گی تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ اس کے بدلے کے جذبات شرم سے زیادہ طاقتور ہیں اور جہاں تک ویمپائر کا تعلق ہے تو ٹھیک ہے، لوگ وہی دیکھیں گے جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کٹلری کا ایک کانٹا، ایک سیاہ گاؤن اور بس...... ویمپائر تیار۔''

''لیکن یہ کتنا خوفناک ہے۔'' اوگلوی نے تاسف سے کہا۔ ''ایک معصوم انسان کے جسم کا سارا خون نچوڑ لینا۔''

''ہاں...... بہت۔'' اوکٹیویا نے دھیرے سے سر ہلایا۔

✖✖✖

لوگوں نے یہ تو محسوس کرلیا کہ غزالی میں کوئی زبردست تبدیلی آ چکی ہے۔ کسی نے ان سے پوچھا۔ ''امام غزالیؒ! آپ کہاں جانے کا قصد رکھتے ہیں اور کیوں؟''

امام غزالیؒ کا بچپنا عسرت، تنگدستی اور یتیمی میں گزرا لیکن ان میں علم حاصل کرنے کی جو تڑپ اور پیاس پائی جاتی تھی، اس نے زندگی کی ساری کڑواہٹوں کو دور کردیا۔ حصول علم کے بعد انہوں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو ہر تقریب میں مناظرے، بحث مباحثے جاری تھے اور ہر عالم دوسرے عالموں کو نیچا دکھانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ وہ بھی تقریبوں میں بلائے جاتے، وہاں بحث و مباحثے میں لگ جاتے اور سب ہی کو لاجواب کرکے خوشی محسوس کرتے۔ انہی تقریبوں کے مناظروں میں کامیاب ہونے والے کی حیثیت سے شہرت پاکر وہ سلجوقی دربار میں پہنچ گئے اور نظام الملک طوسی نے ان کو مدرسۃ نظامیہ بغداد کا شیخ المدرسہ بناکر بغداد روانہ کردیا۔ یہاں انہیں وہ شہرت حاصل ہوئی کہ اس عہد کے جملہ بڑے لوگ ان کے معتقد اور قائل ہوگئے مگر انہیں اس مقام پر بھی سکون نہ ملا۔ وہ روح کے سکون کی خاطر اب علوم ظاہری کے بجائے باطنی سکون کے متلاشی تھے اور انہیں یہ سکون تصوف میں ملا اور وہ صوفی فلسفی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

تلاش حق میں دردر کی خاک چھاننے والے ایک
مردِ حق کی ایمان افروز سوانح

امام غزالیؒ

ضیاء تسنیم بلگرامی

اللہ اکبر

امام غزالیؒ نے جواب دیا۔ ''میں نے ادھر تقریباً ایک سال بڑی پریشانی میں گزارا ہے۔ یہاں تک کہ تم لوگ بھی جانتے ہو کہ میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا اور تم لوگوں کا بھی میری حالت کو دیکھتے ہوئے یہی خیال تھا کہ اب شاید میں جانبر نہیں ہو سکوں گا۔ میں نے حالتِ خاموشی میں اپنے لیے اللہ سے دعا کی اور اس نے میری سن لی اور میں کچھ بات کرنے کا اہل ہو گیا چنانچہ میں نے اپنا یہ فرض جانا کہ اب مجھے اللہ کے گھر پہنچ کے اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ میں خانۂ کعبہ جا کے اپنے رب کا شکریہ ادا کروں گا اور وہاں عبادت اور ریاضت میں مصروف رہ کے اپنے دل و دماغ کو طمانیت بخشوں گا۔''

امام غزالیؒ اپنے بقول لطائف الحیل سے کام لے رہے تھے۔ ان کا ارادہ شام جانے کا تھا مگر بتا رہے تھے کہ وہ مکہ معظمہ جائیں گے۔

کچھ لوگ بے مروتی سے کام لے رہے تھے۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ امام غزالیؒ کسی بھی طرح بغداد میں رکنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں تو انہوں نے امام غزالیؒ کو خوف زدہ کیا۔ ''امام غزالیؒ! یہ مقام تمہیں نظام الملک طوسی نے دیا تھا۔ اب اگر حکومتی حلقے کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ تم کفرانِ نعمت کر رہے ہو تو اس کا تمہیں نقصان پہنچے گا اور پھر بھی کوئی اعلیٰ منصب حاصل نہیں کر سکو گے۔''

امام غزالیؒ نے جواب دیا۔ ''تم لوگ یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ میں حقیقتاً اپنے درس و تدریس کی یکسانیت سے تنگ آ گیا ہوں۔ اس لیے اپنے دل و دماغ کی معذوری کی وجہ سے بغداد سے نکل رہا ہوں۔''

سوالات کرنے والوں کا یہ خیال بھی تھا کہ شاید حکومتی ارکان سے کسی وجہ سے امام غزالیؒ کی ان بن ہو گئی ہو اور اوپر سے ان پر دباؤ ڈالا گیا ہو کہ یہ بغداد چھوڑ دیں۔

اس سوچ کے رکھنے والوں میں سے ایک نے امام غزالیؒ سے پوچھا۔ ''آپ کی کسی اہم شخصیت یا شخصیتوں سے ان بن تو نہیں ہو گئی اور اوپر سے اشارتاً آپ کو حکم دیا گیا ہو کہ آپ بغداد سے چلے جائیں؟''

امام غزالیؒ نے جواب دیا۔ ''نہیں! میرے مخلص ہمدرد! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے یہاں کے کسی بڑے سے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی اور وہ سب تمہاری طرح میرے ہمدرد اور مخلص دوست ہیں۔''

امام غزالیؒ نے ان سب کو اندر بلوا لیا اور یہ امراء امام غزالیؒ کے گھر کے ماحول کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہاں امام غزالیؒ کے پاس پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے اور جس حصے میں امام غزالیؒ لوگوں سے مل رہے تھے، یہ مستورات کا حصہ تھا۔ درباری امراء نے پہلے تو پورے گھر کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر ایک امیر نے پوچھا۔ ''اے غزالی! یہ گھر کے لوگ کہاں چلے گئے؟ یہ گھر تو بالکل خالی نظر آ رہا ہے۔ گھر کا ضروری سامان بھی نظر نہیں آتا؟''

امام غزالیؒ نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنے اہل و عیال کو اپنے سامان کے ساتھ طابران اپنے وطن بھیج دیا ہے اور کچھ دنوں بعد میں بھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

یہ امراء امام غزالیؒ کی باتوں سے حیرت میں پڑ گئے اور ایک نے پوچھا۔ ''یہ تو ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ بیماری سے نجات پانے کے بعد مکہ معظمہ جانا چاہتے ہیں لیکن گھر کی صفائی کو دیکھ کر یہ شبہ بھی ہو رہا ہے کہ اب آپ بغداد واپس نہیں آئیں گے۔''

امام غزالیؒ نے جواب دیا۔ ''دوستو! اگر بات تو یہ ہے کہ میں اپنے کام کی یکسانیت سے اکتا گیا ہوں اور جس کام میں دل و دماغ راغب نہ ہوں اس کام کو چھوڑ دینا چاہیے۔''

دوسرے امیر نے کہا۔ ''لیکن غزالی! اس درس گاہ میں اساتذہ نے اپنی زندگیاں گزار دیں مگر وہ یہاں کی یکسانیت سے بیزار نہیں ہوئے۔ تمہاری بیزاری کا اعلان ہمیں عجیب سا لگ رہا ہے۔''

امام غزالیؒ نے جواب دیا۔ ''دوسرے اساتذہ میرے جیسے نہیں تھے اور نہ ہی انہیں یہاں کی یکسانیت نے پریشان کیا ہوگا اس لیے ان سے میرا موازنہ نہ کریں۔''

ایک امیر نے کہا۔ ''امیر المومنین نے ہمیں آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ اگر آپ کو اپنے کسی درباری امیر سے تکلیف پہنچی ہو اور آپ کو بغداد چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہو تو آپ امیر المومنین سے مل کر تصفیہ کر سکتے ہیں۔''

امام غزالیؒ نے جواب دیا۔ ''میں ہر ایک سے یہی کہہ رہا ہوں کہ میرا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں اور نہ ہی مجھے کسی نے

بغداد چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔ دراصل میں اپنے دینی معاملے میں یہ سفر کر رہا ہوں۔ کبھی موقع ملا تو امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

امام غزالیؒ کے دینی معاملے نے سب ہی کو کچھ زیادہ حیران کر دیا کیونکہ امام غزالیؒ کا وہ کیسا دینی معاملہ ہے جس کے لیے انہیں بغداد چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ سارے دینی معاملات اور مسائل بغداد میں بھی حل ہو سکتے ہیں۔

ان امراء کے آنے سے پہلے امام غزالیؒ کے جو ہمدرد باتیں کر رہے تھے، اب ان کا یہ شبہ دور ہو گیا تھا کہ امام غزالیؒ پر اوپر سے کوئی دباؤ ڈالا گیا ہے اور امام غزالیؒ بغداد کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

دربارِ خلافت کے امراء نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''حضرت امام! آپ کو یہ بتانے آئے تھے کہ آپ کا بغداد سے چلا جانا امیر المومنین کو بھی پسند نہیں ہے۔ اس لیے بغداد چھوڑنے سے پہلے امیر المومنین کی پسند اور ناراضی کا خیال کیجیے گا۔''

امام غزالیؒ نے جواب دیا۔ ''میں اللہ کو راضی رکھنا چاہتا ہوں مگر یہ بھی نہیں چاہتا کہ میں اپنے طرزِ عمل سے مخلوق کا دل دکھاؤں۔''

امراء چلے گئے اور جو لوگ پہلے سے موجود تھے وہ بیٹھے رہے۔

امراء کے جانے کے بعد ان لوگوں نے امام غزالیؒ سے کہا۔ ''آپ کو خلیفہ کی رضامندی کے بغیر بغداد نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

امام غزالیؒ نے ان سب کو وہی جواب دیا جو تھوڑی دیر پہلے درباری امراء کو دے چکے تھے۔ ''میں اللہ کی رضا کو مقدم سمجھتا ہوں اس لیے دوسروں کی رضامندی میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔''

ان لوگوں نے گھر میں تھوڑا سا سامان موجود دیکھا تو اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اب شاید امام غزالیؒ میں نرمی پیدا ہو گئی ہے ورنہ یہ تھوڑا سا سامان بھی گھر میں نظر نہ آتا۔

لیکن آٹھ دس دن کے بعد لوگوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ امام غزالیؒ گھر کا بچا کھچا سامان بھی لوگوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ نقد رقم بھی لوگوں کو دی جا رہی ہے۔

ان کے ہمدردوں سے یہ منظر نہیں دیکھا جا رہا تھا۔ وہ امام غزالیؒ کو ایک بار پھر روکنے کی کوشش کرنے لگے لیکن جب معلوم ہوا کہ امام غزالیؒ نے اپنے پاس گزر بسر کے لیے تھوڑی سی رقم روک کر باقی دوسروں میں تقسیم کر دی ہے تو کسی نے انتہائی افسوس کے عالم میں دوسروں سے کہا۔ ''مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ بغداد اور مدرسہ نظامیہ کو کسی کی نظر لگ گئی ہے اور غزالی کے چلے جانے سے یہاں کی چہل پہل اور علمی رونق ختم ہو جائے گی۔''

امام غزالیؒ نے بغداد کو چھوڑ دیا اور شام روانہ ہو گئے۔ فی الحال ان کی منزلِ مقصود دمشق تھی۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے دمشق پہنچ گئے۔ اب وہ مجاہدے اور ریاضت میں اپنے شب و روز گزارنے لگے۔ انہیں تصوف کا علم تو حاصل تھا مگر تزکیۂ نفس، اخلاق و رنگی و تہذیب اور اللہ کے ذکر سے اپنے قلب کو مصفا کرنا تھا، وہ اس میں مشغول ہو گئے۔ جامع مسجد میں اعتکاف اختیار کیا۔ کسی دن مسجد کے مینارے پر چڑھ جاتے اور تمام دن دروازہ بند کر کے بیٹھے رہتے۔

لوگوں نے امام غزالیؒ کو ان اعمال میں مشغول دیکھا تو انہیں کوئی جستجو بھی اس لیے نہیں ہوئی کہ یہاں اکثر صوفی حضرات اسی طرح ریاضت اور مجاہدے کرتے رہتے تھے۔

دو سال تک مشغول رہنے کے بعد انہیں بیت المقدس کا خیال آیا اور یہاں سے وہ بیت المقدس چلے گئے۔

ان دنوں امام غزالیؒ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور دنیا انہیں اپنے لیے فضول نظر آ رہی تھی۔

بیت المقدس پہنچ کر وہ صخرہ کے اندر چلے گئے اور یہاں پر ریاضت اور مجاہدہ شروع کر دیا۔ وہ دروازے کو اندر سے بند کر کے دنیا سے لاتعلق ہو جاتے۔ کافی عرصے تک یہ عمل جاری رہا پھر انہیں حضرت ابراہیمؑ کی عالمِ رویا میں زیارت نصیب ہوئی اور انہیں حکم دیا گیا کہ اب تم مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی برکات سے استفادہ کرو۔

انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے حاجیوں کے قافلے کے ساتھ مکہ معظمہ کا سفر اختیار کر لیا اور مکہ معظمہ پہنچ کے حج کے فرائض انجام دیے اور یہاں سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضری دی تو یہاں ان کا دل بھر آیا اور وہ ایک گوشے میں بیٹھ کر

گھوڑے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ گھوڑے کے گلے میں طوق زریں پڑا ہوا تھا۔ کہاں تو مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ انہیں دو وقت کا کھانا بھی بمشکل مل رہا تھا اور کہاں سلطان کے گھوڑے کے گلے میں طوق زریں پڑا ہوا تھا۔

سلطان سنجر نے آگے بڑھ کے امام غزالی کا استقبال کیا اور تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔

امام غزالی نے کہا۔ ”سلطان! یہ کتنی عجیب و غریب بات ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جا رہی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی گردنیں طوق ہائے زریں کے وزن سے ٹوٹ رہی ہیں۔“

سلطان سنجر کو امام غزالی کی یہ بات پسند نہیں آئی مگر اس نے امام غزالی کو اپنے دربار میں رکھنے کے لیے ان کی یہ کڑوی کسیلی بات برداشت کر لی لیکن اسے بار بار یہی احساس تکلیف پہنچاتا رہا کہ امام غزالی نے اگر یہ باتیں جاری رکھیں تو امام غزالی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جائیں گے۔

امام غزالی کو بھی سلطان کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ ہو گیا۔

امام غزالی کو معلوم تھا کہ سلطان اب انہیں برداشت نہیں کرے گا اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ان سے ان کا کام لے گا اور جب وہ کام نہیں کریں گے تو سلطان سے ان کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے۔

ابھی امام غزالی کو سلطان سنجر کی صحبت اور سلطان سنجر کو امام غزالی کی دربار میں موجودگی تکلیف دہ محسوس ہو رہی تھی کہ خلیفہ کی طرف سے امام غزالی کو بغداد طلب کر لیا گیا اور 499ھ کے مہینے ذیقعد میں امام غزالی کو بغداد جانا پڑ گیا۔

مدرسہ نظامیہ کی مسند درس کب سے ان کا انتظار کر رہی تھی اور امام غزالی نے دوبارہ تدریس اور افادہ کا کام شروع کیا لیکن اب امام غزالی کے درس و تدریس میں پہلے کے تدریسی مشاغل کے مقابلے میں فرق آ چکا تھا۔ پہلے وہ شہرت اور عزت کے تقاضے پر کرتے تھے مگر اب وہ خود کو مامور اور آلہ کار سمجھتے تھے۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ”اگرچہ میں نے اس طرف میں نے پھر رجوع کیا ہے لیکن اس کو پہلی حالت کی طرف بازگشت کہنا صحیح نہیں ہے۔ میری اس حالت اور اس حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلے میں اس علم کی اشاعت کرتا تھا جو حصول جاہ کا ذریعہ ہے اور اسی کی دعوت دیتا تھا لیکن اب میں اس علم کی دعوت دیتا ہوں جس سے جاہ سے دستبردار ہونا پڑتا ہے اور دوسروں کی اصلاح چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصد تک پہنچوں گا یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہو جائے گا لیکن اپنے یقین اور مشاہدے کی بنا پر میرا ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کی ہے، اسی سے آدمی گمراہی اور شر سے بچ سکتا اور ہدایت و اطاعت کی طاقت حاصل کر سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنی طرف سے حرکت نہیں کی، اللہ نے مجھے حرکت میں لایا ہے۔ میں نے خود یہ کام شروع نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے مجھے کام میں لگایا ہے۔ میری دعا ہے کہ پہلے اللہ میری اصلاح فرمائے، مجھے راہ پر لگائے اور پھر مجھ سے دوسروں کی اصلاح کا کام لے اور میں دوسروں کی راہنمائی کروں، حق مجھ پر منکشف ہو جائے اور اللہ کے فضل سے مجھے حق کی اتباع کی توفیق ہو، باطل مجھ پر واضح کر دیا جائے اور اللہ مجھے اس کی پیروی سے بچائے۔“

اس کے بعد امام غزالی نے جو مجددانہ کام انجام دیا اُسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

نمبر ایک فلسفہ اور باطنیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ اور اسلام کی طرف سے ان کی بنیادوں پر حملہ۔

نمبر دو زندگی اور معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ اور ان کی تنقید و اصلاح۔

امام غزالی نے مقاصد الفلاسفہ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس میں آسان زبان اور سلجھے ہوئے طریقے پر منطق، الٰہیات اور طبعیات کا خلاصہ پیش کیا اور پوری غیر جانبداری سے کتاب کے مقدمے میں انہوں نے وضاحت کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ ریاضیات میں رد و قبول کی گنجائش اور دین کا اس سے مثبت یا منفی کوئی تعلق نہیں ہے لیکن مذہب کا اصل تصادم الٰہیات سے ہے۔

طبعیات میں حق و باطل کی آمیزش ہے۔ انہوں نے فلسفہ کے الٰہیات اور طبعیات پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کی اور اس کی علمی کمزوریوں، اس کے استدلال کے نقص اور فلسفیوں کے باہم تناقض اور اختلاف کو پوری جرأت اور قوت کے ساتھ ظاہر کر دیا جو بیماری اس دور میں تھی وہ آج بھی پائی جاتی ہے۔ امام غزالی لکھتے ہیں۔ ”ہمارے زمانے میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جن کو یہ زعم ہے کہ ان کے دل و دماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہیں۔ یہ لوگ مذہبی احکام اور قیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے سقراط، بقراط، افلاطون اور ارسطو کے پرہیبت نام سے ان کی

جستہ جستہ

ایک بزرگ تھے، ابراہیم بن طہمان، ان کا بیت المال سے وظیفہ مقرر تھا۔ ایک بار ان سے خلیفہ کی مجلس میں ایک مسئلہ پوچھا گیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ”میں نہیں جانتا۔“ لوگوں نے ان سے کہا کہ ”آپ بیت المال سے ہر مہینے وظیفہ لیتے ہیں اور ایک مسئلہ نہیں بتا سکتے؟“ ابراہیم بن طہمان بولے۔ ”میں صرف ان جوابات کا وظیفہ لیتا ہوں جو مجھے آتے ہیں۔ اگر میں ان مسائل کا بھی وظیفہ لیتا جو مجھے نہیں آتے تو بیت المال ختم ہو جاتا، مسائل ختم نہ ہوتے۔“

حاتم اصم نامی ایک بزرگ بغداد گئے۔ لوگوں نے خلیفہ کو اطلاع دی کہ خراسان کا زاہد آیا ہے۔ خلیفہ نے انہیں بلوایا۔ وہ پہنچے، دروازے میں داخل ہوتے وقت انہوں نے خلیفہ سے کہا۔ ”السلام علیکم اے زاہد۔“

خلیفہ نے کہا۔ ”میں زاہد نہیں ہوں کیونکہ تمام ملک میرے زیر فرمان ہے۔ زاہد تو آپ ہیں۔“

انہوں نے کہا۔ ”دنیا کی متاع قلیل ہے۔ تم نے قلیل پر قناعت کر لی ہے، لہٰذا زاہد تم ہوئے نہ کہ میں۔“

حضرت سلمان فارسی

حضرت سلمان فارسی مدائن کے گورنر تھے لیکن آپ کے لباس میں بے حد سادگی تھی۔ ایک شخص نے گھاس خریدی اور انہیں مزدور سمجھ کے گٹھڑی ان کے سر پر رکھ دی۔ لوگوں نے دیکھا تو شور مچانے لگے کہ ”اے یہ تو گورنر ہیں۔“ اس شخص نے فوراً حضرت سلمان سے معافی مانگی اور گٹھڑی واپس لینے لگا مگر حضرت سلمان نے کہا۔ ”نہیں۔ اب تو میں آپ کی گٹھڑی آپ کے گھر پہنچا کے لوٹوں گا۔“

سید مصطفیٰ علی بریلوی کا تعاون

کتابوں میں ان کے ماننے والوں کی مبالغہ آرائیاں اور قصیدہ خوانی تھی۔ یہ لوگ اپنے ذہن میں ان کو اتنا مقام دیتے ہیں کہ گویا ان کے عقل و ذہن میں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے۔ یہ لوگ عالی دماغی اور ذہانت کے ساتھ مذاہب اور ان کی تفصیلات کا انکار کرتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہمارے دور کے لوگوں نے انکار مذہب کو تقلیداً اپنا شعار بنا لیا اور تعلیم یافتہ اور روشن خیال بننے کے شوق میں مذاہب کا انکار کرنے لگے تاکہ ان کی سطح عوام سے بلند بھی جائے اور وہ عقلا میں شمار ہوتے ہیں۔“

انہوں نے جتنی کتابیں لکھیں، ان میں احیائے علوم الدین بہت زیادہ شہرت رکھتی ہے اور مسلمانوں کے دل و دماغ اور ان کی زندگی پر اس کتاب نے گہرا اثر ڈالا۔

عبدالغافر فارسی کا قول ہے کہ اس کتاب کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی۔

دوسرے بزرگ شیخ محمد گازرونی کا دعویٰ تھا کہ اگر دنیا کے تمام علوم مٹا دیے جائیں تو میں اس کتاب سے ان کو دوبارہ زندہ کر دوں گا۔

امام غزالی حکام و سلاطین کو عالمگیر فساد و اخلاقی انحطاط اور دینی تنزل کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔

بادشاہ ہر طرح کے قوانین اور ضوابط سے بالاتر تھے اور ان پر اعتراض کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔

امام غزالی نے اس طبقے کا پوری جرأت کے ساتھ احتساب کیا۔ ان پر آزادانہ تنقید کی۔ وہ بادشاہوں کے عطیے اور بخششیں قبول نہیں کرتے تھے اور انہیں ناجائز قرار دیتے تھے۔

مسلمانوں میں جو غیر دینی عناصر، بدعت و منکرات، مغالطے اور خوش فہمیاں داخل ہو گئی تھیں ان کی بھی تنقید کی۔ دولت مند جس طرح نمود و نمائش کرتے ہیں اور اسے دین کا ایک ضروری حصہ سمجھتے ہیں ان کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ اس حصے کو بطور خاص پڑھیے اور انہیں آج کے اسلامی معاشرے میں تلاش کیجیے تو یہ ہمیں بکثرت اپنے آس پاس مل جائیں گے۔

”دولت مندوں میں بہت سے لوگوں کو حج پر روپیہ خرچ کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ وہ بار بار حج کرتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو بھوکا چھوڑ دیتے ہیں اور حج کرنے چلے جاتے ہیں۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود نے سچ فرمایا ہے کہ اخیر زمانے میں بلا ضرورت حج کرنے والوں کی کثرت ہو گی۔ ان کو سفر

عمل ہر ایک کے لیے آسان بھی نہیں ہوتا۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ قلوب کی چاہت میں نمو، زیادتی اور اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کے لیے کسی محنت اور جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب قلوب کسی شخص کے علم یا عمل کی وجہ سے اس کے حلقہ بگوش اور معتقد ہو جاتے ہیں تو زبانیں اس کے کلمات کا کلمہ پڑھنے لگتی ہیں' لوگ دوسروں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور نئے نئے دل اس کے مفتوح ہوتے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر انسان طبعاً شہرت اور ناموری کا دلدادہ ہوتا ہے۔ اس کا چرچا دوسرے شہروں اور ملکوں تک پہنچتا ہے۔ نئے نئے دل اس کے شکار ہوتے ہیں اور حلقہ بگوش بنتے ہیں۔ اس کی محبت اور عظمت ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے اور کہیں جا کر نہیں رکتی۔ اس کے برعکس جو شخص جتنی دولت کا مالک ہوتا ہے اس میں اضافہ سخت محنت اور جانفشانی کے بغیر نہیں ہو سکتا' جبکہ جاہ خود بخود نمو پذیر ہوتی ہے اور اس کی کوئی حد نہیں ہوتی' مال میں ٹھہراؤ اور وقفہ ہوتا ہے، جاہ پھلتا پھولتا رہتا ہے اسی لیے جب جاہ میں ترقی ہو جاتی ہے، تو مال و دولت اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتے ہیں۔ یہ مال کی جاہ پر ترجیح کے نمایاں اسباب ہوتے ہیں۔ اگر تفصیل میں جائیں گے تو اس کی بہت سی وجوہ نکلیں گی۔

امام غزالیؒ نے جو کام کیا اس کے تفصیلی بیان کے لیے کافی اوراق درکار ہوں گے۔

امام غزالیؒ نے بغداد سے ایک بار پھر منہ موڑ لیا اور نیشاپور کی مدرسۂ نظامیہ کی مسندِ درس کو آباد کر دیا اور یہاں ایک نئے مدرسے اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ مدرسہ نیشاپور کے قریب اپنے وطن طوس میں قائم کیا۔

پانچ سو ہجری میں محمد بن ملک شاہ نے نظام الملک کے بڑے بیٹے احمد کو وزیر اعظم مقرر کیا تو اس نے امام غزالیؒ کو بلانا چاہا اور ایک انتہائی اثر انگیز خط لکھا۔

بارگاہِ خلافت سے بھی اس کی تحریک ہوئی اور وزیر قوام الدین نے نظام الملک کے وزیر اعظم کے ذریعے انہیں بغداد آنے کی درخواست کی۔ خلیفہ عباسی کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا اور اس فرمان پر دربارِ خلافت کے جملہ ارکان نے دستخط کر دیے اور ظاہر کیا گیا کہ حاشیہ بوسان خلافت اور ارکانِ سلطنت امام غزالیؒ کے قدوم کے لیے چشم براہ ہیں۔

احمد بن نظام الملک نے امام صاحب کو جو خط لکھا اس کا ماحصل یہ تھا کہ آپ جہاں بھی تشریف رکھیں گے وہی جگہ درس گاہ عام بن جائے گی' مگر جس طرح آپ مقتدائے روزگار ہیں' آپ کی قیام گاہ کی بھی وہی شہرت ہونا چاہیے جو عالم اسلام کا مرکز اور قبلہ گاہ ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے ہر حصے کے لوگ بہ آسانی وہاں پہنچ سکیں اور ایسا مقام صرف دار السلام بغداد ہے۔

امام غزالیؒ نے طلبی کے خطوط و فرامین کے جواب میں ایک طویل تفصیلی خط لکھا اور بغداد میں نہ آنے کے متعدد عذر لکھ دیے۔ ''میں یہاں اپنے وطن میں ڈیڑھ سو مستعد طلبہ کی وجہ سے اپنا وطن نہیں چھوڑ سکتا اور یہ طالب علم بغداد نہیں جا سکتے۔ اس کے علاوہ جب میں بغداد میں تھا تو میرے اتنے زیادہ اہل و عیال نہیں تھے' اب بال بچوں کا جھگڑا ہے اور یہ لوگ ترکِ وطن کی زحمت نہیں اٹھا سکتے اور تیسری وجہ نہ آنے کی یہ ہے کہ میں نے مقامِ خلیل میں عہد کیا ہے کہ کبھی مناظرہ اور مباحثہ نہیں کروں گا جبکہ بغداد میں مباحثے کے بغیر چارہ نہیں۔ اس کے علاوہ مجھے دربارِ خلافت میں سلام کرنے کے لیے حاضری دینا ہوگی اور میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں مشاہرہ اور وظیفہ قبول نہیں کر سکتا اور بغداد میں میری کوئی جائداد نہیں۔''

خلافت کی طرف سے طلبی ہوتی رہی مگر امام غزالیؒ گوشۂ عافیت سے باہر نہیں نکلے۔

ان کی زندگی کا آخری کام یہ تھا کہ وہ حدیث نبویؐ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے اور علمائے حدیث کی ہم نشینی اختیار کی اور بخاری اور مسلم کا مطالعہ شروع کیا اور یہ دونوں کتابیں اسلام میں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔

ان کے بھائی احمد غزالی کی روایت ہے۔ دوشنبے کے دن چودہ جمادی الاخریٰ 505 ہجری پچپن سال کی عمر تھی۔ صبح کے وقت بسترِ خواب سے اٹھے' وضو کر کے نماز پڑھی۔ پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر کہا۔ ''آقا کا حکم سر آنکھوں پر۔'' اور یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیے۔

لوگوں نے دیکھا' ان کی روح پرواز کر چکی تھی۔

ماخذات

نظام الملک طوسی، عبدالرزاق کانپوری۔ احیائے دین، امام غزالی۔ امام غزالی، علامہ شبلی نعمانی
تاریخ دعوت و عزیمت، مولانا ابوالحسن ندوی۔ حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ
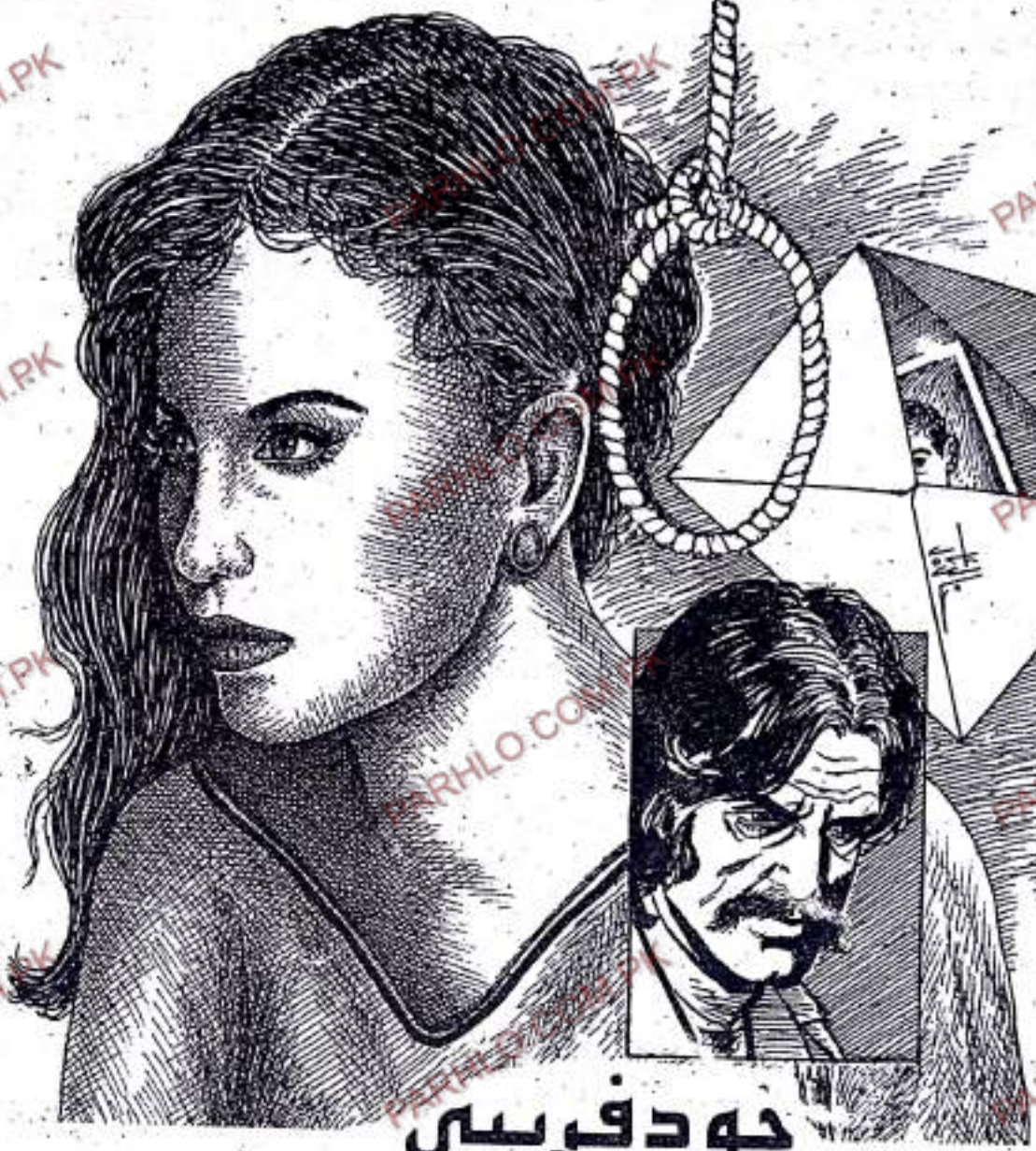
خود فریبی

صائمہ دانش

کوئی پاگل پن میں مبتلا ہو یا عقل کے گھوڑے دوڑانے میں ماہر ہو۔ اگر اس نے قتل کیا تو قاتل ہی کہلائے گا... نہ تو اس کا پاگل پن اسے بچا پائے گا اور نہ ہی عقل کی ڈوریاں ہلانے سے کوئی فائدہ ہوگا... اور یہ بات اسے بہت دیر میں سمجھ آئی... وہ جو خود کو پاگل پن کی چادر میں چھپائے پھرتا تھا پھر اچانک اسی پاگل پن نے اس کا راز فاش کردیا۔

معصومیت اور شرافت کے پردے میں چھپے ایک قاتل کی خود فریبی

میں نے تین دن سے مشل کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ بات میں نے آج صبح پولیس کو اس وقت بتائی جب وہ میرے دروازے پر آموجود ہوئے تھے۔

ڈیٹکٹیو وینٹ کے مطابق میں آخری شخص تھا جس نے اسے زندہ دیکھا۔ وہ والرس جیسی مونچھوں والا ایک سخت نظر آنے والا آدمی تھا۔ اس نے کافی کا کپ میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے جس انداز میں یہ بات کی، وہ نظر انداز کرنے والی نہیں تھی۔ یوں جیسے میں نے اپنی سب سے اچھی دوست

کو اغوا کر کے خدا جانے اس کا کیا کیا ہوگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے اپارٹمنٹ سے نکلتے وقت وہ مکمل طور پر صحت مند تھی۔ میں نے مزید کہا کہ میں اسے سڑک پر موجود اس کی کار تک چھوڑنے گیا تھا کیونکہ اس وقت کافی رات ہو چکی تھی۔ اس کی مونچھیں پنکھوں کی جھاڑن کی طرح مڑی ہوئی تھیں۔ مجھے مونچھوں سے نفرت ہے۔ میں نے ایک بار سوچا تھا، بہت عرصہ پہلے، بیٹری سے چلنے والا ریزر لے کر ہر مونچھوں والے شخص کی مونچھیں مونڈ ڈالوں لیکن پھر میں نے سوچا یہ پاگل پن ہوگا۔ آج کل تو ہر دوسرا شخص چہرے پر مونچھیں سجائے پھرتا ہے...... پھر تو سارا وقت میں بس یہی کرتا رہوں گا۔

خیر، اب میں مشعل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے مسائل سے بھاگنے والی نہیں تھی لیکن اگر وہ ہوتی تو کوئی بھی اس پر الزام نہ لگاتا۔ کم از کم میں تو نہیں۔ کل رات جب میں نے اسے دیکھا تھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں خوف محسوس کیا تھا۔ وہ پریشان تھی۔ اس نے کہا کہ اسے لگتا ہے کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس کے ناخنوں پر سے گلابی رنگ کی وارنش اس کی گردن پر چھٹنے لگی تھی، جب وہ اپنے نیکلس میں جڑے دلکش سے سی ہارس کو اضطرابی کیفیت میں گھماتی۔ میں ایک پیپر ٹاول لینے کے لیے اٹھا کہ کہیں اس کے نیل پینٹ کے ریزے میرے صوفے کی گدیوں میں گم نہ ہو جائیں لیکن اس نے میری کلائی بہت سختی سے پکڑ لی۔ اس کی آنکھیں مجھ سے التجا کر رہی تھیں کہ میں اس کی مدد کروں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ میں نے مشعل کے پیرانویا کا تذکرہ ڈیٹیکٹو وینٹ سے نہیں کیا کیونکہ میں خود اسے سمجھ نہیں پایا تھا۔

میں نے خود کو تسلی دی کہ شاید وہ اس رات کسی بات پر پریشان تھی۔ اسے صرف ایک اچھی نیند کی ضرورت تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پاگل نہیں تھی۔ آخر کار وہ خود ایک سائیکاٹرسٹ ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اسے لائسنس دینے سے پہلے اس کا ٹیسٹ تو لیا ہی گیا ہوگا...... صرف اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ اسے خود نفسیات کا کوئی مسئلہ لاحق نہ ہو اور وہ دوسرے لوگوں کے لیے خطرہ نہ بنے۔

مشعل کے پاس ہمیشہ ہر چیز کا جواب ہوتا تھا سوائے اس کے جو وہ سوچتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے اس کے رویے میں تبدیلی دیکھی تھی۔ یہ میری ماں کی موت کے بعد شروع ہوا۔

میری ماں کی موت بھی میرے لیے کوئی عجیب و غریب نہیں تھی۔ میں بہت عرصے سے اس کی آخری گھڑی کا منتظر تھا۔ آخری وقت اپنے بستر سے بھی بہ مشکل نکل پاتی تھی۔ اس نے کھانا پینا بند کر دیا تھا جس نے پہلے سے ہی اس کے کمزور جسمانی نظام کو مزید کمزور بنا ڈالا تھا۔

مرتے وقت وہ اپنے گلابی پھولوں والے گاؤن کو سختی سے جکڑے ہوئے تھی۔ اس کی انگلیاں گاؤن میں اتنی سختی سے پھنسی ہوئی تھیں کہ پوسٹ مارٹم کے وقت اسے اتارنے کے لیے انہیں گاؤن کو کاٹنا پڑا۔ مشعل آخری رسومات میں شریک تھی اور اس نے اپنے پیچھے آنے والے کسی نادیدہ شخص کے بارے میں کچھ بتایا۔

اس دن چرچ کی پارکنگ لاٹ میں ایک بیک گاڑی نے اسے تقریباً ٹکر مار ہی دی تھی اگر وہ جلدی سے سیڑھیوں کی جانب بھاگ کر اپنا بچاؤ نہ کرتی۔ پھر وہ گاڑی ٹائروں سے دھواں نکالتی تیزی سے وہاں سے نکل گئی۔

باقی مہمانوں نے اس منظر کو نظر انداز کر دیا تھا لیکن مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے یقین ہے اس کے دوست کبھی بھی پسند نہیں رہے تھے۔

مشعل زرد چہرہ لیے چرچ کی سیڑھیوں پر بیٹھی کانپ رہی تھی۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا وہ ٹھیک ہے تو وہ ہنس پڑی اور ایسا ڈرامہ کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں لیکن میں اس کے چہرے پر خوف کے سائے دیکھ سکتا تھا۔ آرگن میوزک شروع ہوتے ہی اس کے پرفیکٹ دانت اس کے خوبصورت لبوں سے جھانکتے ایک خوبصورت مسکراہٹ دینے لگے تھے۔ یعنی وہ نارمل ہو گئی تھی۔

فیونرل کے بعد ہم اپنے کمرے میں بیٹھ کر شراب پی رہے تھے اور دیوار پر میرے فش ٹینک میں تیرتے بلبلوں کے نیلے عکس کو گھور رہے تھے۔

"میں اسے خوش نصیبی سمجھتی ہوں...... نیند میں مر جانا۔" اس نے کہا۔

مشعل ہمیشہ ایسا کرتی تھی۔ ہر بری بات میں بھی روشن پہلو ڈھونڈتا...... یہ اچھی عادت تھی مگر کبھی کبھی میں چڑ جاتا تھا۔ مجھے اس وقت چڑ گیا مگر ظاہر نہیں کیا کیونکہ میں اس جھنجلاہٹ کو پچھلے ایک ہفتے سے نیند پوری نہ ہونے پر محمول کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ادھر ادھر سرعت سے حرکت کرتی اور گولڈ فش پر جمی تھیں۔ قریبی ٹیبل لیمپ کی روشنی سے ٹینک کا سایہ جس طرح سے دیوار پر پڑ رہا تھا، اس سے ٹینک

میں پڑا پلاسٹک کا باکس کسی جہاز کا ملبا اور میری گولڈ فش کسی قاتل شارک کے انتظار میں نظر آرہی تھی۔

"میرا اندازہ ہے کہ اگر آپ کے پاس کوئی اور چانس نہیں تو نیند میں مرنا ہی ایک آسان راستہ ہے۔" مجھے کافی دیر بعد اس کی بات کے جواب میں کہنے کے لیے یہ بات سوجھی۔

"کیا تم ٹھیک ہو جاؤ گے؟ میرا مطلب ہے...... تم نے ان کے...... آخری دنوں میں ان کے ساتھ کافی وقت گزارا ہے۔"

اچانک تبدیلی کبھی کبھی حل نہ ہونے والے مسائل کو جنم دے سکتی ہے۔ "میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

میں نے یہ جانتے ہوئے اس کے بارے میں سوچا۔ حل طلب مسائل۔ جب بھی میں سیڑھیوں پر لوگوں کے پیچھے چلتا تھا تو مجھے ڈر ہوتا کہ کہیں میں انہیں پیچھے سے دھکا دے دوں یا جب میں کچن میں ہوتا تو ہر تیز چاقو کو دیکھ کر میرے اعصاب پر بے چینی سوار ہو جاتی کیونکہ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ میں اسے اٹھا کر کسی کو چوٹ پہنچانے والا ہوں یا جس طرح سے میں جب بھی گلاس میں کوئی مشروب ڈالتا تو میرے ہاتھ کانپ جاتے تھے۔ جب میں یاد کرنے کی کوشش کرتا کہ گلاس میں زہر ہے یا نہیں...... لیکن میں نے ان میں سے کبھی کوئی کام نہیں کیا اور ان دنوں میں زہر اور چاقو اور لوگوں کو سیڑھیوں سے نیچے دھکیلنے کے بارے میں بہ مشکل سوچتا ہوں۔ ویسے بھی ان کا میری ماں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بے ترتیب سوچ، بس اتنا ہی۔ باقی میں ٹھیک تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے پھر کہا۔ ہم نے آرام دہ خاموشی اختیار کی۔ میں نے اپنی گولڈ فش کے شارک کی شکل والے سائے کا پیچھا کیا یہاں تک کہ میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ مشروب نے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا اور مشعل کے اپنا سنڈ ونیلا پرفیوم کی مہک...... میری خماری دگنی ہوئی...... کشن سے ٹیک لگائے میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں جب مشعل کی سانسوں نے میری گردن پر گدگدی کی۔

"وہ آرہے ہیں۔ وہ میرے لیے آرہے ہیں۔"

میں یہ سرگوشی سن کر ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور گلاس جو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا، ڈرنک میری ٹانگ پر چھلک گئی۔

"کیا تم ٹھیک ہو؟" مشعل ہمیشہ کی طرح پرسکون لگ رہی تھی لیکن میں نے اس کی انگلیوں کی ہلکی سی تھرتھراہٹ کو محسوس کیا جیسے وہ چاندی کے سی ہارس کو اپنی چین میں گھما رہی تھی۔

"کیا بات ہے مشعل؟" میں نے کہا۔

"کیا؟" وہ صوفے پر پوری میری طرف مڑ گئی اور سیدھے میری آنکھوں میں دیکھا۔

"تم نے صرف اتنا کہا، وہ میرے لیے آرہے ہیں۔"

"نہیں، میں نے نہیں کہا۔" وہ صاف مکر گئی۔

"تم نے کہا۔ تم نے ابھی میرے کان میں سرگوشی کی ہے۔"

"میں؟"

"ہاں۔" میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی سی تھیں۔ اس کی پیلی رنگت اڑی اڑی سی مزید پھیکی پڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر ٹک گئیں۔ "جیسا میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میں غنودگی میں تھا۔ شاید یہ کسی خواب کی شروعات رہی ہوگی۔" وہ مطمئن ہو گئی۔

اب میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس وقت میں اس معاملے پر کھل کر مشعل سے بات کرتا تو آج شاید حالات مختلف ہوتے لیکن جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

☆☆☆

میں اپنی پسندیدہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ نرم چمڑے کی اس کرسی کا رخ کھڑکی کی طرف ہے، جب دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ دیوار پر کچھ اندھیرا تھا جو پہلے نہیں تھا اور اس پر پڑنے والے ایکوریم کے سائے میں مجھے ایک نئی چیز نظر آئی۔ ایک لمبا، سیاہ نشان شکار کی تلاش میں پھرنے والی شارک کے اوپر لٹکا ہوا۔ یہ مچھلی پکڑنے کے کانٹے جیسا لگ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ میرے تصور کی کارستانی بالکل نہیں۔

دروازے کی گھنٹی پھر بجی۔

"مجھی برن ہارٹ ہے، میں ہوں، ڈیٹیکٹو وینٹ۔" بند دروازے سے اس کی مدھم آواز ابھری۔ میں حرکت نہیں کر پا رہا تھا یا شاید میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں صرف گھور رہا تھا اور حیرت سے سوچ رہا تھا کہ میں نے پہلی بار یہ نشان کب دیکھا؟ کیا یہ کل تھا؟ دو دن پہلے؟ رات مشعل یہاں اس بارے میں بات کر رہی تھی کہ کس طرح کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ اکیلے گھر جانے سے بہت خوفزدہ تھی۔

ڈیٹیکٹو وینٹ کی زوردار دستک میرے دروازے پر پڑی۔ میں اٹھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے کافی

مشین کو آن کیا۔
ونکلیو اپنی تھوڑی کھجا رہا تھا۔ "گڈ مارننگ جیسی! کیا میں تمہیں جیسی کہہ سکتا ہوں؟"
"مارننگ!" وہ میرے ساتھ ہی چلنے لگا، بنا دعوت کے انتظار کے۔
"ارے، ایک منٹ۔" میں اپنے نائٹ گاؤن کو ٹھیک کرنے لگا۔ "آپ یہاں نہیں آسکتے ہیں اور......"
"تم آج کام پر نہیں گئے؟" ونکلیو نے اپنی جیکٹ کی سامنے کی جیب کو تھپتھپایا۔
"نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"
"تمہیں لگتا ہے؟" اس نے بھویں اچکائیں۔
"پچھلے ہفتے میری ماں کا انتقال ہوا ہے۔" میں نے بتایا۔
"اوہ..... آپ کے نقصان کے لیے معذرت۔" ونکلیو وینٹ نے کہا۔ الفاظ اس کی مونچھوں سے آرہے تھے۔ وہ معذرت خواہ نظر نہیں آتا تھا۔
"بدقسمتی سے میرے پاس ایک اور بری خبر ہے۔ ہمیں مشل مل گئی۔ سوری! میرا مطلب ہے اس کی لاش۔" شاید وہ بھی افسوس نہیں کرتا۔ شاید اس کا انداز ہی ایسا ہو۔
"کیا؟"
"مشل مرچکی ہے۔" اس نے قدرے بلند آواز میں اپنی بات دہرائی۔
میرا سر چکرایا اور اچانک ہی میرے سینے میں ایک سوراخ ہوا..... ایک خالی کنویں جیسا جس میں سکہ اچھالو تو کبھی اس کی سطح سے ٹکرانے کی آواز نہیں آتی۔
"مجھے افسوس ہے۔"
میں نے کچن کاؤنٹر پر ہاتھ رکھ کر لرزتے ہوئے کہا۔
"مجھے بیٹھنا ہے۔"
"بالکل۔" ونکلیو وینٹ میرے پیچھے کچن میں آیا اور مجھے گھور کر کچھ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔
"کافی؟" میں نے اس مگ کی طرف اشارہ کیا جو میں نے پہلے اپنے لیے بنائی تھی۔ ٹھنڈے گرینائٹ پر ہاتھ رکھے میں اس کے پیچھے کی دراز میں پڑے چاقو کو محسوس کرسکتا تھا۔ میں نے کافی پھینکی۔
میرے اضطراب میں ہر گزرتے منٹ کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ میری ہتھیلیاں بھی پسینے میں بھیگ گئی تھیں۔ خاص طور پر جب ونکلیو وینٹ کی نظریں اس سمت گئیں۔
میں جلدی سے اس کے سامنے آیا۔ امید ہے کہ اس نے نہیں دیکھا ہوگا۔
"میں پہلے سے بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" وہ مسکرایا لیکن مجھے اس کی مسکراہٹ کے پیچھے کچھ اور محسوس ہوا۔
"میرے پاس آپ کے لیے چند سوالات ہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ نے آخری بار مس مشل گرانڈ کو کس وقت کیسے دیکھا جب آپ اسے مشل کی شام اس کی کار تک لے گئے تھے اور کورونر نے اس کی موت آپ کے اس دعوے کے چند گھنٹے بعد ہی کردی جب وہ آپ کے اپارٹمنٹ سے نکلی تھی۔" اس نے اپنی چھوٹی نوٹ بک میں صفحات پلٹے۔
"اس کی موت کیسے ہوئی؟" میری آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔
"گلا گھونٹنے سے..... یا شاید پھانسی۔"
"اوہ۔" میرا ہاتھ اپنے منہ پر گیا۔
"لگتا ہے کہ یہ خودکشی تھی۔"
"مشل ایسا کبھی نہیں کرے گی۔"
"ہم ابھی میڈیکل ایگزامنر کی مکمل رپورٹ کا انتظار کر رہے ہیں لیکن آپ کو یہ ماننے کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ شاید اس نے ایسا کیا ہو۔"
"میں آپ پر یقین نہیں کرتا۔ میں نہیں جانتا کیوں لیکن آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"
اس نے آہ بھری۔ "دیکھو، میں جانتا ہوں کہ یہاں کے پولیس والوں کی شہرت اچھی نہیں لیکن میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ ہم بھی اچھے لوگ ہیں۔ ویسے بھی یہ سوچنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"
تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھائی۔ ونکلیو نے مگ میں کافی ڈالی اور ایک گھونٹ لیا۔ مجھے یقین نہیں ہے لیکن مجھے لگا کہ میں اس کی مونچھوں سے ایک باریک دھواں اٹھتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔
میں نے کاؤنٹر پر موجود چیتھڑے سے گیلا داغ پکڑا اور اسے گرینائٹ پر پھیرنے لگا۔
"تم جانتے ہو۔" اپنا مگ کاؤنٹر کے خشک حصے پر رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "مشل کے بارے میں شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ شاید یہ خودکشی نہیں تھی۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی جدوجہد کے آثار ملیں۔" اس نے کسی مفکر کے انداز میں سنجیدہ لہجہ اختیار کیا۔ کیا یہ پولیس کا کوئی حربہ تھا مجھ سے اتفاق کرنے کا کہ مجھے میرے شریک سے بنا لیں؟ کیا میں ان لوگوں میں سے ایک ہوں گا جو ہتھکڑیوں میں جکڑے

ہوئے، مقامی نیوز اسٹیشنوں کو انٹرویو دیتے ہوئے، یہ بتاتے ہوئے بتاؤں گا کہ پولیس نے مجھ سے اس جرم کا اعتراف کیسے کروایا جو میں نے کیا ہی نہیں۔
"آپ کا کیا مطلب ہے..... ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"جیسا کہ میں نے کہا، میڈیکل ایگزامنر نے ابھی اپنی رپورٹ نہیں دی لیکن اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں دعا کرتا کہ یہ خودکشی ہو۔ تم اسے زندہ دیکھنے والے آخری شخص تھے..... یاد ہے؟ یہ تمہیں ایک اہم مشتبہ بنا دے گا اور تم میری فہرست میں سرفہرست ہوگے۔"
"مجھے نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔"
"یقیناً..... یقیناً..... لیکن کیا تم مجھے اس رات کے بارے میں کچھ اور بتا سکتے ہو؟ کیا وہ بعد میں کسی سے ملنے کا ارادہ کر رہی تھی؟"
"جیسا کہ میں نے آپ کو پچھلی بار بتایا تھا، اس نے اس شام کے بعد کیا کرنے کا ارادہ کیا، اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔"
"اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا اس شام کے بعد تمہارا کوئی منصوبہ تھا؟"
"نہیں۔" میں نے کندھے اچکائے۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں جلدی سونا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بھی ٹھہرنے کے لیے کہا مگر وہ ڈر رہی تھی۔"
"کس بات کا ڈر؟" ونکلیو نے پوچھا۔ "تمہارا؟"
اس کا مشکوک سوال آیا۔
میں اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میری نظریں دوسری طرف اس سیاہ نشان پر تھیں پھر میں نے ونکلیو کی طرف دیکھا جو مجھے اور بڑی دلچسپی سے گھور رہا تھا۔ "ٹھیک ہے، اب یہ دلچسپ ہے۔" اس نے کہا۔ "مس گرانڈ تم سے ملنے آئی اور پھر کہا کہ اسے جانا ہے کیونکہ اسے ڈر لگ رہا ہے۔"
"میں نے نہیں کہا۔" میرا لہجہ تیز ہوا۔
اس نے کاؤنٹر کو تھپتھپایا اور میرے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے اسے سب کچھ بتانا شروع کیا۔ فیونرل میں اس عجیب کے بارے میں..... اور مشل کے عجیب و غریب خوف کے بارے میں۔
"اور وہ مجھ سے سوالات کرتی رہی۔" میں نے آخر میں یہ کہا تو وہ چونکا۔
"کس قسم کے سوالات؟"
میں نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں رگڑیں اور یاد کرنے

کی کوشش کرنے لگا۔ ”میں نہیں جانتا۔ اس نے پوچھا کیا مجھے آوازیں سنائی دیتی ہیں؟ کیا مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے یا کچھ غیب تھا۔“

ڈینفلیو وینٹ نے اپنی نوٹ بک میں ان میں سے کچھ نہیں لکھا۔ وہ بس عجیب نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

میں اسے نظرانداز کرتے ہوئے اپنے لیے کافی ڈالنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ابھی کے لیے بس اتنا کافی ہے۔“ اس نے اپنی نوٹ بک بند کی۔ ”اگر تمہیں کچھ اور یاد آئے تو مجھے بتانا۔ بھولنا مت۔“

”یقیناً، اگر مجھے کچھ یاد آیا تو میں آپ کو بتادوں گا۔“

جب اس کے پیچھے دروازہ بند ہوا تو میں فرش پر گر گیا اور اس سیاہ سائے کو گھورتا رہا جانے کتنی دیر تک......

☆☆☆

پُراسرار سایہ آج بھی موجود تھا اور میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر تھا کہ یہ نشان کس چیز کا ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک سلیٹی شکل تھی۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ آیا یہ ایکوریم کے اندر کسی چیز کا عکس ہے یا یہ سب میرے سر میں ہے۔ میں نے دیوار کو صاف کرنے کی کوشش کی لیکن صرف یہی کام کرتا جب میں قریب میں موجود ٹیبل لیمپ کو بند کرتا اور میں یہی کر رہا تھا۔ میں سوئچ پر اپنا انگوٹھا رکھتا۔ آن آف، آن آف...... ہمیشہ اس امید میں کہ شاید جب میں لیمپ سوئچ آن کروں گا تو یہ نشان نہیں ہوگا مگر وہ ہمیشہ موجود رہتا اور جب اس کی مستقل موجودگی سے گھبرا کر میں آنکھیں بند کرتا تو مجھے مثل کا بے جان نیلا چہرہ نظر آتا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے، خوف سے پھیلی ہوتیں۔ یوں جیسے مجھے الزام دے رہی ہوں۔ مجھ سے پوچھ رہی ہوں...... تم نے زیادہ کوشش کیوں نہیں کی؟

تم نے مجھے کیوں نہیں بچایا؟

میرے کچن میں بجتے فون نے میرے خیالات میں خلل ڈالا۔ اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے ٹھنڈا ریسیور کان سے لگایا۔ ”ہیلو؟“

”ارے۔ میں نے سوچا کہ تم آج آرہے ہو۔ ہم آج صبح میٹنگ میں تمہارا انتظار کر رہے تھے۔“

یہ روزی تھی۔ میں نے تصور کیا کہ وہ ڈیسک پر بیٹھی اپنے تیز سفید دانتوں سے پنسل کی نوک چبا رہی ہے۔

”مجھے لگتا ہے کہ اس میں میری موجودگی اتنی ضروری نہیں تھی۔“

”بالکل۔ جتنا وقت درکار ہو لے لو۔ سنو کوئی ڈینفلیو تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ کیا تم کسی مصیبت میں ہو؟ کیا...“

”کیا......؟“ میری دھڑکن اچانک بڑھ گئی۔ ”مجھے جانا ہوگا۔“ میں نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھا۔

میرا سر درد کر رہا تھا۔ دیوار پر اس سیاہ سائے کا نشان اب دھندلا نہیں لگتا۔ ایک چھوٹا سا کالا تارے جیسا نشان لگا ہوا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مضحکہ خیز ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس سائے نے مثل کو مار ڈالا ہوگا۔ یہ بھاری لگ رہا ہے جیسا کہ میں نے جب بھی اسے دیکھا۔ پیچھے چلتا تھا تو محسوس ہوتا تھا۔ وہی خوف کہ کچھ ہونے والا ہے۔

”ہم کب سے دوست ہیں؟“ مثل نے مجھ سے پوچھا تھا۔ ”کیا تمہیں مجھ پر بھروسا ہے؟“

کاش! میں اس کی باتوں کو اس دن نظرانداز نہ کرتا۔ میں واقعی اس پر بھروسا کرتا۔

میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک جارحانہ دستک...... جسے اب میں پہچاننے لگا تھا۔

”کیا تم سو رہے تھے؟“ ڈینفلیو وینٹ نے بغور میری آنکھوں کو دیکھا۔

”نہیں، میں جاگ رہا تھا۔“ اسے اندر داخل ہونے سے روکنے کے لیے میں نے دروازے کے فریم پر ہاتھ رکھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اندر آئے۔ اس پراسرار سائے کے بارے میں مجھے کوئی بات کھٹک رہی تھی اور پہلے مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی کہ یہ سایہ تھا کس چیز کا۔

”کافی کی خوشبو اچھی ہے۔“ اس نے مجھے تکتے ہوئے اندر جھانکنے کی کوشش کی اور مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں اسے اس طرح نہیں روک سکتا۔ یہ احمقانہ اور مشکوک لگے گا جبکہ مجھے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ آیا میرے علاوہ کوئی اس سائے کو دیکھ بھی سکتا ہے یا نہیں اور اگر وہ اسے دیکھ بھی سکتا ہے تو شاید مجھے یہ اطمینان تو ہوگا کہ میرے دماغ میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے اور میں تصوراتی چیزیں نہیں دیکھ رہا۔

”اندر آجاؤ۔“ میں ایک طرف ہو گیا۔

وہ سیدھا کچن کیبنٹ کی طرف گیا اور انہیں یوں کھولنے اور بند کرنے لگا جیسے یہاں کا مالک میں نہیں وہ ہو۔ اسے آخر کس چیز کی تلاش تھی؟ میں تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ ”رکو...... رک جاؤ......“ فریج کے ساتھ والی کیبنٹ میں تھی۔ ایک پلاسٹک کی بوتل فرش پر گری جب اس نے کیبنٹ کے اندر اپنا ہاتھ ڈالا۔

”میرا مطلب ہے کہ اسے نہ کھولو، رک جاؤ۔“ میں چلایا اور اپنی پوری کوشش کی کہ اسے کندھوں سے پکڑ کر وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی۔

اس زور آزمائی میں اس کا سر سنک کے اوپری حصے سے کافی زور سے ٹکرایا تھا۔

”اوہ...... پرسکون ہو جاؤ۔“ وہ تڑپ کر اپنے سر کا وہ حصہ سہلاتے ہوئے مجھے گھورنے لگا۔

”تم نہیں چاہو گے کہ مجھے کوئی غلط خیال آئے......ہے نا؟“

”میرے خیال میں آپ کو چلے جانا چاہیے۔“ میرا غصہ اور بے چینی بتدریج بڑھتے جا رہے تھے۔ میں نے اس کے گھورنے کی بالکل پروا نہیں کی۔

”ویل...... اوکے۔ مگر میرے پاس کچھ ہے جو میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں۔“ ایک زرد رنگ کے لفافے کو اس نے اپنی کوٹ کی جیب سے نکالا۔

میں کچھ نہیں پایا کہ اس میں کیا ہو سکتا ہے۔ کیا مثل کی لاش کے فوٹوگراف؟

اور تب اس نے لفافے سے وہ تصویر نکالی۔

”یہ تم ہو؟“ تصویر کو اپنی سوالی اور پیلی انگلی سے جھٹکتے ہوئے وہ پوچھنے لگا۔ جب وہ سگریٹ نہیں پی رہا تھا تو اسے اپنے ناخن کاٹنے چاہئیں لیکن وہ کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا تھا؟

میں نے اس کی پیلی انگلی سے توجہ ہٹا کر تصویر پر مرکوز کی اور...... وہ جو کوئی بھی تھا اس نے بالکل ویسا اونی کوٹ پہن رکھا تھا جیسا میری الماری میں ہے۔

”یہ میں نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ میں نہیں ہو سکتا۔“

”آپ کو یقین ہے؟“

”ہاں۔“ میں خالی الذہنی کی کیفیت میں اسے گھور رہا تھا۔ ”لیکن یہ یقینی طور پر تمہاری طرح لگ رہا ہے اور مثل کے قتل ہونے کے کچھ ہی دیر بعد اپارٹمنٹ کی عمارت سے باہر نکل رہا ہے۔“ اس کی انگلی تصویر پر گھوم رہی تھی۔

میرے سر میں درد اور بھی شدید ہوا۔ میں نے پلکیں جھپکائیں اور مثل کا پھولا ہوا، الزام لگانے والا چہرہ بند آنکھوں کے پیچھے لہرایا۔ میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتا اس لیے بے اختیار آنکھیں کھولتے ہوئے میری نظریں اس سیاہ سائے کے نشان پر گئیں۔ دنوں میں پہلی بار، میں اس کے وجود کے لیے شکر گزار ہوا کیونکہ اس سے میرا دماغ میری کھوپڑی میں ہلنا بند کر دیتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس سیاہ دھبے نے میرے دوست کو مار ڈالا ہو لیکن میں اس کی وضاحت کیسے کروں؟

ڈینفلیو نے تصویر کو واپس لفافے میں ڈال دیا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ میں تمہیں اسٹیشن لے جاؤں۔“

میں یہ سب ختم کر سکتا ہوں۔ میں اس سائے کو مٹا سکتا ہوں اور جو کچھ بھی مثل کے ساتھ ہوا، اگر میں صرف ٹیبل لیمپ بند کردوں۔ الجھن کی جھنجھلاہٹ، یہی ساری صورت حال کا تقاضا ہے۔ ”مجھے بس یہی کرنا ہے...... پھر یہ سب ختم ہو جائے گا۔“ میں تیزی سے ڈینفلیو سے آگے نکلا اور لیمپ تک پہنچنے کی کوشش کی۔

مگر اچانک ہی ڈینفلیو جانے کیا سمجھا اور لپک کر مجھ پر تقریباً حملہ ہی کر دیا۔ اس کی سانسوں کی کھٹی تمباکو اور کافی کی بو میری ناک سے ٹکرائی۔ سختی سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے مجھے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ میری سانس بند ہونے لگی اور یہ ٹھیک بھی تھا کیونکہ میں مزید سانس لینا بھی نہیں چاہتا تھا۔

”تم وہیں رہو۔“ اس نے کہا۔ ”ہلنا مت۔“

وہ کمرے کے اس پار گیا۔ میرے ایکوریم کا جائزہ لیا۔ اس نے کچھ کیا تھا اور یہ لیمپ سوئچ پر کلک کرنے کی طرح نہیں تھا جس طرح میں کرتا تھا کہ صرف اسے بند کردوں۔

سلیٹی نشان کو مروڑتے ہوئے اور پھر میری گولڈ فش کے سائے سے بڑا ایک خوفناک سیاہ عفریت پانی سے اچھلا اور اگلے ہی لمحے وہ ڈینفلیو وینٹ کے گیلے ہاتھ میں تھا۔

”یہ جانا پہچانا لگ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم اپنے فش ٹینک میں موجود اس کی چین کی وضاحت یہاں کرو گے یا اسٹیشن چل کر؟“

آنسو کارپٹ پر ٹپکے جب میں نے سر جھکایا۔

اس کی ہتھیلی میں تارے جتنا کوئی چھوٹا نہیں تھا۔ مثل کے سلور ہار کی ٹوٹی ہوئی چین تھی۔

سیاہ سائے کا نشان۔

یہ میرے سر میں نہیں تھا۔

میں نے ایک بڑی گہری سانس لی۔

اب چاہے ڈینفلیو مجھے کہیں بھی لے کر جائے، کم از کم مجھے یہ اطمینان تو ہوا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔

☒☒☒

گردش افلاک

ناہید سلطانہ اختر

کچھ لوگ ضرورتوں اور مجبوریوں کے بیچ اس طرح پس کر رہ جاتے ہیں کہ خواہشوں کا خزانہ کہاں چھوڑ آئے، انہیں یاد ہی نہیں رہتا... اسے بھی یاد نہیں کہ کب بچپن رخصت ہوا اور کب بہار کا موسم آکر بیت گیا... چاہنے اور چاہے جانے کے جذبے دل کے کس گوشے میں خاموش رہتے رہتے گمشدہ ہوگئے... ضرورتوں اور ذمے داریوں کے بھنور میں گھر کر اسے بھی کسی جذبے کا ادراک نہ ہوسکا۔ البتہ ایک خواب ایسا اس کی آنکھوں میں آن بسا تھا جس کی تعبیر پانے کی خواہش نے اسے ہر خوشی، ہر آسائش سے بہت دور کردیا اور ستم یہ کہ اس کا احساس بھی سانسوں کی دو چار قدم کی دوری پر ہوا... گویا اب پچھتانے سے کیا حاصل جب چڑیا چگ گئیں کھیت۔

تیز دھوپ میں ایک جلتے سائبان کی بے وقعتی کی عبرت اثر داستان

بیالیس سال سرکاری ملازمت کے بندھن میں
بندھے رہنے کے بعد ملازمت سے سبکدوشی پر غلام محمد کے ہاتھ میں واجبات کی مد میں جو رقم آئی وہ چھوٹا سا گھر بنانے اور چند
ضروریات کی تکمیل کی نذر ہو گئی تھی۔ جی پی فنڈ دوران ملازمت
اشد ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر واپس اور پنشن نے کر تصرف
میں لایا گیا تھا۔ بیاسی سال عمر کے لحاظ سے کمزور ہو چکے تھے۔ دو بیٹیاں اور دو بیٹے۔ چاروں کو
تعلیم دلوانا بھی ضروری تھا۔ نئی نسل کو زمانہ چالاکیوں کو کون پوچھتا ہے۔ نہ
بیٹوں کو بھی نوکری ملی تھی ہے۔ نہ بیٹیوں کو اچھے بر..... غلام محمد کی
شادی بھی تاخیر سے ہوئی تھی۔ ایک نہ دو، پوری چھ بہنوں کی
ذمہ داری سر پر تھی جو بہرحال نبھانی تھی۔ غلام محمد اپنے والدین
کی اکلوتی نرینہ اولاد تھا۔ باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چھ بہنوں کی
ذمہ داری غلام محمد کے سر پر آ پڑی۔ پانچ بہنوں کو ان کے گھر
بار کا کرتے کرتے وہ اڑتیس سال کا ہو گیا۔ آخری بیٹی کے
ہاتھ پیلے کرنے سے پہلے ماں نے بیٹے کا گھر بسانا ضروری سمجھا۔
اپنے گھر کی سادی ضروریات پوری کرنے کی خاطر
غلام محمد نے گھر گھر جا کر چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا تو
میٹرک کے بعد ہی شروع کر دی تھی۔ ذہین اور محنتی تھا۔
میٹرک میں فرسٹ ڈویژن آئی۔ کالج میں داخلے کی
استطاعت نہ تھی۔ ٹیوشن سے جو تھوڑی بہت آمدن ہوتی،
اس سے گھر والوں کے ناشتے کا خرچ بھی پورا نہ ہوتا تھا۔
ماں بہنیں گھر بیٹھ کر مزدوری نہ کرتیں تو دو وقت کھانے کے
بھی لالے پڑ جاتے۔ میٹرک کے بعد وہ کسی دفتر میں چھوٹی
موٹی نوکری کرنا چاہتا تھا مگر ماں کی خواہش تھی کہ وہ آگے
پڑھے..... مگر پڑھتا کہاں سے کہ کالج میں داخلے کے لیے
فیس کے پیسے نہ تھے۔ ماں نے ہمت کی۔ اسے ساتھ لے
کر گھر سے نکلی اور اس کے داخلے کے لیے دو تین کالجوں میں
دھکے کھانے کے بعد تھک کر دوپہر میں ایک پرائیویٹ کالج
جا پہنچی۔ پرنسپل کے دفتر کے باہر تعینات بوڑھا چپڑاسی کوئی
بھلا آدمی تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک پریشان حال عورت
سولہ سترہ سال کے بچے کو ساتھ لیے کالج میں اس کے داخلے
کے لیے گڑگڑا رہی ہے۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ”بی بی میں آپ کو پرنسپل
صاحب کے دفتر میں بھیجتا ہوں۔ وہ پرنسپل بھی ہیں اور اس
کالج کے مالک بھی۔ تم اندر جاؤ اور اپنی پریشانی انہیں
بتاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ فیس میں کچھ رعایت کر دیں یا فیس جمع
کروانے کے لیے تمہیں کچھ وقت دے دیں۔“

ماں، غلام محمد کو ساتھ لے کر پرنسپل کے دفتر میں گئی اور
نہایت عاجزی سے کہا۔ ”سر! بیوہ عورت ہوں۔ چھ بیٹیاں
ہیں اور یہ ایک ہی بیٹا۔ اسے اس کے باپ کی خواہش کے مطابق آگے
بھی پڑھانا چاہتی ہوں مگر فیس دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔“
پرنسپل نے غلام محمد کی مارکس شیٹ دیکھی۔ اور دونوں کو بٹھایا پھر کہا۔ ”خاتون! آپ کا بیٹا تو نہایت لائق
ہے۔ اس کے نمبر بہت عمدہ ہیں۔ ہم اسے بغیر کسی فیس کے
اپنے کالج میں داخلہ دے دیں گے۔ بس اسے پڑھنا ہوگا اور ایسے
ہی اچھے نمبر لینا ہوں گے جیسے اس نے میٹرک کے امتحان میں
لیے ہیں۔ آپ اس کی فیس کی بالکل فکر نہ کریں۔ میں داخلہ
فارم منگوا کر دیتا ہوں، پر کر کے کل دفتر میں جمع کروا دیں۔“
ماں خوش ہو گئی۔ اس نے غلام محمد کو دیکھا پھر پرنسپل
سے بولی۔ ”سر! کتابیں بھی خریدنا ہوں گی۔“
پرنسپل نے کہا۔ ”ظاہر ہے۔ پڑھنے کے لیے کتابیں
تو خریدنا پڑتی ہیں۔“

ماں نے پہلو بدلا۔ پرنسپل نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو
بلایا اور کہا۔ ”دفتر سے فرسٹ ائر سائنس کا داخلہ فارم
لا کر دو۔“ چپڑاسی حکم کی تعمیل کو چلا گیا۔

ماں نے دبی زبان سے کہا۔ ”سر! ہمارے پاس
کتابیں خریدنے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔“
پرنسپل نے غلام محمد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کتابیں بھی
مل جائیں گی انہیں۔“

ماں نے پرنسپل سے ممنونیت کا اظہار کیا۔ چپڑاسی
داخلہ فارم لے آیا۔ اگلے دن غلام محمد کا اس کالج میں داخلہ
ہو گیا۔ اس زمانے میں ایسے معجزے ہوا کرتے تھے کیونکہ
ان دنوں اس معاشرے میں انسان دوستوں کی کمی نہ تھی۔

کالج کی دو سالہ تعلیم غلام محمد نے مفت حاصل کی۔
کتابیں اسے پرنسپل کے خصوصی حکم نامے پر کالج لائبریری
سے مستعار ملتی رہیں۔ صبح کو وہ کالج جاتا، دوپہر سے شام
تک گھر گھر جا کر بچوں کو پڑھاتا اور رات کو خود پڑھتا۔ ماں
بہنیں گھر بیٹھ کر سلائی کرتیں، مونگ کی دال کی بڑیاں بنا کر
دکانوں پر سپلائی کرتیں، پان فروشوں کے لیے چھالیا
کترتیں، سموسہ فروشوں کے لیے گھر بیٹھ کر سموسے بناتیں
اور بجلی پلاسٹک کے تاروں سے ٹوکریاں بنتیں۔

انٹر کے امتحانات سے فارغ ہوتے ہی غلام محمد نے
اپنے گھریلو حالات کے پیش نظر نوکری کرنے کی ٹھان لی۔
کالج میں چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ وہ ڈرتے جھجکتے پرنسپل کے
پاس گیا اور اس نے نہایت عاجزی سے کہا۔ ”سر! آپ کا
بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے دو سال بغیر فیس لیے کالج
میں تعلیم دلوائی۔ اب میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔“

پرنسپل نے کہا۔ ”تمہاری والدہ تو تمہیں ڈاکٹر بنانا
چاہتی ہیں۔“

غلام محمد اداس ہو کر بولا۔ ”سر! میں ڈاکٹر بنا تو میری
والدہ اور بہنیں دن رات محنت مزدوری کر کر کے مریض بن
جائیں گی۔ بہنوں کی شادی بھی کرنی ہے۔ سر! نوکری میری
ضرورت ہے۔“

پرنسپل نے اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔ ”کیا
نوکری کرو گے؟“

غلام محمد نے آس بھری نظروں سے پرنسپل کو دیکھا۔
”سر! اسی لیے تو آیا ہوں آپ کے پاس کہ مجھے کہیں نوکری
دلوا دیں۔“ پرنسپل نے ایک گہری سانس کھینچی۔ ”ٹائپنگ
اور شارٹ ہینڈ سیکھ لو۔ گزارہ ہو جائے گا۔“

غلام محمد نے پہلو بدلا۔ ”سر! اس میں تو وقت لگے گا۔
ہمارے محلے میں ایک صاحب بینک میں کام کرتے ہیں۔
وہ کہتے ہیں کہ ٹائپنگ سیکھنے میں وقت لگتا ہے۔“
پرنسپل نے تائید کی۔
”مگر سر! میں تو فوراً نوکری کرنا چاہتا ہوں۔“ غلام محمد
نے کہا۔

”پہلے کوئی کام تو سیکھو۔“ پرنسپل نے کہا۔
”سر! میں بچوں کو پڑھا تو سکتا ہوں۔“ غلام محمد نے کہا۔
پرنسپل سوچ بچار میں پڑ گئے پھر اپنے سامنے رکھے قلم
دان سے قلم نکالا، ایک چٹ پر کچھ لکھا، مہر لگائی اور غلام محمد کی
طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ”وائٹ روز اسکول ہے۔
اس کے پرنسپل میرے دوست ہیں۔ ان کے پاس چلے جاؤ۔
میں فون پر ان سے بات کرلوں گا۔“

ان دنوں معاشرے میں خود غرضی کا اس حد تک نفوذ
نہ ہوا تھا جتنا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہوا۔ لوگ ایک
دوسرے کے کام آنے اور ایک دوسرے کے لیے راستہ
بنانے کا جذبہ رکھتے تھے۔

غلام محمد ضرورت کا مارا تھا۔ ماں، بہنوں سے ہمدردی
رکھتا تھا۔ انہیں دن رات محنت مزدوری کرتے دیکھ کر اس کا
دل کڑھتا رہتا تھا۔ وہ ماں کو آرام پہنچانے کی خواہش رکھتا تھا
اور بہنوں کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتا تھا تاکہ ماں کو ان کی
ذمے داری سے فرصت ملے۔ وہ اسی دن پرنسپل کی دی ہوئی
چٹ کے ساتھ وائٹ روز اسکول جا پہنچا۔

خدا راستے آسان بناتا ہے۔ حسن اتفاق وائٹ روز
اسکول میں پرائمری جماعتوں کے لیے ٹیچرز کی ضرورت
تھی۔ تدریسی عملہ مرد و زن دونوں پر مشتمل تھا۔ پرنسپل نے
غلام محمد کو اگلے دن ڈیمو کے لیے بلالیا۔ غلام محمد کو چوتھی
جماعت کے بچوں کو ریاضی پڑھانے کو کہا گیا۔ پرنسپل اور
اسکول کے ایک سینئر ٹیچر نے کرائے جماعت کی عقبی
نشستوں پر بیٹھ کر اسے پڑھاتے دیکھا۔ بچوں کو پڑھانے کا
تجربہ تو تھا ہی اسے..... نوکری کی ضرورت کے احساس نے
اسے بچوں کو بہترین انداز میں پڑھانے کی لگن دی۔ اسے
ایک سو بیس روپیہ ماہانہ تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش کی گئی جو
اس نے بہ خوشی قبول کر لی۔

اس زمانے میں ہزاروں، لاکھوں روپے تنخواہ نہ ہوتی
تھی۔ سکوں کا رواج تھا۔ تنخواہ دار اسی میں خوش اور قانع
رہتے تھے۔ مہنگائی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک روپے میں سولہ
آنے ہوتے تھے اور ایک آنے میں چار پیسے۔ قصاب کی
دکان سے بارہ آنے سیر بڑا گوشت مل جاتا تھا اور ڈھائی
روپے کا سیر بھر بکرے کا گوشت..... وہ بھی گاہک کی پسند
کا۔ آج کل کی طرح نہیں کہ قصاب چھیچھڑے اور ہڈیاں بھی
فروخت کرتے ہیں۔

غلام محمد صبح سے دوپہر تک اسکول میں پڑھاتا، دوپہر
سے شام تک گھروں میں جا کر بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا اور
رات کو اسی کالج کی نائٹ شفٹ میں خود بھی پڑھتا جہاں وہ
انٹرمیڈیٹ کے دو سال صبح کی شفٹ میں پڑھتا رہا تھا۔
مہربان پرنسپل نے اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے
کالج کی ایوننگ شفٹ میں جو رات تک جاری رہتی، فیس ادا
کیے بغیر مفت پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔

گھر کے حالات کچھ بہتر ہو گئے۔ بی اے کے بعد
اس نے ٹیچرز ٹریننگ کالج کی ایوننگ شفٹ میں داخلہ لے کر
بی ایڈ کیا۔ سرکاری اسکولوں میں ٹیچرز کی بھرتی کا اشتہار شائع
ہوا تو اس نے بھی درخواست دے دی۔ انٹرویو ہوا اور اسے
ملازمت کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ اتنی آسانی سے سرکاری
ملازمت مل جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان دنوں پڑھے لکھے
افراد کی ایسی ناقدری نہیں تھی جیسی کہ اب ہے۔ گریجویٹ افراد
تھوک کے بھاؤ نہ ملتے تھے۔ ماسٹرز کو اعلیٰ تعلیم سمجھا جاتا تھا
اور پی ایچ ڈی کو انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔

سرکاری نوکری ملتے ہی غلام محمد نے ماں بہنوں کے
محنت مزدوری کرنے پر پابندی لگا دی۔ اسے ملنے والی تنخواہ
عزت سے گزارے کے لیے کافی تھی تاہم بہنوں کو ان کے
گھر بار کا کرنے کے لیے اس نے ٹیوشن کا سلسلہ جاری
رکھا۔ ماں اور بہنیں کفایت شعاری سے گھر کا انتظام چلاتیں
اور ہر ماہ معقول بچت کر لیتیں۔

غلام محمد نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ ٹیچر بنے گا۔ اس کی ماں اسے ڈاکٹر بنتے دیکھنا چاہتی تھی۔ انسانی خواہشات کا کوئی نہ کوئی پس منظر ہوتا ہے۔ غلام محمد کا باپ نہایت غربت کی زندگی گزارتے ہوئے بیمار ہوکر دوا دارو کے لیے ترستا ہوا مرا تھا۔ علاج معالجے کے لیے پیسے نہ ہونے کے باعث شوہر کی بے بسی کی موت غلام محمد کی ماں کے دل میں تیغ کی طرح گڑی ہوئی تھی۔ موت تو ہر ایک کو آتی ہے اور ہر شخص کی موت کا وقت بھی مقرر ہے۔ غلام محمد کے باپ کی زندگی اتنی ہی تھی۔ بیوی کو اس کی موت سے زیادہ اس کے علاج کے لیے ترستے ہوئے مرنا زیادہ دکھ دیتا تھا۔ اپنے کے علاج کے لیے ترستے ہوئے ... میں پائی پائی تھی۔

اس دکھ کا مداوا وہ غلام محمد کو ڈاکٹر بنا کر کرنا چاہتی تھی۔

"میرا غلام محمد ڈاکٹر بن کر غریبوں کا علاج مفت کیا کرے گا۔" شوہر کی موت کے بعد وہ کہتی تھی مگر حالات نے غلام محمد کو ٹیچر بنا دیا۔ ٹیچر بن کر وہ اگر بہت خوش نہ تھا تو ناخوش بھی نہ تھا۔ پرائیویٹ اسکول میں تو اسے ایک سو میں روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور سال بھر ملازمت پوری ہونے پر پانچ روپے ماہانہ ترقی۔ سرکاری ملازمت میں آنے کے بعد ایک سو بیس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی اور سال بعد آٹھ روپے ماہانہ ترقی۔ جس دن اس کی نوکری میں وہ اسکول کے ہیڈ کلرک سے زیادہ تنخواہ پاتا تھا۔ دوپہر کو ایک بجے چھٹی کے بعد رات تک سارا وقت اپنا ہوتا جس میں وہ بچوں کو ٹیوشن دے کر اچھے خاصے پیسے کما لیتا۔ سستا زمانہ تھا۔ اس نے تو اس کی چھ بہنوں میں سب سے بڑی کا جہیز بھی جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ رشتوں کا بھی اس زمانے میں ایسا کوئی کال نہ تھا۔ اللہ اپنے بندوں میں کسی نہ کسی کے دل میں ڈال ہی دیتا اور تھوڑے بہت جہیز کے ساتھ غلام محمد جیسے نچلے متوسط گھرانوں کی بہنیں اور بیٹیاں بھی عزت سے اپنے گھر بار کی ہو جاتیں۔ معاشرہ ان دنوں آج جتنا مادہ پرست نہ ہوا تھا۔

☆☆☆

تین سال گزرے۔ غلام محمد ترقی پا کر جونیئر ٹیچر سے سینئر ٹیچر ہو گیا۔ تنخواہ بھی بڑھ گئی اور سالانہ ترقی کی شرح میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ماں نے کفایت شعاری سے کام لے کر اس کی دو بہنوں کو بھی اچھے ہی جیسے گھرانوں میں بیاہ دیا۔ غلام محمد کو ٹیوشن سے ہونے والی آمدنی بھی بڑھ گئی۔ گھر کے حالات مزید بہتر ہو گئے۔ غلام محمد جو ٹیچر نہیں بننا چاہتا تھا، اب ٹیچر ہی رہنا چاہتا تھا۔ آدھے دن کی نوکری تھی۔ تنخواہ معقول، ٹیوشن سے اضافی آمدنی ہو جاتی اور ان تمام باتوں سے زیادہ اہم یہ کہ نوکری میں عزت بھی کمال کی تھی۔

غلام محمد ذہین، محنتی اور دیانت دار آدمی تھا۔ ملازمت کے قواعد و ضوابط کا خیال رکھتا، ڈیوٹی کے اوقات کار کی پوری پابندی کرتا، اپنے تدریسی مضمون پر عبور رکھتا، شاگردوں کو توجہ اور محنت سے پڑھاتا۔ امتحانی سوالناموں کی تیاری ہوتی یا جوابی کاپیوں کی جانچ پڑتال، نہایت ایمانداری سے کام لیتا اور اپنے کسی شاگرد کی جانبداری نہ کرتا۔ اس کے لیے تمام طالب علم یکساں اہم تھے۔ لائق شاگردوں کی تحسین کرتا تو کمزور طالب علموں کی اوروں کے سامنے تحقیر سے گریز کرتا اور بہتر کارکردگی دکھانے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کرتا۔ کسی شاگرد کی توہین نہ خود کرتا نہ اس کے کسی ہم جماعت کو ایسا کرنے کی اجازت دیتا۔ تمام طالب علم غلام محمد سے خوش رہتے، اس کا احترام کرتے اور اس سے تحصیل علم کے خواہش مند رہتے۔ ہیڈ ماسٹر، ڈپٹی ہیڈ اور ساتھی اساتذہ غلام محمد کی خوبیوں کی وجہ سے اس کی عزت کرتے۔ بطور معلم اپنی خوبیوں کے باعث غلام محمد کی اپنے طالب علموں پر گویا حکمرانی تھی۔ اسے ادارے کا مثالی استاد سمجھا جاتا تھا۔ غلام محمد کی ماں کہتی تھی۔ بندے کو اپنی روزی حلال کرنے کے لیے محنت اور ایمانداری سے کام کرنا چاہیے۔ ماں کی اسی تربیت نے غلام محمد کو اپنے ادارے کا مثالی ٹیچر بننے میں مدد دی تھی۔ گرمی سردی، آندھی، طوفان، بیماری، آزاری غلام محمد کے فرائض منصبی کی انجام دہی میں خلل انداز نہ ہو پاتے۔ صبح ہونے سے چھ بجے بس اسٹاپ پر پہنچ جانا اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔

دو بیٹیوں کی شادی کے بعد ماں غلام محمد کی شادی کردینا چاہتی تھی مگر وہ سب سے چھوٹی بہن کو بھی اس کے گھر بار کا کردینے تک خود شادی کرنے کے حق میں نہ تھا۔ ماں کہتی۔ "وقت پر شادی کرے گا تو تیرے ہاتھ پاؤں چلتے تک بچے بھی اپنے پیروں والے ہو جائیں گے۔"

غلام محمد کہتا۔ "مجھے اچھا نہیں لگتا کہ گھر میں بہن بیٹھی ہو اور میں شادی کرکے بیٹھ جاؤں۔"

ماں جواباً کہتی۔ "تیری طرح سوچنے لگیں سب تو دنیا کے آدھے سے زیادہ بھائی چٹے سر والے ہوکر شادی کریں۔"

غلام محمد کو ماں کی کوئی دلیل اس کے موقف سے نہ ہٹا پائی۔

چنانچہ آخری بہن کی شادی ہونے تک غلام محمد اڑتیس سال کا ہو گیا۔ ماں کی ایک ملنے والی آپا زلیخا کی بیٹی مومنہ سے اس کا رشتہ طے ہوا اور انہی دنوں اس نے نظامت تعلیمات میں وائس پرنسپل کے عہدے کے لیے پبلک سروس کمیشن کو درخواست دینے کے بعد انٹرویو بھی دے ڈالا۔ شادی سے چند دن پہلے اسے وائس پرنسپل کی خالی

اسامیوں میں سے ایک کے لیے منتخب ہو جانے کی نوید دی۔ غلام محمد کی ماں نے مومنہ کو خوش قدم قرار دیا جس کے آنے سے پہلے ہی غلام محمد کی ترقی ہو گئی تھی۔ غلام محمد کے دل میں بھی [illegible] ہو گئی۔

شادی کے چار پانچ سال بعد غلام محمد کے ہاں پہلی اولاد ہوئی اور وہ آگے پیچھے دو بیٹیوں اور دو بیٹوں کا باپ بنا۔ ماں حیات تھی، خوش تھی مگر فکرمند بھی۔ غلام محمد کے بچے ابھی چھوٹے تھے اور اس کے سر کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ گھر کرائے کا تھا۔ غلام محمد کے بچوں کے سر پر چھت بھی اپنی نہ تھی۔ ہوتی بھی کیسے..... ٹیچر ہی تو تھا۔ اسے ٹیوشن سے اضافی آمدنی نہ ہو رہی ہوتی تو یکے بعد دیگرے چھ بہنوں کی شادی کرنا اور خود اپنا گھر بھی بسانا محال ہوتا۔ غلام محمد کی ماں پوتے پوتیوں کے سر پر اپنے گھر کی چھت نہ ہونے پر فکرمندی کا اظہار کرتی تو غلام محمد ماں کو تسلی دیتا۔ "فکر مت کرو اماں! سرکاری ملازموں کو سرکاری ریٹ پر پلاٹ ملتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو مجھے ریٹائرمنٹ سے پہلے یا ریٹائرمنٹ کے بعد پلاٹ ملے گا تو اس پر اپنا گھر بنالیں گے۔"

"گھر بنانے کے لیے بھی تو پیسے کی ضرورت ہو گی۔" ماں کہتی۔

"اماں اپنے بقایا جات ملیں گے نا۔" غلام محمد ماں کو دلاسا دیتا۔

"باقی خرچہ؟"

"پنشن ہوگی نا اماں! سرکاری ملازمت کا یہی تو فائدہ ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی بندہ بیٹھا کھاتا رہتا ہے۔ ہر مہینے کی پہلی دوسری تاریخ کو گئے اور پنشن لے آئے۔"

"اللہ بھلی کرے۔ تو نے میرا اور اپنی بہنوں کا بہت ساتھ دیا ہے غلام محمد..... اللہ تیرے بچوں کے لیے تجھے آسانیاں دے۔"

"مجھے بس تمہاری دعا ہی چاہیے اماں!"

"وہ تو میں دن رات کرتی ہوں۔ میرے روئیں روئیں سے تیرے لیے دعا نکلتی ہے۔"

غلام محمد کی ترقی ہوئی اور اسے ایک سیکنڈری اسکول میں پرنسپل کا عہدہ مل گیا۔ اب وہ انیسویں گریڈ میں تھا۔ اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ چاروں بچے پڑھ رہے تھے۔ مہینے کے آخر تک غلام محمد کو ملنے والی تنخواہ ختم ہو جاتی، کچھ بچت نہ ہو پاتی تو کسی سے مانگنے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ ٹیوشن کا سلسلہ وہ ترک کر چکا تھا۔ پہلے وائس پرنسپل، پھر پرنسپل کے عہدوں کی لاج بھی تو رکھنا تھی۔ البتہ اس کے دو بڑے بچوں نے اپنے ہی گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا جس سے ان کا اپنا جیب خرچ بھی نکل آتا، کچھ تعلیمی مصارف بھی پورے ہو جاتے۔

غلام محمد کی ریٹائرمنٹ میں اب زیادہ وقت نہ رہ گیا تھا۔ ماں ابھی حیات تھی۔ اسے بس اب دو ہی فکریں تھیں۔ اول یہ کہ بیٹے کا گھر بن جائے اور دوم غلام محمد کی بیٹیاں جلد ٹھکانے لگ جائیں۔ بڑی ماشاء اللہ اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی۔ دوسری پندرہویں سال میں تھی۔ سال سال، ڈیڑھ ڈیڑھ سال کے فرق سے پیدا ہونے والے چاروں بچے ماں باپ کے قد کو آ لگے تھے۔ غلام محمد کی ماں کو پوتوں کی فکر نہیں تھی، انہیں تو ابھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونا تھا پھر ان کے گھر بسانے کی بات ہوتی البتہ دونوں پوتیوں کو وہ اپنے مرنے سے پہلے ان کے گھر کا ہو جاتے دیکھنے کی آرزومند تھی۔

مگر انسان کی ہر خواہش پوری کب ہوتی ہے۔ غلام محمد کی ماں شدید بیمار ہو گئی۔ پھیپھڑوں کی بیماری تھی۔ سانس لینا اور کھانا پینا محال ہو گیا۔ اسپتال داخل کرانا پڑا۔ اپنی علالت کے دوران اس نے غلام محمد سے کہا۔

"بلاوا آنے سے پہلے میں تیرا گھر بنتے دیکھنا چاہتی تھی مگر لگتا ہے وقت کم ہے..... نہیں دیکھ سکوں گی۔ میں رہوں نہ رہوں، بچوں کے لیے گھر ضرور بنانا۔"

"فکر نہ کرو اماں! گھر بناؤں گا بھی اور تم دیکھو گی بھی۔ اخبار میں اشتہار آیا ہے سرکاری ملازموں کے لیے نیا سیکٹر آباد کرنے کا۔ اپلائی کروں گا۔"

"اللہ تیرے بچوں کا ٹھکانا بنائے..... اپنے گھر کی چھت دے..... اپنے گھر کا بہت آسرا ہوتا ہے بندے کو۔"

ماں کی بیماری نے بالآخر اس کا کام تمام کیا۔ بیٹے کا گھر بنتا دیکھنے اور اس کے بال بچوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچتے دیکھنے کی خواہش دل میں لیے غلام محمد کی ماں اس دنیا سے چلی گئی۔ انسان کی ہر خواہش کب پوری ہوتی ہے۔

ماں کی موت نے غلام محمد ہی نہیں، اس کے اہل و عیال کو بھی دنوں اداس رکھا۔ ماں کی آخری خواہش اب غلام محمد کے دل میں جڑ پکڑ گئی تھی۔

سرکاری ملازمین کو ان کے گھر کی چھت فراہم کرنے کے لیے وجود میں آنے والا ادارہ اپنے قیام کے بعد ملک کے طول و عرض میں کئی رہائشی منصوبوں پر کام کر چکا تھا۔ قدرے سست رفتاری سے ہی سہی، بہرحال اس ادارے کے توسط سے ہزاروں سرکاری ملازمین کو اپنے گھر کی چھت میسر آ چکی تھی۔ غلام محمد نے بھی اپنی ریٹائرمنٹ سے کوئی ڈیڑھ برس قبل اسی ادارے کے نو اعلان کردہ منصوبے

میں ایک امید کے ساتھ ممبر شپ کے حصول کو مقررہ فیس جمع کرائی تھی کہ جب تک اس کی ریٹائرمنٹ اور واجبات کی وصولی کے معاملات نمٹیں گے، پلاٹ ملنے کا معاملہ بھی طے ہوجائے گا پھر یا تو وہ اسی پلاٹ پر اپنا گھر بنانے کی کوشش کرے گا یا اسے فروخت کر کے کوئی بنا بنایا گھر خرید لے گا۔

بدقسمتی سے اس منصوبے میں گھپلا یہ ہوا کہ آباد کار ادارے نے اپنے سابقہ منصوبوں کی طرح سینیارٹی کے لحاظ سے پلاٹ دینے کے بجائے "پہلے آیئے پہلے پایئے" کی بنیاد پر پلاٹ دینے کی پالیسی رکھی۔ نتیجتاً ریٹائرمنٹ کے نزدیک لوگ اس دوڑ میں بہت سے جوانوں سے پیچھے رہ گئے۔ غلام محمد کو ممبر شپ لینے کے لیے فیس کا انتظام کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی اور اس منصوبے میں اسے پلاٹ نہ مل سکا لیکن خدا کا کرنا، ریٹائرمنٹ سے چند ماہ قبل غلام محمد کی اگلے گریڈ میں ترقی ہوگئی اور انہی دنوں سرکاری ملازمین کی آباد کاری کے ادارے نے اپنے ایک نئے رہائشی منصوبے کے لیے ممبر شپ کا اعلان کر دیا۔ اس منصوبے میں پلاٹ کے حصول کے لیے ممبرز کا استحقاق عمر تھی۔ یعنی زیادہ عمر والے افراد کو پلاٹ پہلے ملنا تھا۔ غلام محمد نے اب کی بار رجسٹریشن کرانے میں تاخیر نہیں کی۔ معمول کے اخراجات سے ہاتھ کھینچ کر اس نے آباد کار ادارے کو مقررہ فیس ادا کی اور پلاٹ کے امیدواروں کی لائن میں لگ گیا۔ سننے میں آیا کہ یہ منصوبہ آباد کار ادارے کے اب تک کے منصوبوں میں سب سے زیادہ قیمتی اور منافع بخش ہوگا۔ غلام محمد کے اقربا رشک سے کہتے۔ "آپ نے نہایت ایمان داری سے نوکری کی ہے اس لیے آپ کو اللہ نے یہ انعام دیا ہے۔" غلام محمد دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا۔ اس کی آنکھیں لگی تھیں کہ کب وہ سعد گھڑی آتی ہے جب اسے اس کی زندگی بھر کی محنت کا صلہ ملتا ہے۔

آباد کار ادارہ اپنے ممبرز کو مجوزہ پالیسی کے مطابق پلاٹس کی الاٹمنٹ کے لیے اراضی بھی تو سرکاری ملکیت اراضی سے حاصل کرتا۔ ایک صورت میں زمین بلاقیمت ہوتی اور اس کا حصول مشکل نہ ہوتا بصورت دیگر ادارے کو نجی ملکیت سے زمین حاصل کرنا پڑتی۔ اس صورت میں زمین کا حصول قدرے مشکل اور صبر آزما ہوتا۔

☆☆☆

غلام محمد کو ریٹائرمنٹ کے بعد واجبات ملے تو مومنہ نے اسے مشورہ دیا تھا کہ چھوٹا سا ایک گھر بنالے یا بنا بنایا خرید لے تاکہ ہر ماہ مکان کے کرائے کے جھنجٹ سے جان چھوٹے۔

"ابھی کیا جلدی ہے؟ اللہ نے چاہا تو کنال کے پلاٹ پر گھر بنائیں گے۔ کنال کا پلاٹ ملے گا مجھے۔"

"اللہ جانے کب ملے گا۔"

"ان شاء اللہ جلدی ملے گا۔ بڑے بڑے لوگوں کے پلاٹ ہیں اس میں۔ چھوٹا پلاٹ تو ہے ہی نہیں۔ سنا ہے پہلی قسط ہی پندرہ بیس لاکھ ہوگی۔"

"تو بچوں کی فیسیں اور دیگر معاملات..... وہ کہاں سے کروگے؟" مومنہ نہایت فکر مندی سے بولی۔

"فکر کیوں کرتی ہو۔ سب ہوجائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ..... بہت قیمتی پلاٹ ملے گا۔"

"تمہاری محنت سے زیادہ قیمتی تو نہ ہوگا۔ لوگ بڑے سویرے ہوتے تھے اور تم اندھیرے منہ گھر سے نکل بھی جاتے تھے اسکول جانے کو۔"

"وقت پر پہنچنا فرض تھا میرا۔ استاد ہی اگر دیر سے پہنچے تو شاگرد وقت کی پابندی بھلا کس سے سیکھیں گے۔"

"ہاں، یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ چالیس سال سے اوپر سرکاری خدمت کے بعد تمہیں جو پلاٹ ملے گا، وہ کتنا ہی قیمتی سہی، تمہاری خدمات سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہوگا۔ کہاں کہاں پہنچ گئے تمہارے پڑھائے ہوئے بچے۔ خود ہی تو بتاتے ہو کہ فلاں شاگرد تمہارا فلاں محکمے میں بڑا افسر لگا ہوا ہے..... فلاں کرنل بن گیا..... فلاں سائنس دان بن گیا..... فلاں حکومت میں وزیر ہے۔"

"خدا کا شکر ہے۔ بڑی عزت دی پروردگار نے۔"

"کسے؟" بیوی نے غلام محمد کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تمہیں یا تمہارے شاگردوں کو؟"

"نیک بخت! شاگردوں کی عزت استاد ہی کی عزت ہوتی ہے۔"

"اب اپنے بچوں کی عزت کی فکر کرو۔ بیٹیوں کو ان کے گھر کا کرنا ہے اور بیٹے پڑھ لکھ جائیں تو اپنے کسی پڑھائے شاگردوں سے سفارش کر کے انہیں بھی نوکریوں پر لگوانا۔"

"میں سفارش نہیں کروں گا۔ ان شاء اللہ ہمارے دونوں بیٹے اپنی اہلیت سے نوکریوں پر لگیں گے۔"

"ایک بات کہوں، بُری نہ لگے تو؟"

"میں نے کبھی تمہاری بات کا بُرا مانا ہے؟"

"وقت پر شادی کر لیتے تو آج بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے اور بیٹیاں بھی اپنے گھروں میں آباد ہوتیں۔"

"یہ خدا کے اختیار کی بات ہے۔ جب اس نے چاہا تب تم سے میری شادی ہوئی۔ نہ وقت سے پہلے، نہ وقت کے بعد۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔"

"پھر گلہ کیوں؟"

"انسان ہوں..... غلطی ہوجاتی ہے۔"

"معاف کیا۔" غلام محمد مسکرا کر بولا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد غلام محمد کا زیادہ وقت اب گھر ہی میں گزرتا تھا۔ بچے چاروں ہی ابھی زیر تعلیم تھے۔ بڑی بیٹی سامعہ یونیورسٹی میں پہنچ گئی تھی۔ اس سے چھوٹا محمد طارق کالج میں آئی سی ایس کا طالب علم تھا۔ شارق میٹرک میں تھا اور سب سے چھوٹی راحمہ نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ غلام محمد اور مومنہ بچوں کے جانے کے بعد بھی گئے دنوں کی باتیں کرتے، کبھی مستقبل کی۔ ان کی تان بالآخر اپنا گھر بنانے پر آکر ٹوٹتی۔

غلام محمد کو ہر ماہ معقول پنشن ملتی جس کا بڑا حصہ کرایہ مکان، یوٹیلٹی بلز اور بچوں کے تعلیمی مصارف میں نکل جاتا۔ باقی سے گھریلو مصارف پورے کیے جاتے۔ دکھ، سکھ، بیماری، خاندان میں غمی، خوشی کے مواقع بھی ساتھ لگے تھے۔ مہینے کے آخری دنوں میں ہاتھ کھینچ کر ہی گزارہ کرنا پڑتا۔ پہلی تاریخ سکھ کا سانس ساتھ لاتی۔ مہینے کے ابتدائی ایام قدرے فراغت سے گزرتے۔ صبح کو ناشتا بھی کچھ ڈھنگ کا ہوتا۔ گھر میں مکھن اور جام جیلی کی شیشی بھی اپنی چھب دکھاتی۔ دونوں وقت کھانا بھی نصیب ہوتا۔ مہینے کے ابتدائی پندرہ سولہ دنوں کے دوران ایک دو مرتبہ چکن کڑاہی، ایک آدھ بار نہاری، پلاؤ یا بریانی بھی پک جاتی مگر آدھا مہینا گزرتے ہی زندگی کی گاڑی دال یا سبزی کے پہیوں پر چل پڑتی۔ غلام محمد کی بیوی، بچوں کے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے دال اور سبزی سے نت نئی ڈشز بنانے کی کوشش کرتی رہتی۔ کبھی آلو بھرے پراٹھے، کبھی دال کی منگوچیاں، کبھی کڑھی چاول تو کبھی سبزی پلاؤ۔ گائے کا گوشت تو مہینے دو مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ہی بصورت قیمہ لایا جاتا..... بکرے کا گوشت تو بقرعید پر ہی دیکھنے کو ملتا۔ بچے بھی چکن کھا کھا کر "چکن لورز" ہوگئے تھے۔ بڑا یا چھوٹا گوشت آتا بھی تو منہ نہ لگاتے۔ غلام محمد کو پنشن ملتی تو مکان کا کرایہ اور یوٹیلٹی بلز کی ادائیگی کے بعد پانچ پانچ سو روپے جیب خرچ نکالنے کے بعد بچی رقم بیوی کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ اب بے چاری مومنہ ہوتی، یوٹیلٹی بلز، بچوں کے تعلیمی مصارف اور مہینا بھر گھریلو اخراجات۔ بچوں کی فیسیں جو پہلی ترجیح کی صورت ہمیشہ سر پر آ کھڑی ہوتیں، جوڑنے کے لیے مومنہ کو گھریلو مصارف میں نہ جانے کہاں کہاں کٹوتی کرنا پڑتی۔ یوٹیلٹی بلز کو کم سے کم رکھنے کے لیے وہ گھپ اندھیرا ہونے سے پہلے کوئی بتی نہ جلانے دیتی۔ روٹی پکانے کھڑی ہوتی تو پہلے پیڑے بنا کر تھال میں رکھتی پھر توا گرم کرنے کو چولہا جلاتی۔ گیس کا بل کم رکھنے کو وہ روٹیاں توے سے اتارنے کے بعد چولہا بجھا کر گرم توے پر سالن کی دیگچی سالن گرم کرنے کو رکھ دیتی۔ غلام محمد اپنی بیوی کے سلیقے کا قائل تھا۔ ہر گرم و سرد میں اپنے سگھڑاپے سے وہ زندگی کی ناؤ کو حالات کی تیز موجوں سے بھی نکال کر دور تک لے آئی تھی۔ غلام محمد کو یقین تھا کہ بیوی کی کفایت شعاری اسے زندگی کی ناؤ پار لگانے میں آخر تک ممد و معاون رہے گی۔

☆☆☆

خاصے انتظار کے بعد غلام محمد کو آباد کار ادارے کی طرف سے "کونسینٹ لیٹر" مل گیا جو اس امر کی نوید تھا کہ اسے آباد کار ادارے نے اپنے مجوزہ قیمتی رہائشی منصوبے میں اس کے گریڈ کے مطابق درجہ اول قطعہ اراضی کی الاٹمنٹ کے امیدواروں میں شامل کرلیا تھا۔ پلاٹ حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے کی صورت میں اسے اختتام مہینا کی مقررہ تاریخ تک آباد کار ادارے کے بینک اکاؤنٹ میں مبلغ پندرہ لاکھ روپے کی رقم جمع کرانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ غلام محمد کے حلقہ احباب میں دو تین اور افراد کو بھی "کونسینٹ لیٹر" ملا تھا۔ وہ فکرمند تھے کہ اتنی رقم یکمشت کہاں سے جمع کرائیں گے لیکن غلام محمد کو فکر نہ تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد واجبات کی مد میں ملنے والی رقم اس نے اپنے بینک اکاؤنٹ میں محفوظ رکھی ہوئی تھی۔ کونسینٹ لیٹر ملنے کی اسے اتنی خوشی تھی کہ اس نے مقررہ تاریخ سے قبل ہی اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکلوا کر آباد کار ادارے کے اکاؤنٹ میں جمع کروادی۔

آباد کار ادارے نے مجوزہ رہائشی منصوبے کے لیے زمین حاصل کرنے کو شہر کے مضافات میں آبائی گھروں کے مکینوں سے اس منصوبے میں پلاٹس میں شراکت اور معاوضے کی بنیاد پر معاملات طے کرنا شروع کردیے تھے۔ غلام محمد ایک دن اپنے ان دو احباب کے ہمراہ جو اسی کی طرح اس منصوبے میں پلاٹ کے حصول کے امیدوار تھے اور ان میں سے صلاح الدین نامی دوست آباد کار ادارے کو رقم جمع کرانے کے لیے اپنے پاس رقم نہ ہونے کے باعث ادھر ادھر سے قرض لے کر بہ مشکل رقم جمع کرا سکے تھے، وہ علاقہ بھی دیکھ آیا جہاں اس مجوزہ منصوبے کی آباد کاری ہونا تھی۔ علاقے کی گلیوں میں گھومتے پھرتے افراد، بے ہنگم دوڑتے بھاگتے اور مختلف مشاغل میں مصروف بچوں اور زندگی کی تھکن اپنے شکن آلود چہروں پہ لیے بوڑھے مرد و زن، بچے اور نیم پختہ گھروں میں سکتے

چولہوں سے اٹھ کر گھروں سے باہر آتے دھوئیں کو دیکھ کر غلام محمد کا دل اندر سے مغموم بھی ہوا کہ آباد کار ادارہ ان آباد گھروں کو اجاڑ کر ایک نئی بستی آباد کرنا چاہتا تھا..... لیکن پھر اس خیال سے مطمئن ہو گیا کہ بڑے بڑے آبائی رقبوں پر بنے ان کچے اور نیم پختہ گھروں کے باسیوں کو آباد کار ادارے کے مجوزہ منصوبے میں پلاٹ اور اس کے ساتھ معاوضہ بھی ملنے سے انہیں زندگی کی بنیادی سہولتوں کی فراہمی ملے گی اور وہ بہتر معیار زندگی کے ساتھ رہیں گے۔

غلام محمد کی نظر سے اخبار میں شائع شدہ ایک اشتہار گزرا جس میں آباد کار ادارے نے علاقے میں آباد مکینوں کو نئے منصوبے میں اپنی حصہ داری اور زمین کے معاوضے کے لیے ادارے سے رجوع کرنے کی ہدایت جاری کی تھی۔ غلام محمد مطمئن ہوا کہ اب اسے اپنا گھر بنانے کی منزل زیادہ دور نہ تھی۔

بڑی بیٹی سامعہ کے لیے ایک رشتہ آ گیا۔ لڑکا انجینئر تھا۔ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ تین بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ چوتھی کا بھی رشتہ آیا ہوا تھا۔ والدین اس کی شادی کر کے وداعی اور بیٹے کی شادی کر کے بہو گھر لانا چاہتے تھے۔ یعنی ایک ہی تقریب میں بیٹے کا ولیمہ اور بیٹی کی رخصتی..... گویا ایک پنتھ دو کاج۔

بات چیت ابھی ابتدائی مرحلے میں ہی تھی کہ آباد کار ادارے کی طرف سے پراویژنل آفر لیٹر آ گیا جس میں پلاٹ کی دوسری قسط مقررہ تاریخ تک ادارے کے اکاؤنٹ میں جمع کرانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ بصورت دیگر غلام محمد کو پلاٹ کی الاٹمنٹ کا معاملہ معدوم ہو جاتا۔ غلام محمد اس ناگہانی کے لیے تیار تو تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں تیرہ لاکھ سے اوپر رقم موجود تھی۔ خیال تھا کہ جب تک ادارہ دوسری قسط طلب کرے گا، کھینچ تان کر دوسری قسط ادا کرنے کے لیے رقم پوری ہو جائے گی۔ ادھر سامعہ کے لیے رشتہ آیا ہوا تھا اور وہ لوگ جلدی شادی کرنا چاہتے تھے۔

غلام محمد کی بیوی مومنہ کا خیال تھا کہ پلاٹ کی دوسری قسط ادا کرنے سے زیادہ اہم بیٹی کے فریضے سے سبکدوش ہو جانا تھا۔ لڑکیوں کی شادی کی ایک عمر ہوتی ہے جو گزر جائے تو پھر مناسب رشتہ نہیں ملتا۔ سامعہ کی خوبصورتی اور دراز قامتی کی وجہ سے اچھا رشتہ مل رہا تھا اور مومنہ کے خیال میں یہ اس کی شادی کے لیے بہترین موقع تھا۔ رشتہ بھی مناسب مل رہا تھا۔ لڑکا اور اس کے گھر والے سامعہ کو دیکھ کر پسند کر چکے تھے۔ اچھا رشتہ ٹھکرا دو تو پھر اچھا ملنا ذرا مشکل ہی ہو جاتا ہے۔ مومنہ کی ماں کہا کرتی تھی کہ بیٹی کا بھلا رشتہ آئے تو چھان بین کر و، دل ٹھک جائے تو بسم اللہ کر کے بیاہ دو۔ آئے پر منت کرو ورنہ پھر منہ ہی رہتی ہے۔

غلام محمد مخمصے میں پڑ گیا۔ بیٹی کی شادی کرتا تو پلاٹ کی دوسری قسط ادا نہ ہو پاتی۔ پلاٹ کی قسط ادا کرتا تو بیٹی کی شادی نہ ہو پاتی۔ بیٹی کی شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل تو نہیں۔ شادی کرنے کھڑے ہو تو لگتا ہے پیسا بند مٹھی سے ریت کی طرح پھسلتا چلا جاتا ہے۔

آباد کار ادارے کی طرف سے کونسینٹ لیٹر ملنے کے بعد غلام محمد کے موبائل فون پر پراپرٹی ڈیلرز کے جو میسج آنے شروع ہوئے تھے، پراویژنل آفر لیٹر ملنے کے بعد ان میسجز کی تعداد دگنی ہو گئی تھی جن کا لب لباب یہ تھا کہ فائل فروخت کرنی چاہو تو بہترین آفر موجود ہے۔ بہترین آفر یہ بھی کہ کونسینٹ لیٹر ملنے کے بعد پراپرٹی ڈیلرز سرمایہ کاری کی نیت سے بذات خود یا کسی خریدار کے لیے اسٹامپ پیپر پر یہ لکھت پڑھت کر لیتے کہ جس شخص کو آباد کار ادارہ پلاٹ الاٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ سرمایہ کار سے بعوض طے شدہ رقم یہ معاہدہ کرتا کہ اسے جب بھی پلاٹ ملے گا، وہ اس کے مالکانہ حقوق اس شخص کو منتقل کر دے گا جس سے اس نے پلاٹ کی الاٹمنٹ سے قبل ہی منافع کی رقم وصول کر لی ہے۔ کونسینٹ لیٹر ملنے کے بعد پراپرٹی ڈیلرز غلام محمد کو ایسے ہی معاہدے کے تحت پندرہ سولہ لاکھ روپے فوری ادا کرنے کو تیار تھے۔ پلاٹ کی پہلی قسط کی ادائیگی کے بعد یہ منافع بڑھ کر پچاس پچپن لاکھ علاوہ پہلی قسط کے پندرہ لاکھ روپے ہو گیا تھا لیکن خریداری کی شرط یہ تھی کہ منافع کی رقم نصف اسٹامپ پیپر پر معاہدے کے وقت اور بقیہ نصف پلاٹ کی الاٹمنٹ کے بعد مالکانہ حقوق خریدار کو منتقلی کے وقت ادا کی جائے گی۔ البتہ پہلی ادا شدہ قسط کے پندرہ لاکھ یکمشت معاہدے کے وقت ادا کر دیے جائیں گے۔ مومنہ تو شروع میں ہی اس حق میں تھی کہ پندرہ سولہ لاکھ لے کر کسی پرائیویٹ ہاؤسنگ اسکیم میں چھوٹا سا پلاٹ خرید کر بینک میں محفوظ واجبات کی رقم سے اس پر مکان تعمیر کر لیا جائے مگر غلام محمد نے کہا۔ ''بھلی! لاکھوں میں ملنے والا پلاٹ کروڑوں تک جائے گا۔ آدھا کسی کو بیچ دیں گے، آدھے پر اپنا گھر بنا لیں گے۔ بچے بھی یاد کیا کریں گے کہ ماں باپ قیمتی جائداد چھوڑ گئے۔''

''ماں باپ کیوں؟ باپ کہو جی۔'' مومنہ بولی۔

غلام محمد نے بیوی کو محبت اور احترام سے دیکھا۔ پھر دکھ سکھ، سرد گرم میں تم نے میرا ساتھ دیا ہے۔ صرف باپ کیوں کہوں میں..... زندگی کے ہر معاملے میں تم میری ساجھے دار ہو۔''

''اللہ تمہاری ہر مراد پوری کرے۔'' مومنہ کونسینٹ لیٹر ملنے کے بعد پراپرٹی ڈیلرز کی پیشکش سے یک جنبش قلم دستبردار ہو گئی اور غلام محمد نے پلاٹ کی پہلی قسط جمع کروا دی۔

آباد کار ادارے کی جانب سے پراویژنل آفر لیٹر ملنے اور پلاٹ کی دوسری قسط جمع کرانے کے مطالبے تک منافع پچاس سے پچپن لاکھ تک جا پہنچا۔ اس بار سامعہ کی شادی مومنہ کے نزدیک پہلی ترجیح تھی مگر غلام محمد کے لیے پلاٹ کی دوسری قسط کی ادائیگی مقدم تھی جبکہ اس کے بینک کھاتے میں موجود رقم تیرہ لاکھ تیس ہزار ایک سو اٹھتر روپے تھی۔

''میاں! پلاٹ کی فکر چھوڑو..... بیٹی کو بیاہ دو..... اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے..... پلاٹ کا سودا کر لو..... پچاس پچپن منافع کا آدھا ستائیس لاکھ کے نزدیک تو ملے گا اور پہلی قسط کی رقم پندرہ لاکھ بھی مل جائے گی..... بہت ہے..... سامعہ کو رخصت کر کے بھی اتنی رقم ہاتھ میں آ جائے گی کہ اسے اور تمہارے اکاؤنٹ میں جو پیسے پڑے ہیں، اس سے چار پانچ مرلے پر اپنا کوئی ٹھکانا بھی بن جائے گا۔''

''پاگل ہوئی ہو۔ کروڑوں کا پلاٹ کوڑیوں میں بیچ دوں۔ تم دیکھنا پانچ کروڑ تک جائے گی اس کی قیمت۔''

''آج کی سوچو..... آج کی..... کل کس نے دیکھی۔ بیٹی کی شادی بھی تو کرنا ہے۔ اللہ نہ کرے اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل جائے تو پانچ کیا، دس کروڑ میں بھی ہاتھ نہیں آتا۔ پیسا ہاتھ میں ہو تو اچھے سے اچھا پلاٹ مل جاتا ہے مگر رشتہ خریدا نہیں جا سکتا۔''

''سامعہ کی ماں! پیسا ہو تو ایک نہیں، دس رشتے مل جاتے ہیں۔ ویسے بھی سامعہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ تعلیم اچھے برے وقت میں ڈھال بنتی ہے۔ سامعہ کو پڑھنے دو۔ کون سا کوئی عمر نکلی جا رہی ہے اس کی۔ اتنا قیمتی پلاٹ دوبارہ خواب میں بھی نہیں مل سکتا۔''

مومنہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''سوچ لو۔''

''سوچ لیا ہے۔ ان لوگوں سے کہہ دو آپ لوگوں کو جلدی ہے تو کہیں اور دیکھ لیں۔ ہماری بچی ابھی پڑھائی کر رہی ہے۔''

''اور جو دو لاکھ کم ہیں پلاٹ کی قسط ادا کرنے میں، وہ کہاں سے پورے کرو گے؟''

''دیکھتا ہوں..... پکڑتا ہوں کسی دوست رشتے دار

سے قرض ادھار۔" غلام محمد نے کہا۔

مومنہ گہری سوچ اور فکرمندی میں پڑ گئی۔ قرض، ادھار لینے کا کہنا آسان مگر لینا مشکل۔ ہر سوالی اپنے بچوں پر بھاری تھی۔ رہی سہی کسر کمر توڑ مہنگائی نے پوری کر دی تھی۔ کہاں تو وہ وقت تھا کہ ڈیڑھ دو ہزار میں مہینے بھر کا خشک سودا سلف بافراغت آ جاتا تھا۔ اب یہ حال کہ ہزار کا نوٹ ادھر بھنا ادھر ختم۔ غلام محمد کو کبھی ساڑھے سات ہزار کے لگ بھگ تنخواہ ملی اور کھلے ذہن سے گزارہ ہوتا تھا۔ اب یہ حال کہ پنشن کی مٹھی بھر رقم ہاتھ آتی پھر بھی دیکھ بھال کر گزارہ کرتا۔

بہرحال غلام محمد نے لاکھ روپیہ اپنے ایک دوست سے، پچاس ہزار کسی سے، دس کسی سے ادھار لے کر باقی ہزار بچتوں سے اور کچھ ادھر ادھر سے جمع کر کے پندرہ لاکھ اپنی جیب سے پورے کیے اور آباد کار ادارے کو دوسری قسط ادا کر کے چین کا سانس لیا۔ خوش تھا کہ دو اقساط کی ادائیگی کے بعد وہ کمپیوٹرائزڈ بیلٹنگ میں شامل ہونے کا اہل ہو گیا تھا مگر مومنہ کو افسوس تھا کہ غلام محمد نے پلاٹ کی دوسری قسط ادا کرنے کے چکر میں بیٹی کا اچھا بھلا معقول رشتہ گنوا دیا تھا۔ لڑکے والوں سے یہ کہہ کر معذرت کر لی گئی تھی کہ سامعہ کی تعلیم مکمل ہونے سے پہلے اس کی شادی کرنا ممکن نہیں۔ لڑکے والوں کو شادی کی جلدی تھی لہٰذا وہ کسی اور در پر لگ گئے۔

آباد کار ادارے نے اپنے مذکورہ رہائشی منصوبے کے لیے جس مقامی آبادی سے زمین حاصل کرنا تھی، انہیں اپنی زمین کا معاوضہ حاصل کرنے کے لیے دوبارہ اشتہار جاری کر دیا۔ یہ لوگ جو خود کو متاثرین کہتے تھے، ادارے کی جانب سے مقرر کردہ معاوضے سے مطمئن نہ ہونے پر عدالت جا پہنچے اور انہوں نے اپنے آبائی حقوق اور خدشات و نقصانات نیز روز افزوں مہنگائی کی بنیاد پر آباد کار ادارے سے اپنی زمینوں کے عوض زائد معاوضے کا مقدمہ دائر کر دیا۔

غلام محمد اور اس جیسے بہت سے جو اس منصوبے میں پلاٹ ملنے کی آس میں پلاٹ کی قیمت کی دو پیشگی اقساط ادا کیے بیٹھے تھے، ان کا خیال تھا کہ وہ جلد جیت جائیں گے یہ مقدمہ نمٹ جائے گا کیونکہ قبل ازیں بھی آباد کار ادارے کو اپنے رہائشی اور تعمیراتی منصوبوں کے لیے مقامی آبادیوں سے زمین کے حصول میں ایسے مقدمات کا سامنا ہو چکا تھا اور بالآخر ایسے مقدمات کا فیصلہ افہام و تفہیم کی بنیاد پر ہوا تھا۔ آباد کار ادارہ جن لوگوں کی زمین لیتا، انہیں ان کی زمین کی ملکیت کے بدلے تحریری نسبت سے نہ صرف منظم رہائشی منصوبے میں پلاٹ ملتا بلکہ آباد کار ادارہ ان سے لی گئی زمین کا معاوضہ بھی انہیں ادا کرتا۔ غیر منظم اور شہری سہولیات سے محروم وسیع رقبوں پر بسنے کچے اور نیم پختہ مکانوں میں نسل در نسل زندگی گزارتے مکینوں کو آباد کار ادارے کے نئے رہائشی منصوبوں میں پُرسہولت اور منظم رہائش میسر آ جاتی۔ عدالتیں جانتی تھیں کہ نسلوں پرانی غیر منظم اور زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم آبادیوں کو مسمار کر کے انہیں منظم اور باسہولت رہائشی علاقوں میں تبدیل کرنا ملک کی روز افزوں آبادی کی رہائشی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ بیرونی دنیا کے سامنے اپنے ملک و قوم کا بہتر امیج بنانے کے لیے بھی وقت کی اہم ضرورت تھی۔ چنانچہ ایسے تمام سابقہ مقدمات میں عدالتوں کا فیصلہ بالآخر آباد کار ادارے کے حق میں ہی ہوا تھا۔ آبائی مکین جو خود کو متاثرین کہتے، بالآخر وہ بھی رہائشی سہولیات سے مزین منصوبوں میں گھر بنا کر خوش ہو جاتے یا منافع لے کر آگے نکل جاتے۔

شومئی قسمت، عدالت نے آباد کار ادارے کے خلاف حکم امتناع جاری کر کے متوقع الاٹیز کی امیدوں پر گھڑوں پانی ڈال دیا۔

"اب کیا ہو گا؟" غلام محمد کی بیوی نے میاں سے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے۔ جنہوں نے الاٹمنٹ کرنی ہے، وہ اب اوپر والی عدالت میں اپیل کریں گے۔"

"پھر؟"

"ان شاء اللہ فیصلہ حق میں آئے گا۔"

"کب تک؟"

"دیکھو کب تک۔"

"اس پلاٹ کے چکر میں سامعہ کا اچھا بھلا رشتہ ہاتھ سے نکل گیا۔" مومنہ مغموم ہو کر بولی۔

"فکر کیوں کرتی ہو۔ پلاٹ مل جائے، آدھا بیچ کر اپنے پیسے ہاتھ میں آ جائیں گے کہ سامعہ کے لیے اس سے بھی اچھا رشتہ مل جائے گا۔"

"رشتے کوئی بازار میں بکتے ہیں جو تم پیسا ہاتھ میں آنے پر اچھا رشتہ ملنے کی بات کر رہے ہو۔"

"ایک اشتہار دوں گا اخبار میں ضرورت رشتہ کا..... ساتھ لکھ دوں گا خوشحال گھرانے کی بیٹی..... تم دیکھنا لائن لگی ہو گی رشتوں کی۔"

"دیکھیں گے۔" مومنہ بولی۔

"ہاں ہاں..... اب تو رشتے یونہی ہوتے ہیں۔ لوگوں کے پاس اتنا ٹائم کہاں کہ اپنے بچوں کے لیے گھر گھر

رشتے دیکھتے پھریں۔"

"کچھ اندازہ ہے عدالت سے اپیل کا فیصلہ کب تک آ جائے گا؟" مومنہ نے موضوع بدل دیا۔

"میں دفتر گیا تھا معلومات کرنے۔ وہ لوگ بتا رہے تھے بڑے بڑے لوگوں نے اپلائی کر رکھا ہے اس اسکیم میں۔ ان کا دباؤ ہو گا۔ زیادہ دیر نہیں ہو گی فیصلہ آنے میں۔"

"اللہ کرے جلدی آئے۔"

"آمین!"

☆☆☆

اعلیٰ ترین عدالت سے آباد کار ادارے کے حق میں فیصلہ آ گیا۔ ادارے کو اپنا کام جاری رکھنے کی اجازت مل گئی۔ آبائی زمینوں پر آباد مکینوں کو زمین میں شراکت اور معاوضے کے حصول کے لیے اخبارات میں اشتہار پڑھ کر غلام محمد اور اس جیسے بہت سوں کو تسلی ہوئی کہ ان کی امید بر آئی۔ آباد کار ادارے نے علاقے میں ترقیاتی کاموں کے لیے گفت و شنید شروع کر دی اور ممبران کو پلاٹوں کی الاٹمنٹ کے لیے بذریعہ کمپیوٹر قرعہ اندازی بھی کر دی۔ غلام محمد کا نام ان خوش نصیب افراد کی فہرست میں شامل تھا جنہیں پلاٹ کی الاٹمنٹ کر دی گئی تھی۔

غلام محمد کو الاٹیز کی فہرست میں اپنا نام شامل ہونے پر جو خوشی تھی، سو تھی، مومنہ اور بچوں کی مسرت اس سے بھی سوا تھی۔ غلام محمد نے شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ احباب و اقارب کی جانب سے مبارک باد اور تہنیتی پیغامات کی بھرمار ہو گئی۔ غلام محمد کے سابق رفقائے کار کا کہنا تھا اس کی ایمانداری اور طویل تدریسی خدمات کا بہترین صلہ اسے اس پلاٹ کی الاٹمنٹ کی صورت میں ملا تھا۔ غلام محمد کے ایک دو ساتھی تو کیک اور مٹھائی کے ساتھ مبارک باد دینے پہنچ گئے البتہ رشتے داروں میں سے کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی۔ تاہم غلام محمد کا ایک خالہ زاد بھائی جو اس کا ہم زلف بھی تھا، اپنی بیوی کے ساتھ مبارک باد دینے آیا۔ غلام محمد کا یہ کزن جس کا نام عبدالرشید تھا، خشک میوہ جات کا بیوپاری تھا۔ خوشحال آدمی تھا۔ غلام محمد کی بیوی مومنہ اور عبدالرشید کی بیوی آمنہ میں بہت محبت تھی۔ آمنہ اور عبدالرشید نے غلام محمد کے چھوٹے بیٹے سے اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر رکھا تھا۔ گو غلام محمد کے چھوٹے بیٹے سے تین بڑے بہن بھائی اور بھی تھے اور دلی ہنوز دور است والا معاملہ تھا مگر دونوں گھرانوں کو مستقبل کے اس رشتے نے قربت کی زنجیر میں باندھ دیا تھا۔

اگلے چند دن غلام محمد کے گھر کی فضا خوشی سے معمور رہی۔ غلام محمد بار بار خدا کا شکر ادا کرتا۔ مومنہ جو پچھلے چار پانچ سال سے سامعہ کا پہلا اچھا رشتہ ہاتھ سے جانے پر مغموم رہی تھی اور درمیانی عرصے میں سامعہ کے لیے دو تین اور رشتوں پر بھی اس آس میں کہ مناسب جہیز نہ دے پائی تھی کہ غلام محمد کو پلاٹ ملے گا تو آدھے پلاٹ کے سودے سے حاصل ہونے والی رقم سے سامعہ کی شادی کے ساتھ باقی بچوں کے بھی اہم معاملات نمٹائے گی، غلام محمد کو پلاٹ کی الاٹمنٹ ملنے سے نہایت مسرور تھی۔ بچے بھی بہت خوش تھے۔ کوئی کہتا اب سامعہ باجی کی شادی ہو گی۔ کوئی کہتا پرانی گاڑی کی جگہ کچھ کر کے نئی گاڑی خریدیں گے۔ کوئی کہتا، تین سمسٹرز کی فیس ادا ہو گی ہے۔ اکاؤنٹس والے آئے دن بلا کر شرمندہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے میری فیس جانی چاہیے۔ سامعہ واحد تھی جو کچھ نہ کہتی۔ ایم بی اے کرنے کے بعد وہ کئی ماہ مناسب ملازمت کی تلاش میں جوتیاں چٹخانے کے بعد ایک سافٹ ویئر ہاؤس میں ملازمت کر رہی تھی۔ گھر کے حالات اسے فی الحال شادی کے بارے میں سوچنے کی اجازت ہی نہ دیتے۔ باپ اگرچہ بیس گریڈ میں ملازمت سے ریٹائر ہوا تھا مگر اس کی پنشن گھر کی تمام ضروریات پوری کرنے سے قاصر رہتی۔ مومنہ لاکھ کوشش کرتی کہ میاں کی پنشن میں سے بچت ہو، سامعہ کی تنخواہ ہی سے جو سامعہ ہر ماہ سر جھکا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا کرتی تھی، کچھ بچت کر کے سامعہ کے جہیز کے لیے کچھ سامان کرے مگر مومنہ کی کوشش بسیار ہر ماہ کے آخر میں اس کا خالی ہاتھ رہ جاتی تھی۔ بہرحال صبر کا پھل میٹھا۔ مومنہ خوش تھی کہ غلام محمد کو الاٹمنٹ لیٹر مل گیا تھا۔ اب بہت سے مسائل نمٹنے کی امید تھی۔ غلام محمد کو الاٹمنٹ سے زیادہ ٹرانسفر مکمل ہو جانے کی خوشی تھی۔ پلاٹ کی الاٹمنٹ اور ٹرانسفر ہینڈل ہوتے ہی قیمتیں اچانک بڑھ گئی تھیں۔ غلام محمد کو ملنے والا کارنر پلاٹ جس کا منافع پراپرٹی ڈیلرز حد اتنی لاکھ اور وہ بھی آدھا الاٹمنٹ سے قبل اور آدھا ٹرانسفر کے بعد دینے کی بات کرتے تھے، یکمشت ڈھائی سے پونے تین کروڑ تک جا پہنچا تھا۔ غلام محمد کی بیوی اور بچے خوش تھے کہ اب گھر میں خوشحالی آئے گی۔ سامعہ کی شادی ہو جائے گی۔ فیسیں جن کی عدم ادائیگی کی وجہ سے شرمندگی کا سامنا رہتا تھا، ادا ہو جائیں گی۔ آئے دن کی روگی کھٹارا گاڑی کی جگہ نئی گاڑی آ جائے گی اور غلام محمد خوش تھا کہ اب وہ اپنے بال بچوں کے لیے گھر بنائے گا اور ماں باپ اگلے جہان میں ملاقات ہونے پر یہ نہیں کہیں گے کہ بندر کی طرح ڈال ڈال چھلانگیں مارنے کی طرح تو بھی کرائے

کے کمروں میں پڑا رہا، اپنے بچوں کے لیے گھر نہیں بنا سکا۔
گھر بنانے کے لیے غلام محمد کے ذہن میں دو آئیڈیے تھے۔ اول یہ کہ ملنے والے پلاٹ کا سودا کرکے ہاتھ آنے والی رقم کے بڑے حصے سے کسی مناسب رہائشی علاقے میں بنا بنایا مکان خرید کر بال بچوں کو اس میں آباد کرے اور کچھ رقم بچا کر بچوں کی خواہش کے مطابق ایک گاڑی خرید لے، ان کی رکی ہوئی فیسیں ادا کردے جس کا وہ روز روز تقاضا کرتے تھے اور سامعہ کے ہاتھ پیلے کردے۔ اس کی شادی کی عمر نکلی جارہی تھی۔ بیٹوں کی تو ابھی عمر تھی اور چھوٹی بیٹی راحمہ کی شادی میں ابھی دو تین سال دیر کی جاسکتی تھی۔ دوسرا آئیڈیا یہ بھی تھا کہ آدھے پلاٹ کا سودا کرکے اس سے دیگر مسائل حل کیے جائیں اور بقیہ آدھے پلاٹ پر آہستہ آہستہ گھر بنالیا جائے۔ پاؤں کے نیچے زمین ہو تو دیر سویر گھر بن ہی جاتا ہے۔

غلام محمد کے موبائل فون پر پراپرٹی ڈیلرز کے میسجز اور فون کالز کا سلسلہ تو کوٹیشن لیٹر ملنے کے بعد سے مسلسل جاری تھا۔ کبھی اس میں مندی آجاتی، کبھی تیزی۔ کھیل کی قسم کا ایک پراپرٹی ڈیلر کا وتیرہ تو یہ تھا کہ جب وہ حالات الاٹیز کے حق میں موافق ہوتے دیکھتا "بیسٹ آفر" کا سبز باغ دکھانا شروع کردیتا اور جونہی ہوا کا رخ بدلتے دیکھتا، الاٹیز کو پرسہ دینا اور مایوسی کے اندھیروں میں دھکیلنا فرض عین سمجھتا۔ عدالتی فیصلہ آبادکار ادارے کے حق میں آنے پر اس کا لہجہ کچھ ہوتا اور فیصلہ مخالفت میں آنے پر کچھ ہوجاتا کے ساتھ ان حالات میں بھی "بیسٹ آفر" کی پیشکش یوں کرنے لگتا جیسے الاٹیز کا سارا درد اسی کے جگر میں تو بسا تھا۔

الاٹمنٹ لیٹر ملتے ہی غلام محمد کے موبائل پر پراپرٹی ڈیلرز کی فون کالز اور میسجز میں غیر معمولی تیزی آگئی۔ غلام محمد نے ایک پراپرٹی ڈیلر سے آدھے پلاٹ کا سودا کرنے کی بات کی تو معلوم ہوا اس میں کچھ قانونی سقم تھا۔ پورے پلاٹ کا سودا فوری ہوسکتا تھا مگر آدھے کا نہیں۔ مومنہ اور بچوں نے رائے دی کہ پورے پلاٹ کا سودا کرلیا جائے مگر پورا پلاٹ فروخت کردینے کے خیال سے غلام محمد کا دل یوں اس طرح دکھتا تھا جیسے اپنا بچہ کسی اور کی نسبت میں دینے کو کہا جارہا ہو۔ کتنا انتظار کیا تھا اس نے اس پلاٹ کے ملنے کا۔ ایک دو دن یا چند ماہ نہیں، کئی سال...... زندگی میں کبھی کسی اور اشد ضرورت کے لیے بھی کسی سے قرض نہ مانگنے والے غلام محمد کو اس پلاٹ کی دوسری قسط ادا کرنے کے لیے قرض بھی لینا پڑ گیا تھا جو باوجود ہزار کوشش اب تک ادا نہ ہوسکا تھا۔ گئی بات یہ بھی کہ اس پلاٹ کی خاطر تو غلام محمد اب تک ریٹائرمنٹ کا لطف ہی نہ اٹھا سکا تھا۔ وہی فکروں اور حسرتوں میں ڈوبی زندگی۔ لمحہ لمحہ ضرورتوں کے گرداب میں الجھی۔ جن دنوں وہ ملازمت میں تھا، مومنہ اکثر اس سے کہا کرتی تھی کہ جب وہ ملازمت سے ریٹائر ہوجائے گا تو دونوں حج کرنے جائیں گے۔ مومنہ بڑی صابر و شاکر اور قناعت پسند عورت تھی۔ غلام محمد کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی میں اس نے غلام محمد سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ جو وہ خود سے دے دیتا، اسی میں خوش ہوجاتی۔ اس بھلی عورت کو تو نہ اچھے کپڑوں کی خواہش ہوتی تھی نہ زر و زیور کی...... آمنہ جو غلام محمد کے کزن سے بیاہی تھی اور خاصی خوشحال تھی، چپ چاپ اپنے استعمال شدہ مگر اچھی حالت میں کپڑے اور جوتے اسے دے جاتی اور وہ خوش ہوکر لے لیتی۔ غلام محمد سے بعد ریٹائرمنٹ حج کی خواہش مومنہ کی پہلی اور واحد فرمائش تھی۔ اس پلاٹ کی خاطر غلام محمد نے مومنہ کی اس خواہش کو اب تک التوا میں رکھا ہوا تھا۔ یہ قرض تھا جو اسے بیوی کو ادا کرنا تھا۔

آمنہ کے ذریعے اس کے شوہر اور غلام محمد کے کزن عبدالرشید کو یہ معلوم ہوا کہ غلام محمد اپنے آدھے پلاٹ کا سودا کرنا چاہ رہا تھا مگر آدھے پلاٹ کے ٹرانسفر میں کچھ قانونی سقم تھا تو اس نے ٹرانسفر کے بنا محض اسٹامپ پیپر پر معاہدے کی بنیاد پر آدھے پلاٹ کی مارکیٹ قیمت فی الفور ادا کردینے کا عندیہ ظاہر کیا۔ وجہ یہ تھی کہ غلام محمد اور عبدالرشید دونوں کی بیویاں کزن تھیں اور دونوں میں آپس میں بہت پیار تھا...... پھر اگلی نسل میں دونوں گھرانوں میں غلام محمد کے چھوٹے بیٹے سے عبدالرشید کی بیٹی کی نسبت طے تھی۔ غلام محمد کے آدھے پلاٹ کی فروخت کا سودا اسٹامپ پیپر تو کیا زبانی کلامی ہوجانے میں بھی کوئی کھٹکا نہ تھا۔

☆☆☆

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

شومئی قسمت جس دن غلام محمد اور عبدالرشید کے درمیان آدھے پلاٹ کی حق ملکیت کا معاہدہ کرنے کے لیے ان دونوں کا عدالت جانا طے تھا، اسی دن خبر ملی کہ عدالت عالیہ نے پھر آبادکار ادارے کو قرعہ اندازی کی غیر شفافیت کے خلاف فیصلہ دے کر منصوبے پر مزید پیش رفت پر حکم امتناع جاری کردیا تھا اور اس بار آبائی زمینوں کے متاثرین کے ساتھ وہ ہزار ہا افراد بھی آبادکار ادارے کے خلاف فریق مقدمہ تھے جنہیں نظرانداز کرکے آبادکار ادارے نے بڑی تعداد

میں ایسے بااثر افراد کو بھی اس اسکیم میں پلاٹ الاٹ کردیے تھے جنہیں پہلے ہی کسی سرکاری اسکیم میں ایک پلاٹ الاٹ کیا جاچکا تھا۔ ایک فرد کو سرکاری رہائشی منصوبوں میں دو پلاٹوں کی الاٹمنٹ مروجہ سرکاری پالیسی کے خلاف تھی اور وہ تمام لوگ جنہیں قرعہ اندازی میں شامل نہیں کیا گیا تھا، بااثر افراد کو دوسرے پلاٹ کی الاٹمنٹ اپنے جائز حق سے محرومی بالفاظ دیگر اپنی حق تلفی سمجھتے تھے۔ بات سچ بھی تھی مگر غلام محمد اور اس جیسے بے شمار افراد کے لیے دکھ کی بات بھی جو کئی سال سے اپنی تمام آرزوئیں اور احتیاجات اشد ضرورتیں اس منصوبے میں پلاٹ کی الاٹمنٹ سے وابستہ کیے صبر آزما انتظار کی صلیب پر لٹکے ہوئے تھے۔ کوئی پلاٹ فروخت کرکے حاصل ہونے والے منافع سے اپنی ضروریات پوری کرنے کی خواہش رکھتا تھا تو کوئی اپنی دیرینہ اور تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کرنا چاہتا تھا اور کوئی غلام محمد کی طرح اپنے بال بچوں کے لیے گھر بنا کر اگلے جہان میں اپنے بزرگوں کا سرخروئی کے ساتھ سامنا کرنا چاہتا تھا۔ ویسے تو یہ بھی ایک تکلیف دہ بات تھی کہ ساری زندگی ایمانداری سے اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہنے والا غلام محمد اپنے بچوں کے لیے ایک گھر بھی نہیں بنا سکا تھا اور وہ اس لیے کہ اس کی طویل سرکاری خدمات کے عوض مفت بھی نہیں، قیمتاً ملنے والے ایک قطعۂ زمین کے حصول میں ایک نہیں، کئی کئی مافیاز رکاوٹیں کھڑی کررہے تھے۔

بعض عقلاء و زعماء سرکاری ملازمین کو ملنے والے قطعۂ اراضی کے خلاف استدلال کرتے تھے کہ ملازمین دوران ملازمت تنخواہ اور مراعات کی صورت اپنا حق خدمت وصول کرلیتے ہیں اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی انہیں پنشن ملتی رہتی ہے لہٰذا سرکاری منصوبوں میں پلاٹ حاصل کرنا ان کا استحقاق نہیں...... مگر غلام محمد کے ایک ساتھی کا استدلال ان عقلاء و زعماء کے استدلال پر بھاری محسوس ہوتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ حق خدمت کے علاوہ اظہار تشکر بھی ہوتا ہے۔ ٹیکسی میں سفر کرکے منزل پر پہنچنے کے بعد مسافر ٹیکسی ڈرائیور کو بخشش دے کر اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد بل کی ادائیگی کرکے خدمت گار ویٹر کو بخشش دینا بھی تشکر کے زمرے میں آتا ہے۔ پرانے وقتوں میں امراء اور بادشاہ اپنے درباریوں کی خدمات سے خوش ہوکر انہیں جاگیریں عطا کردیا کرتے تھے۔ سرکاری ملازمین کو ملنے والے پلاٹ بھی گویا سرکار کی طرف سے ملازمین کی خدمات کا اعتراف تشکر ہی تھا اور وہ بھی مفت نہیں، قیمتاً۔

غلام محمد کا یہی ساتھی مزید جذباتی ہوکر کہتا۔ "یار! ایک مریض اسپتال میں داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جو اس کا علاج اور نرس جو اس کی دیکھ بھال کرتی ہے، دونوں اپنی خدمات کا معاوضہ پاتے ہیں لیکن پھر بھی صحت یاب ہونے والا مریض اپنی ممنونیت کے اظہار کے لیے انہیں کیک یا مٹھائی پہنچانا ضروری سمجھتا ہے۔ دنیا اسی طرح چل رہی ہے بھائی...... تشکر اور اظہار ممنونیت سے۔"

☆☆☆

آبادکار ادارے نے عدالت عالیہ کے حکم امتناع کے خلاف پھر عدالت عظمیٰ میں اپیل دائر کردی۔ الاٹیز پھر دن گننے لگے۔ خیال تھا کہ عدالت عظمیٰ جلد ہی کوئی فیصلہ دے گی جو یقیناً آبادکار ادارے کے حق میں ہوگا مگر یہ خیال خام ثابت ہوا۔ سماعت ہوئی پھر ایک نیا بینچ تشکیل دے دیا گیا۔ غلام محمد اور اس جیسے بہت سے الاٹیز کی ہر صبح، ہر شام کسی اچھی خبر کے انتظار میں گزرنے لگی۔ خبریں آتی تو تھیں مگر کچھ اس طرح کی...... کبھی بینچ کا ایک رکن چھٹی پر، کبھی دوسرا بیمار، کبھی کسی کا خانگی مسئلہ تو کبھی روٹین کی تعطیلات۔ بے چارہ غلام محمد اپنے ہی گھر میں چور بنا پھرتا۔

مومنہ کہتی۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا چھوٹا سا گھر بنالو اور بچوں کی ذمے داریاں پوری کرو۔ سامعہ کی شادی کی عمر نکلتی جا رہی ہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر تو میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ اچھا بھلا رشتہ تھا جو تم نے اس موئے پلاٹ کے چکر میں گنوا دیا۔ آج دو تین بچوں کی ماں ہوتی سامعہ اور ہم دونوں نانا نانی بھی بن چکے ہوتے۔"

مومنہ غلط نہیں کہتی تھی۔

"اب تک تو راحمہ کی بھی بات چیت پکی ہوجانا چاہیے تھی۔" مومنہ کا لہجہ درد آگیں ہوتا۔

راحمہ سب سے چھوٹی ہونے کے ناتے گھر بھر کی لاڈلی تھی۔

مہنگائی دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی۔ ڈالر اونچی اڑان اڑ رہا تھا۔ سیاست دان گتھم گتھا تھے۔ ملک لٹ رہا تھا اور عوام کا خون چوسنے والوں کی موج لگی تھی۔ سرکاری ملازمین کی آبادکاری منصوبے سے ہنوز اگر کسی کو دلچسپی تھی تو وہ غلام محمد جیسے اپنا گھر بنانے کا خواب دیکھنے والوں کی آنکھوں سے خواب چرا لینے والی مافیا تھی۔ غلام محمد جیسوں کی مجبوریاں خریدنے والی مافیا، مایوسی اور ناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی بہترین آفر کی دہائی دیتی اور وہ بہترین آفر کیا تھی...... ڈھائی یا پونے تین کروڑ منافع اتنی

لوٹ لاکھ بلکہ بعض تو اس سے بھی کم کی آفر کرتے تھے۔ سرمایہ کار اور پراپرٹی مافیا مجبوروں سے ان کے خواب کوڑیوں کے مول لینا چاہتے تھے جبکہ روپے کی کوئی قدر و قیمت ہی نہ رہی تھی۔

غلام محمد اور اس کے گھر والوں کا پنشن میں گزارہ محال ہو گیا تھا۔ موصنہ حیرت زدہ لہجے میں کہتی۔ "سودا سلف خریدنے کے لیے جاؤ تو آدمی چور بن جاتا ہے۔ خشک اجناس کا بل ہی بیس پچیس ہزار تک پہنچ جاتا ہے اور روزمرہ سبزی ترکاری، گوشت اور ناشتے کا یہ حال کہ ہزار کا نوٹ نکالو تو پتا ہی نہیں چلتا کہاں گیا۔"

غلام محمد کے بچے ماں سے مذاقاً کہتے۔ "امی! ہمارے گھر کے باورچی خانے کو تو اس کی نظر لگ گئی ہے۔"

"شکر کرو چٹنی مل جاتی ہے۔ بہت سوں کو تو چٹنی بھی نصیب نہیں ہوتی۔" موصنہ انہیں آنکھیں دکھاتی۔

مہینے کے آخر تک ساحد کی تنخواہ بھی ٹھکانے لگ جاتی۔ بجلی کا بل، گیس کا بل، انٹرنیٹ کا بل۔ گرمی کے موسم میں پنکھوں اور ائرکولر کے استعمال سے بجلی کا بل ہوش ربا ہوتا تو سرما میں ہیٹر اور گیزر کا استعمال گیس کا بل بڑھا رہا۔ موصنہ کفایت شعاری کی خاطر مہینے کے آخری دنوں میں اپنی بلڈ پریشر کی دوا بھی نہ لیتی۔

آرام پسند راحت خوش تھی کہ مٹھی بھر پیسوں سے بچنے کی خاطر ماں نے اسے پرائیویٹ طور پر پڑھائی کرنے پر لگا دیا تھا۔ وہ دوپہر کو بارہ بجے سے پہلے بستر نہ چھوڑتی۔

بڑا بیٹا محمد طارق فیس کی عدم ادائیگی کے باعث پانچویں سمسٹر کے فائنل میں شرکت سے روک لیا گیا تھا۔ پانچویں سمسٹر میں دوسرے، تیسرے، چوتھے اور پانچویں سمسٹرز کی فیس واجب الادا تھی۔ یونیورسٹی کی مہربانی تھی کہ فیس دیے بغیر پڑھنے دیا۔ پانچویں سمسٹر کے فائنل سے ایک دن قبل غلام محمد یونیورسٹی گیا اور شعبہ مالیات کے سربراہ کی منت سماجت کی۔ بس پاؤں پکڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔ انہوں نے رجسٹرار سے سفارش کر کے اتنی رعایت دلوائی کہ ڈھائی لاکھ روپے سے زائد واجب الادا فیس کے کم سے کم پچاس ہزار تو ادا کیے جائیں۔ بیٹے کے مستقبل کا سوال تھا۔ موصنہ نے کزن آمنہ کے سامنے دست سوال دراز کیا۔ بھاگم بھاگ فیس جمع ہوئی تب کہیں جا کر طارق کو ایڈمٹ کارڈ ملا۔ چھٹے سمسٹر میں پھر یہی مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ مہینے کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ گھر کے خرچے سے مشکل سے بیس ہزار ادا کیے گئے۔ وہ بھی یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی ہزار منت سماجت اور اپنی مجبوریوں کا احوال سنا کر، بقیہ واجبات جلد ادا کرنے کے وعدے کے ساتھ۔

تعلیم بھی تو کتنی مہنگی ہو گئی تھی۔ غلام محمد کو آج بھی یاد تھا..... کالج کی فیس دس روپیہ ماہانہ۔ بی اے کا کالج میں پوری ڈگری سوا سو روپے میں ختم ہو گئی تھی۔ اب تو ہزاروں میں بات کی جاتی تھی۔ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا کل خرچہ لاکھوں بن جاتا تھا۔ محمد طارق ہی ماں کو بتاتا تھا کہ دوسرے شہروں سے تحصیل علم کے لیے آئے اس کے بعض ساتھی جو ہاسٹل میں رہا کرتے تھے، بسا اوقات بھنے چنوں سے پیٹ بھرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ کیا قیامت تھی کہ چنے کھا کر بھوک کی تسکین کرنے والے یہ نوجوان جب ڈگریاں لے کر یونیورسٹی سے نکلتے تو انہیں اپنی اہلیت اور قابلیت کے خریدار کم ہی ملتے۔ غلام محمد جب چھوٹے بیٹے شارق کا داخلہ کروانے یونیورسٹی گیا تو ایڈمن افسر نے کہا۔

"جناب! حالات یہ ہیں کہ والدین اپنا پیٹ کاٹ کر بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں اور ہماری یونیورسٹی جب نائب قاصد کی اسامی کے لیے اخبار میں اشتہار دیتی ہے تو ایف اے، بی اے تو چھوڑیں، ایم اے، ایم فل کے نوجوان بھی درخواست ملازمت بھیج رہے ہوتے ہیں..... یہ ہے ہمارے معاشرے کا المیہ!"

شارق بی ایس کمپیوٹر سائنس کا طالب علم تھا۔ پہلے سمسٹر کی فیس تو غلام محمد نے جوں توں ادا کر دی تھی، اب دوسرے اور تیسرے سمسٹرز کی فیس تقریباً چھ لاکھ روپے واجب الادا تھی۔ اکاؤنٹس والے اسے آئے دن طلب کر کے شرمندہ کرتے اور وہ گھر میں آ کر پاؤں پٹختا۔

ساری زندگی صابر، شاکر اور قناعت پسند رہنے والی غلام محمد کی بیوی موصنہ بھی اب اکثر بھنانے لگی تھی۔

"تمہارے ابا سے کہا تو تھا میں نے کہ کنال بھر کی کوٹھی کے چکر میں نہ پڑیں، چھوٹا سا گھر بنا لیں اور تم لوگوں کی تعلیم اور دوسری ذمے داریوں کا خرچ نمٹا لیں مگر انہیں تو کنال پر کوٹھی بنانی تھی۔ کتنے سال ہو گئے، اب تک تو اس موئے پلاٹ کا فیصلہ ہوتا نہیں پایا۔ کبھی ایک عدالت تو کبھی دوسری عدالت..... ساحد کو چپ چاپ دیکھ کر سر اٹھا کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اس کے ساتھ کی سب لڑکیاں اپنے اپنے گھر کی ہو گئیں بلکہ بچوں والیاں بھی ہو گئیں۔ عدالتوں کے کانوں پر ہماری تکلیف، ہمارے درد کی جوں رینگتی ہے بھلا۔"

"بھلا! کیوں مایوس ہوتی ہو۔ اب کیس بڑی

عدالت میں ہے۔ ان شاء اللہ فیصلہ الاٹیز کے حق میں ہی آئے گا۔" غلام محمد تسلی دیتا۔

"بس تسلی ہی دیتے رہنا۔ بچوں کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی مجھ سے۔ ڈھنگ کی ایک گاڑی تک تو ہے نہیں بچوں کے لیے۔"

"ہو جائے گا..... سب ہو جائے گا۔" غلام محمد بیوی کو تسلی دیتا۔

"تب سے یہی سن رہی ہوں۔ کب ہو جائے گا؟"

کب؟ اس کا غلام محمد کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

بچے جب موصنہ سے اپنی مجبور زندگی کے بارے میں کوئی گلہ کرتے تو موصنہ دہائیاں دینا شروع کر دیتی۔ "سوچا تھا تمہارے ابا کو ریٹائرمنٹ پر جو پیسے ملیں گے، اس سے زندگی آسان ہو جائے گی مگر انہوں نے تو سارے پیسے ایک پلاٹ پر لگا دیے جو ملا بھی نہیں اب تک۔"

غلام محمد کان دبائے بچوں کے گلے شکوے اور موصنہ کی دہائیاں سنتا رہتا۔

"بابا! کچھ کریں نا۔" بچے غلام محمد سے کہتے۔

"کیا کروں بیٹا؟"

"احتجاج۔"

"کس سے؟"

"ان سے، جنہیں آپ اتنے سارے پیسے دیے بیٹھے ہیں۔"

"میں اکیلا تھوڑی ہوں بیٹا!"

"ہاں تو سب کو ملائیں اپنے ساتھ۔"

"دو تین ساتھی ہیں میرے جن کو پلاٹ الاٹ ہوا ہے۔ باقی تو میں کسی کو نہیں جانتا۔"

"سوشل میڈیا کا زمانہ ہے بابا! ایک گروپ بنائیں۔ لوگ خود ملتے جائیں گے۔"

"یار! مجھے کیا پتا گروپ کیسے بنایا جاتا ہے۔"

"میں آپ کو بنا دوں گا۔" شارق اپنی خدمات پیش کرتا۔

"اس سے کیا ہو گا؟" موصنہ متجسس ہو کر پوچھتی۔

"اماں جی! ہمارے بابا اس گروپ کے ایڈمن ہوں گے۔ الاٹیز کو جیسے جیسے پتا چلے گا، گروپ میں شامل ہوتے جائیں گے۔ آپس میں چیٹ کریں گے، مشورہ کریں گے اور احتجاج کے لیے کوئی اسٹریٹجی اختیار کریں گے۔"

"اسٹیجی کیا ہوتی ہے؟"

"اسٹیجی نہیں امی جی، اسٹریٹجی..... حکمت عملی۔"

"تو یوں بولو نا۔"

"اماں! آپ چار پڑھے لکھے بچوں کی ماں ہو۔"

"ریٹائرڈ پرنسپل کی بیگم بھی۔" غلام محمد نے خوشدلی سے اپنا حق جتایا۔

"اللہ کے واسطے مجھے تم جاہل ہی رہنے دو۔" موصنہ دونوں ہاتھ جوڑ کر غلام محمد کو تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "بس تم پلاٹ کے لیے کچھ کرو۔"

"پریشان کیوں ہوتی ہو۔ ہو جائے گا۔"

"کتنے سال ہو گئے یہی سنتے۔"

"بابا! میں آپ کو گروپ کری ایٹ کر کے دیتا ہوں۔" شارق بولا۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ یہ بھی کر لیتے ہیں۔"

ساحد کو باپ پر رحم آتا۔ ساری زندگی محنت اور ایمانداری سے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے والا شخص اپنے ہی گھر میں گویا کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ موصنہ جب غلام محمد کو اپنی ساری جمع پونجی پلاٹ کی قسطیں ادا کرنے پر تنقید کا نشانہ بناتی تو ساحد اسے سمجھاتی۔ "امی! ابا نے تو ہمارے لیے ایک اچھا گھر بنانے کی امید میں پیسے لگائے تھے نا۔ بابا بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ اتنا لمبا معاملہ کھنچ جائے گا۔"

"اب بیٹھے ہاتھ تاپ رہے ہیں۔ میری سن لیتے تو آج تم بھی اپنے گھر کی ہوتیں، بھائیوں کی فیسیں بھی آتی نہ جانے کب سے جمع ہو رہی ہیں۔"

"آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"وہی اپنے باپ والی بات..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ارے کہاں سے ہو جائے گا، کیسے ہو جائے گا اور کب ہو جائے گا؟ دعائیں مانگ مانگ کر میری تو زبان بھی گھس گئی۔ ہماری عمر میں لوگوں کی دعائیں اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں کی خیر و عافیت اور اپنے خاتمہ بالخیر کی ہوتی ہیں۔ ہم ہاتھ پھیلائے صبح و شام گڑگڑا رہے ہوتے ہیں..... یا اللہ! پلاٹ کا جلدی فیصلہ ہو جائے تا کہ کچھ تو ہمارے آنسو پونچھیں۔"

"فکر کیوں کرتی ہو۔ بہت لوگوں کا پیسا ہے اس لیے تو لوگوں کی نیتیں بگڑی ہوئی ہیں۔ روڑے اٹکا رکھے ہیں۔ ان برے حالوں میں بھی ہمارے پلاٹ کا منافع ایک کروڑ، ایک کروڑ دس لاکھ تک ہے علاوہ دو قسطوں کے۔ جب ملے گا تو تم دعائیں دو گی مجھے۔"

"ابھی کچھ عرصہ پہلے تو آپ بتا رہے تھے کہ منافع اسی لاکھ ہو گیا ہے۔" موصنہ نے گویا غلام محمد کی غلطی پکڑی۔

"رئیل اسٹیٹ مافیا بھی کھیل رہی ہے ہمارے ساتھ۔ ہمارے سیکٹر سے جڑے سیکٹر میں ہمارے پلاٹ سے کچھ چھوٹے پلاٹ کی قیمت ساڑھے چار پانچ کروڑ چل رہی ہے۔ ہمارا تو پچاس نوّے سائز کا پلاٹ ہے۔ ملے گا تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔"

"دیکھتے ہیں کب ملتا ہے..... اور ملتا بھی ہے کہ نہیں۔"

"کیوں بُری فال منہ سے نکالتی ہو۔"

"اچھی لگتی جو نہیں۔" صوفیہ کا لہجہ تیکھا ہوتا۔

غلام محمد کے گھر میں یہ تقریباً روزانہ ہی کا موضوع بحث بن چکا تھا۔ غلام محمد کو اپنی صفائی پیش کرنا مشکل ہو جاتی۔ کھٹائی میں پڑا پلاٹ اس کے لیے کسوٹی کا سوال بن گیا تھا۔ گھر میں دل پکڑوں کا ایک ہی سوال ہوتا کہ پلاٹ کب ملے گا؟ مستقبل کی ساری امیدیں اسی پلاٹ سے وابستہ تھیں۔ رشتے داروں سے ملنا ہوتا تو وہی سوال کہ پلاٹ کا کیا بنا؟ دوستوں میں جاتا تو پھر وہی سوال، پلاٹ کا کچھ بنا..... ؟ آمنہ کا شوہر اور غلام محمد کا کزن اور ہم زلف ہونے کے ساتھ ہونے والا سمدھی بھی جس سے غلام محمد الاٹمنٹ لیٹر ملنے کے بعد آدھے پلاٹ کا سودا کرنا چاہتا تھا، ایک روز ملاقات ہونے پر بولا۔ "بھائی جی! آپ کے سیکٹر کے زیادہ تر پلاٹس تو امریکا اور یورپ والے پاکستانی بھائی لے اڑے یا پھر اپنے ملک صاحب۔..... سودے کر لیے ہیں انہوں نے الاٹیز سے۔ دیکھنا کیسے کیسے محل کھڑے کریں گے۔ بھائی جی ایلیٹ کلاس کے سیکٹر میں آپ جیسوں کو گھر کون بنانے دے گا۔ اس کلاس کو گوارا ہی نہیں کہ اس کے پڑوس میں کوئی مڈل کلاس آدمی اپنا گھر بنائے۔"

غلام محمد کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔

"اب آپ جیسے گنے چنے لوگ اچھے وقت کے انتظار میں ہیں ورنہ جتنے سیانے تھے، اپنے الاٹمنٹ لیٹر کے پیسے کھرے کر کے آگے نکل لیے۔ سات سال پہلے آپ نے تیس لاکھ ملک صاحب کی کسی اسکیم میں لگائے ہوتے تو آج تین کروڑ ہوتے۔" غلام محمد کے ہونے والے سمدھی نے مزید زخم کا کچوکا لگایا۔ غلام محمد کو سمدھی کے دبے لفظوں میں اپنی بے وقوفی کا طعنہ بن کر از حد کوفت ہوئی۔

☆☆☆

غلام محمد کے چھوٹے بیٹے شارق نے جو گروپ کری ایٹ کیا، ابتدا غلام محمد کے ایک سابق ہم منصب نے جسے غلام محمد ہی کی طرح پچاس نوّے سائز کا پلاٹ الاٹ ہوا تھا، اس گروپ میں شمولیت اختیار کی پھر ایک ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر اور ایک ریٹائرڈ ٹیچر بھی جنہیں دوسری کیٹیگری کے پلاٹ کی الاٹمنٹ ملی تھی، گروپ میں شامل ہو گئے۔ آہستہ آہستہ اس گروپ میں ممبرز کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ بیرون ممالک کے بہت سے فون نمبرز بھی ارکان کی فہرست میں آ گئے۔ غالباً یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اصل الاٹیز سے ان کے پلاٹس کی خریداری کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ انویسٹرز اور رئیل اسٹیٹ والے بھی گروپ میں شامل ہو گئے۔ پھر بعض متاثرین بھی جن سے آبادکار ادارے نے زمین لی تھی، اس گروپ میں آ گئے۔

شروع شروع گروپ کے ارکان نے خاصی دلچسپی لی اور سرگرمی بھی دکھائی۔ ارکان کی اکثریت آبادکار ادارے کی نااہلی اور نظام انصاف کی سست روی کی شاکی تھی۔ کوئی آبادکار ادارے کو سفید ہاتھی قرار دیتا تو کوئی اسے کرپشن کا گڑھ سمجھتا۔ کسی کو سربراہِ ادارہ نااہل نظر آتا تو کوئی ادارے میں بیٹھے ملازمین کو باہر کی بجائے رئیل اسٹیٹ ڈیلرز کا پٹھو سمجھتا۔

اپنے نظام انصاف کی کارکردگی کا غلام محمد کو دوران ملازمت ایک مختصر اور ہلکا سا تجربہ تو تھا۔ اپنے ایک طالب علم کی تاریخ پیدائش کی درستی کے سلسلے میں اسے بحیثیت سربراہ ادارہ عدالت جانا پڑا تھا۔ اس کے ہمراہ آیا ہوا آفس کلرک اسے احتراماً عدالت کے ایک گوشے میں کرسی پر بٹھا کر داخلہ رجسٹر اور دیگر دستاویزات بغل میں دبائے عدالت کے باہر کھڑا ہو گیا تھا۔ غلام محمد کی باری آنے سے قبل آٹھ دس مقدمات تھے۔ آواز پڑتی، فریقین اپنے وکلاء کے ساتھ پیش ہوتے اور سوائے ایک دو کے سب آگے پیچھے چٹکی بجاتے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر فارغ۔ غلام محمد سخت حیران ہوا کہ یہ کیسا نظام انصاف تھا جہاں بس تاریخ پہ تاریخ اور جن کی شنوائی بھی ہوئی تو محض خانہ پری محسوس ہوئی۔

شارق کے بنائے گروپ کا کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔

متاثرین اپنا رونا روتے کہ ہم سے ہمارے آباء کی زمینیں زبردستی چھینی جاتی ہیں۔ معاوضہ بھی کم اور وقت پر ادا نہیں کیا جاتا۔ کوئی ان سے پوچھتا کہ بے آب و گیاہ زمینوں پر بیٹھے لوگ بھی تو منتیں مانتے تھے کہ کوئی ان کی زمینیں ایکوائر کرے اور اب جبکہ یہ سیکٹر بن رہی ہے کہ ان بنجر زمینوں اور زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم گھروں کی جگہ سہولتوں کی فراہمی کے ساتھ ترقی یافتہ منصوبوں میں گھر بنانے کے لیے پلاٹ اور ساتھ معاوضہ بھی دیا جائے تو بین شروع ہو جاتا ہے۔ اس گروپ میں الاٹیز بے چارے صلیب پر لٹکے روتے سسکتے تصویرِ انتظار بنے دکھائی دیتے۔

بڑے بیٹے طارق نے غلام محمد سے کہا۔ ”گروپ کا چکر چھوڑیں بابا! اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میڈیا کا دور ہے۔ میڈیا والوں سے رابطہ کریں۔ انہیں اپنی اسٹوری بتائیں۔ ہوسکے تو کچھ الاٹیز کو اکٹھا کرکے پُرامن احتجاج کریں۔ پریس کلب کے سامنے، اخبارات کے دفاتر کے باہر، عدالت کی عمارت کے سامنے، گروپ تو ڈھائی تین سو افراد تک محدود ہے۔ احتجاج کریں گے تو بات دور تک جائے گی اور سنی جائے گی۔“

”طارق ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔“ طارق کی بات کو غور سے سنتی مومنہ نے تائید کی۔ ”بچہ جب تک روئے نہ تو ماں بھی یہ سمجھتی ہے کہ اس کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ اس کے رونے تک دودھ نہیں دیتی۔“

”بابا! آئیڈیا اچھا ہے۔ آپ پروٹسٹ کا پروگرام بنائیں۔“ شارق بولا۔

”بیٹا! احتجاج کے لیے لوگ کہاں سے لاؤں گا؟ کیا اکیلا کھڑا ہو جاؤں؟“

”اکیلے کیوں بابا! چھ بندے تو ہمارے اپنے ہی گھر کے ہو جائیں گے۔ آپ، امی، ساحرہ باجی، طارق بھائی، راحمہ اور میں۔“ شارق پُرجوش دکھائی دیا۔

”گھر کی عورتوں کو سڑکوں پر کون لے جاتا ہے بیٹا؟“ غلام محمد معترض ہوا۔

”او ہو بابا! یہ پروٹسٹ ہے، میڈیا والے اور دوسری پبلک نوٹس لے گی کہ یہ صرف الاٹیز نہیں، ان کی فیملیز کی سروائیول کا معاملہ ہے۔ آپ کو پتا ہے ابھی دو تین دن پہلے ہی ایک پرائیویٹ ہاؤسنگ سوسائٹی کے خلاف اس کے الاٹیز نے اپنی فیملیز کے ساتھ سوسائٹی کے ہیڈ آفس کے سامنے مظاہرہ کیا کہ سوسائٹی نے پیسے لے لیے مگر انہیں وقت پر قبضہ نہیں دے رہی ہے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے آگئے، میڈیا والے آگئے۔ اخبار والوں نے اسٹوریز لگائیں، چینلز نے کوریج دی۔ حکومت نے نوٹس لے لیا۔“

”بیٹے! وہ پرائیویٹ اسکیم تھی اس لیے حکومت نے فوری نوٹس لے لیا۔ آباد کار ادارہ تو حکومت کا اپنا ادارہ ہے۔“

”تو کیا ہوا بابا! اصول اور قوانین تو سب کے لیے ہیں۔“

غلام محمد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے نوجوان بیٹے کی رگوں میں دوڑتے لہو کو اس تلخ حقیقت کا کیا ادراک کہ اس معاشرے میں اصول اور قوانین مختلف طبقاتِ انسانی کے لیے مختلف تھے۔ آج کے اخبار ہی میں تو اس نے یہ خبر پڑھی تھی کہ آباد کار ادارے کا ایک دوسرا رہائشی منصوبہ جو اس منصوبے کے پہلو بہ پہلو آگے تھا جس میں اسے پلاٹ الاٹ ہوا تھا، اس کے الاٹیز کو وزیراعلیٰ آئندہ ہفتے اپنے دستِ مبارک سے الاٹمنٹ لیٹرز تقسیم کرکے اس کے ترقیاتی کاموں کا افتتاح کرنے جا رہے تھے۔ یہاں تو الاٹمنٹ لیٹرز کا اجرا ہونے کے بعد بھی لوگ سسک رہے تھے۔

☆☆☆

گروپ کو موثر بنا کر اس میں غلام محمد کی دلچسپی گروپ ایڈمن ہونے کی حد تک رہ گئی۔ ہر نماز کے بعد وہ دو زانو بیٹھ کر رب کائنات کے حضور گڑگڑاتا۔ ”رب کریم! میری اور مجھ جیسے بہت سوں کی مشکل کو آسان فرما دیجیے۔“ اور پھر دعا کے بعد وہ استغفار کرتا کہ دنیاوی جھمیلے نے اس عمر میں دنیاوی فکروں سے بے نیاز ہونے کی توفیق نہ دی تھی۔

بڑے بیٹے طارق نے غلام محمد کو اپنے ایک یونیورسٹی فیلو کے والد سے ملوایا جو ایک اخبار میں نیوز ایڈیٹر تھے۔ غلام محمد نے انہیں سب بتایا سنایا، وہ پہلے ہی اس سے واقف تھے۔ غلام محمد نے ان سے عاجزانہ التماس کی کہ اس معاملے میں الاٹیز کے مسائل و مشکلات کو اپنے اخبار کے اداریے، کالم یا خبر کا موضوع بنائیں۔ انہوں نے وعدہ تو کرلیا مگر اپنے اخبار کی پالیسیوں کی بنا پر وعدہ وفا نہ کرسکے۔ غلام محمد نے انہیں یاددہانی کے لیے فون کیا تو انہوں نے معذرت چاہی کہ عدالت میں زیرِ سماعت معاملات کو ان کا اخبار بالکل نہیں چھیڑتا۔

گھر میں مومنہ دن بہ دن تلخ ہوتی جاتی تھی۔

”ساحرہ اب اپنے بالوں کو مہندی لگانے لگی ہے۔ کہہ رہی تھی، امی! میری کولیگز کہتی ہیں تمہارے بالوں میں اب کوئی کوئی بال سفید بھی دکھنے لگا ہے۔ لڑکی اپنے منہ سے کچھ تھوڑی کہے گی کہ آپ لوگوں نے میری شادی میں دیر کردی۔“

غلام محمد چپ۔

”میں تو کہتی ہوں اب بھی جتنے پیسے ملیں، لیں اور بیچ دیں پلاٹ۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔“

”جہاں اتنا انتظار کیا، تھوڑا اور سہی۔ مافیاز یہی تو چاہتی ہیں کہ ہماری مجبوریوں کا سودا کریں۔ بہت سے بیچارے اونے پونے سودا کرکے بیٹھ گئے۔“

”تو آپ کس انتظار میں ہیں؟“

”میں مافیا کے خلاف ڈٹا ہوا ہوں۔ کیوں کروں میں اپنی زندگی بھر کی محنت کے صلے کا مجبوریاں خریدنے والی مافیا کے ہاتھوں سودا۔“

”تو پھر خود ہاتھ ہی تاپتے رہنا۔ بیٹیوں کی شادی کی عمر نکل جائے گی۔ ساحرہ کی تو کچھ نکل ہی گئی۔ چھوٹی کا ابھی کچھ وقت ہے۔ طارق اور شارق بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ترستے ہیں۔ طارق کی موٹر سائیکل دیکھی ہے..... ناکارہ کھٹارا..... جب تک گھر نہیں لوٹ آتا آیۃ الکرسی پڑھ پڑھ کر پھونکے جاتی ہوں۔ شارق تین سال سے لنڈے کی ایک ہی جیکٹ پہن رہا ہے۔“

”بچے کچھ کرکے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے تو اپنی مرضی کی موٹر سائیکل خریدیں گے، اپنی مرضی کے کپڑے۔ ہمیں کون سا ان سے کچھ لینا ہے۔“

”یونیورسٹی والے ڈگریاں تو تب دیں گے نا جب ان کی فیس ادا کی جائے گی۔“

”ہو جائے گا سب۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔“

”رکھا ہے۔“ مومنہ انہیں کیسی نظروں سے اسے دیکھتی جیسے جتاتی ہو کہ تم پر بھروسا کیا ہوتا تو میں اور میرے بچے روٹی سے بھی گئے ہوتے۔

☆☆☆

غلام محمد گاہے بگاہے اکیلا تو آباد کار ادارے سے تازہ صورتِ حال جاننے کے لیے آتا جاتا ہی رہتا تھا۔ ایک روز اس نے اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ آباد کار ادارے کے سربراہ تک رسائی حاصل کرکے اپنے کرب و اذیت سے آگاہ کرنا چاہا تو انہیں پیچھے سے ہی ٹرخانے کی کوشش ہوئی۔ غلام محمد کے ریٹائرڈ ہم منصب ساتھی عبداللہ جان پٹھان اور جذباتی آدمی تھے۔ ادارے کی لابی میں کھڑے ہوکر خوب چیخے چلائے۔ استقبالیہ پر بیٹھا شخص ان کی چیخ و پکار اور احتجاج پر یوں مسکراتا رہا جیسے وہ لطائف سنا رہے تھے۔ ادارے کا ایک ملازم انہیں پچکار کر اپنے کیبن میں لے گیا۔ پتا چلا موصوف اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ شریف سا آدمی تھا۔ اس نے غلام محمد اور دونوں ساتھیوں کو عزت سے بٹھایا، چائے پانی کا پوچھا اور ان کی بات سنی پھر معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ ”جناب! ہم خود اس صورتِ حال سے پریشان ہیں۔ ماتحت عدالت بڑی عدالت کے خلاف نہیں جاسکتیں گرا ہوا ہے اور یہ صورتِ حال الاٹیز ہی نہیں، ادارے کے لیے بھی پریشان کن ہے۔ ہم نے ماتحت عدالت کے خلاف بڑی عدالت میں اپیل دائر کر رکھی ہے۔ ہم تو اپنی طرف سے کام مکمل کیے بیٹھے ہیں..... عدالت سے فیصلے کا انتظار ہے بس۔“

”جو گزشتہ کئی ماہ سے لٹکا ہوا ہے۔“ غلام محمد کے ایک ساتھی نے تیز لہجے میں کہا۔

”آپ درست کہتے ہیں مگر ہم بھی کیا کریں۔“

”جس وکیل کو آپ نے ہم الاٹیز سے جمع کردہ بھاری رقم سے حاصل منافع پر بگڑی کیس دیا ہے، اس سے کہیں جلد سماعت کی درخواست کرے۔“ غلام محمد بولا۔

جواب خاموشی کی صورت ملا۔

غلام محمد اور اس کے ساتھی بھی ادارے کے افسر کی خاموشی پر کچھ دیر یوں چپ بیٹھے رہے جیسے کسی میت کا پرسہ دینے آئے ہوں۔

”اللہ پر بھروسا رکھیں۔ جو پلاٹ آپ لوگوں کو الاٹ ہوئے ہیں، وہ آپ ہی کو دیے جائیں گے۔ بس ذرا دیر ہے۔“

”اسے دیر نہیں، اندھیر کہا جاتا ہے۔“ غلام محمد کے ریٹائرڈ ہم منصب ساتھی نے تنک کر کہا۔

”مر گئے ہیں ہم انتظار کرتے کرتے۔“ دوسرے ساتھی نے دل گرفتگی ظاہر کی۔

”جناب! اس پلاٹ کے انتظار میں میری بچی کی شادی کی عمر نکل گئی۔ میرے بیٹوں کی تعلیم قرض میں چل رہی ہے۔ دوسری قسط ادا کرنے کے لیے قرض لیے بیٹھا ہوں۔ میں اور میری فیملی ہم دربدر ہیں۔ صرف اس پلاٹ کی وجہ سے پیدا شدہ گھریلو مسائل نے مجھے اپنے ہی بال بچوں کے سامنے مجرم بنا دیا ہے۔“ غلام محمد کی آواز بھرانے لگی۔ ”اس پلاٹ کے چکر میں پڑنے سے تو بہتر تھا کہ میں ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم سے اپنی اس وقت کی ضرورتیں پوری کرنے کو ترجیح دیتا۔ بیوی اور بچوں سے شرمندہ تو نہ ہوتا۔“ مرد ہونے کے باوجود غلام محمد رونے لگا۔ اسے روتا دیکھ کر دونوں ساتھی دل گرفتہ اور ادارے کا افسر شرمسار دکھائی دینے لگے۔

”میں آپ کی تکلیف سمجھ سکتا ہوں۔“ افسر بولا۔

”نہیں سمجھتے، نہیں سمجھتے آپ لوگ۔“ غلام محمد پھٹ پڑا۔ ”سمجھتے ہوتے تو میں یہاں آپ کے سامنے بیٹھا رو نہ رہا ہوتا۔ کہاں ہے آپ کے دفتر کا سربراہ..... نعوذ باللہ، خدا بنا بیٹھا ہے۔ ہم غرض مند اس تک پہنچ نہیں سکتے۔ آپ کا چھوٹا عملہ ہمیں باہر ہی سے ٹرخا دیتا ہے۔ پوچھیں اس متکبر آدمی سے کہ اپنی غرض کے لیے وہ چوبیس گھنٹوں میں کتنی مرتبہ رب کا محتاج بنتا ہے، اس کا در کھٹکھٹاتا ہے اور براہِ راست اس سے رابطہ کرتا ہے؟ زمین پر بیٹھے ان چھوٹے خداؤں نے غرض مندوں کی غرض سننے کے بجائے اپنے

دروازے بند کیوں کر رکھے ہیں۔ حساب دینا ہوگا انہیں
اپنے کیے کا۔“
ادارے کے افسر نے اپنا سر جھکا لیا۔
”اچھے صاحب!“ غلام محمد نے کرسی سے اٹھتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”یہ بے رحم اور سفاک لوگ ہیں۔ انہیں ہماری التجا سے کوئی غرض نہیں۔ انہیں تب پتا چلے گا جب یہ اپنی قبروں میں جا لیٹیں گے۔“
”جی ہاں۔“ غلام محمد کے ساتھ آنے والے ریٹائرڈ ہم منصب نے تائید کی۔ ”ان کا انجام بہت برا ہوگا۔ جہنم میں جائیں گے یہ لوگ۔ ہم غریبوں کی ساری زندگی کی جمع پونجی ہڑپ کرتے ہیں یہ خبیث۔“
”ایک منٹ! ایک منٹ صاحب! گالی مت دیجیے۔“ ادارے کے افسر نے انگلی کھڑی کرتے ہوئے کہا۔
”یہ گالی نہیں، ان سب حرام خوروں کے لیے ایک معروف خطاب ہے جو کرسی پر بیٹھ کر اپنے فرائض منصبی کا حق ادا نہیں کرتے۔“ دوران ملازمت ثانوی جماعتوں کو برسہا برس تک اردو کی تدریس کا فریضہ انجام دے کر ریٹائر ہوئے ٹیچر نے حق زباں دانی ادا کیا۔
”تمام ذمے داران کو ہمارے کرب و اذیت کا حساب دینا ہوگا۔“ غلام محمد نے بھی اپنی انگلی کھڑی کر کے کہا اور تینوں ساتھی افسر کے کیبن سے باہر نکل آئے۔
☆☆☆
غلام محمد نے آباد کار ادارے کی سست روی اور عدم دلچسپی کے احتساب کے لیے متعلقہ ادارے کو ایک درخواست دائر دی۔ ادارے کی فوری توجہ، عمدہ رویے اور جلد کارروائی سے اس کا دل بہت مطمئن اور خوش ہوا۔ پرانی مثل ہے کہ گڑ نہ دے، گڑ جیسی بات تو کہے... مذکورہ ادارے نے اس کی شکایت آباد کار ادارے تک پہنچائی اور جواب طلب کیا۔ مقررہ تاریخ پر اسے بطور شکایت کنندہ اور اس کی شکایت کا جواب دینے اور ازالہ کرنے کے لیے آباد کار ادارے کے نمائندے کو اپنے دفتر طلب کر لیا۔ غلام محمد مقررہ تاریخ پر وقت سے پہلے ہی وہاں جا پہنچا۔ ادارے کے ایک افسر کے روبرو غلام محمد اور آباد کار ادارے کا نمائندہ دونوں کی حاضری ہوئی۔ آباد کار ادارے کے نمائندے نے وہی جواب دیا جس کی توقع تھی کہ معاملہ عدالت میں ہے۔ ہم خود انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔
”جناب! یہ تو میری شکایت کا وہ سادہ سا جواب ہے جو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔“ غلام محمد نے شنوائی کرنے والے افسر سے کہا۔ ”میری عرض یہ ہے کہ عدالت میں معاملے کا مدلل اور سست کیوں ہے۔ یہ...“ غلام محمد نے اپنی انگلی آباد کار ادارے کے نمائندے کی جانب کی۔ ”اس وکیل سے کہتے انہوں نے یقیناً بھاری فیس ادا کی ہوگی، یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ عدالت سے جلد کارروائی کی استدعا کرے۔ پانچ سال قبل سماعت ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے آج تک کوئی شنوائی نہیں۔ مقدمے کی پیروی کرنے والا وکیل عدالت سے جلد تاریخ کی درخواست کر سکتا ہے۔“
روبرو بیٹھے افسر نے آباد کار ادارے کے نمائندے کو جواب طلب نظروں سے دیکھا۔
”سر! آپ کو پتا ہے عدالت آج کل کس قدر کے مقدمات میں پھنسی ہوئی ہے۔“
افسر موصوف نے بے چارگی سے غلام محمد کو دیکھا اور کہا۔ ”دعا کیجیے۔“
”دعا!“ غلام محمد نے زخمی لہجے میں کہا۔ ”کس کے لیے؟“
”اپنے لیے... ہم سب کے لیے... ساری قوم کے لیے... ہم سب بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں۔“
”زبان گھسنا اگر صرف محاورہ نہیں تو یقین کیجیے جناب... زبان گھس گئی ہے میری دعا کرتے کرتے۔ مگر صرف اپنے لیے کیونکہ میں اپنی بیوی اور بچوں کا مجرم بن گیا ہوں۔ زندگی گزر گئی، میں انہیں آج تک اپنے گھر کی چھت نہیں دے سکا۔ دے سکتا تھا مگر ان کے ادارے نے مجھے انتظار کی صلیب پر لٹکا دیا۔“ غلام محمد کی انگلی دوبارہ آباد کار ادارے کے نمائندے کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بے بسی سے غلام محمد کو دیکھنے لگا۔
شنوائی کرنے والے افسر نے غلام محمد سے کہا۔ ”آپ کو عدالت کے فیصلے کا انتظار کرنا ہوگا۔“
غلام محمد کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی۔
”سر!“ آباد کار ادارے کے نمائندے نے شنوائی کرنے والے افسر سے کہا۔ ”ہم تو اب تک سیکڑوں پلاٹ کے الاٹیز کو قبضہ بھی دے چکے ہوتے اگر...“
”چھوڑیے صاحب!“ غلام محمد نے غصے سے نمائندے کی قطع کلامی کی۔ ”جہاں چاہ وہاں راہ... معذرت کے ساتھ... اگر مگر وہ کرتے ہیں جنہیں بہانے بنانا ہوتے ہیں۔ آپ کے ادارے کی کارکردگی کا سابقہ ریکارڈ بھی یہ ہے کہ بیس تیس سال میں جا کر ایک پروجیکٹ مکمل کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ پراپرٹی کی قیمت بڑھتی

ہے۔ آپ کا ادارہ تو الاٹیز کو ملنے والے پلاٹ کی قیمت بڑھا دے گا۔ ہم الاٹیز نے جو رقم جمع کی، وقت کے ساتھ اس کی قدر میں اضافہ اور اس رقم پر ملنے والے منافع کا تعین کون کرے گا؟“
”بجا ہے، اہم نکتہ۔“ شنوائی کرنے والے افسر نے غلام محمد کی بات کو تائید دیتے ہوئے آباد کار ادارے کے نمائندے کو دیکھا۔
”سر! میں تو لیگل سیکشن کا بندہ ہوں۔ یہ اکاؤنٹس کا معاملہ ہے۔“
”آپ کی کمپلینٹ کا جواب ہم آپ کو تحریری طور پر بھجوا دیں گے غلام محمد صاحب!“ شنوائی کرنے والے افسر نے کہا۔
”جی... مجھے مل گیا ہے جواب۔“ غلام محمد کے لہجے میں تلخی تھی۔
”شکریہ!“ افسر نے کہا۔
”مہربانی۔“ غلام محمد کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔
آباد کار ادارے کے نمائندے نے غلام محمد کو قدرے خفت سے دیکھا۔
غلام محمد شکستہ قدموں سے کمرے سے باہر نکل آیا۔
☆☆☆
غرض مند کی غرض اسے در در پھراتی ہے۔ غلام محمد بھی غرض مند تھا۔ اس نے میڈیا، عوامی نمائندوں، حکام بالا کو خطوط لکھنا شروع کر دیے۔ اخبارات کے ڈاک کالم میں خطوط لکھ کر ان سے درخواست کی کہ اس مسئلے کو جو صرف اسی کا نہیں، اس جیسے ہزاروں افراد کا مشترکہ مسئلہ تھا، اپنی نوک قلم پر لائیں اور دعائیں پائیں مگر ان کے نزدیک یہ مسئلہ لائق التفات نہ ٹھہرا۔ سب چپ سادھ گئے۔ غلام محمد نے خود اخبارات و جرائد کو پے در پے مراسلات ارسال کرنا شروع کیے۔ سب مصلحت کی نوکری کی نذر ہو گئے۔ غلام محمد کو نہایت مایوسی ہوئی۔
دن گزرتے چلے جا رہے تھے اور مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ غلام محمد صبح شام کسی اچھی خبر کا انتظار کرتا مگر وہ منتظر ہی رہتا۔ گھر کے ماحول پر موسم سرما کی اداس شام کی طرح گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ کیسی تھی کہ کسی صورت جڑنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔
ساحرہ کو دیکھ کر غلام محمد کے دل میں ہوک اٹھتی۔ پلاٹ کی چاہ میں قسطیں بھرنے کے بجائے ساحرہ کے ہاتھ پیلے کر دیتا تو آج بیٹی کے بچے گود میں کھلا رہا ہوتا۔ باقی کام بھی نمٹ جاتا۔ ساحرہ کے لیے کنوارے رشتوں پر تو جیسے قفل پڑ گیا تھا۔ جو آتا طلاق یافتہ، رنڈوا یا جو یا لیٹ میرج۔ اب تو ساحرہ کے لیے رشتے آتے بھی تھے مگر اسے نمٹانے کو وسائل نہ تھے۔ بیٹی کو خالی ہاتھ کیسے رخصت کرتا۔ مہنگائی تھی کہ آسمان پر۔ کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ ڈیڑھ دو ہزار میں گھر کے لیے مہینے بھر کی خشک اجناس آ جاتیں۔ اب یہ حال کہ دو چار چھوٹی چھوٹی چیزیں لیں اور بل تین چار ہزار کا۔ موسمہ کہتی۔ ”خرچ کرنے والا چور بن جاتا ہے۔“ ہر ماہ سوچتی کہ کچھ تو بچت کرے گی مگر مہینہ ختم ہونے سے پہلے غلام محمد کی پنشن ختم ہو جاتی۔ ساحرہ کی تنخواہ سے سہارا لگتا۔ بیٹی کی کمائی گھر میں خرچ کرتے بھی موسمہ شرم سے پانی پانی ہوتی رہتی مگر کیا کرتی، مجبوری تھی۔ غلام محمد دل ہی دل میں اللہ کے سامنے گڑگڑائے جاتا۔ ”رب کریم! مشکل آسان فرما دیجیے۔“ طارق کا آخری سمسٹر تھا مگر یونیورسٹی کے واجبات ادا کیے بغیر ڈگری کا حصول ناممکن تھا۔ یہاں تک کہ طارق یونیورسٹی کو تھوڑی بہت ادائیگی بھی اساتذہ تو کبھی اکاؤنٹس افسران کی منت سماجت کر کے پہنچا تھا۔ اگلا سمسٹر جو آخری بھی تھا شروع ہو چکا تھا۔ واجبات ابھی تک ادا نہ ہو سکے تھے۔ ہوتے بھی کہاں سے۔
کورس کمپلیشن نہ ہوئی تھی تاہم طارق کلاسیں اٹینڈ کر رہا تھا۔ بار بار غلام محمد سے پوچھتا۔ ”ابا! پلاٹ کا فیصلہ ہوا تو میری فیس کہاں سے دیں گے؟“
غلام محمد اسے تسلی دیتا۔ ”اللہ پر بھروسا رکھو بیٹے! ہو جائے گا فیصلہ!“
غلام محمد کا پلاٹ پر گھر بنانے کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا۔ ادھر ادھر سے خبریں ملی تھیں کہ پلاٹ اگر ملا بھی تو پرانی قیمت پر نہیں ملے گا۔ ڈالر کی اڑان اڑ چکی تھی۔ مہنگائی آسمان کو چھو چکی تھی۔ ہر شے کی قیمت بڑھ گئی تھی۔ تعمیراتی اخراجات ہوشربا حد تک پہنچ چکے تھے۔ ہزاروں کی زمین اب لاکھوں میں اور لاکھوں کی کروڑوں میں جا چکی تھی۔ آباد کار ادارہ الاٹیز کو بڑھی ہوئی قیمت میں زمین دینے کا پروگرام بنائے بیٹھا تھا۔ غلام محمد سوچتا کہ اب اگر فیصلہ آباد کار ادارے کے حق میں آ جاتا ہے اور ادارہ الاٹیز سے بڑھی ہوئی قیمت طلب کرتا ہے تو وہ کہاں سے دے سکے گا۔ اس کے پاس اب ایک ہی راستہ بچتا تھا کہ پلاٹ ملے اور ٹرانسفر ہو جائے تو وہ پہلی فرصت میں اسے کسی انویسٹر یا کسی پراپرٹی ڈیلر کو فروخت کرے اور اپنی ضرورتیں پوری کرے۔
ہر زندہ انسان کی طرح غلام محمد کی زندگی بھی

ضرورتوں سے بے نیاز تو کبھی بھی نہ رہی تھی مگر وقت کے ساتھ ضرورتیں مسائل بن گئی تھیں۔ ایک مسئلہ حل ہوتا تو دوسرا سر پر آن کھڑا ہوتا مگر اب تو ضرورتیں، مسائل کے بجائے بلاؤں کا روپ دھار گئی تھیں۔ غلام محمد اپنے قریبی دوستوں سے کہتا۔ ''میں بلاؤں سے لڑنے کی کوشش نہیں کرتا، بچنے کی کوشش کرتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں نے ان سے لڑنے کی کوشش کی تو سب ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوں گی اور میں ان سے بچ بھی نہیں پاؤں گا۔''

غلام محمد کو سب سے زیادہ کوفت اور شرمندگی مومنہ کی طرف سے ہوتی۔ کچھ دنوں سے وہ دبے دبے بار بار یہ جتاتی کہ پلاٹ کے چکر میں اس نے مناسب وقت پر شادی نہ کرکے اپنی ذات سے زیادتی کی تھی جس کا کوئی ازالہ ممکن نہ تھا... نہ وہ اس سے یہ کہتی کہ ریٹائرمنٹ کے بعد چھوٹا سا ٹھکانا بنا لیتے تو ہر ماہ کرایہ مکان کی لعنت سے جان چھوٹی ہوتی... نہ وہ اسے طارق اور شارق کی فیسیں ادا کرنے کو کہتی... نہ کوئی گلہ کرتی، نہ شکوہ۔ بہت ہوتا تو ایک لمبی، گہری اور ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتی۔ غلام محمد سے اس کا یہ گلہ شکوہ جیسے اس کی آنکھوں میں ٹھہر کر اداسی اور مایوسی بن گیا تھا۔ غلام محمد اس سے نظریں چرائے رکھتا۔

☆☆☆

عدالت میں آباد کار ادارے کی اپیل پر سماعت ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے اس کے بعد کوئی شنوائی ہی نہ تھی۔ زمین جلد یا بدیر غلام محمد والا معاملہ تھا۔ غلام محمد اور اس جیسے ہزاروں الاٹیز اور ان کے اہل خانہ کی بے چینی، کرب اور انتظار کی کسی کو فکر نہ تھی۔

غلام محمد نے قاضی القضاۃ کے نام ایک درد بھری عرض لکھی اور عدالت پہنچ گیا۔ مروجہ کارروائی سے گزر کر اندر رسائی ہوئی۔ معلومات فراہم کرنے والے عدالتی اہلکار نے غلام محمد سے اس کی آمد کا سبب پوچھا۔

''جناب! میں آباد کار ادارے کا الاٹی ہوں۔ ادارے نے ماتحت عدالت کے فیصلے کے خلاف یہاں اپیل کر رکھی ہے۔ کافی عرصے سے اپیل کی سماعت نہیں ہوئی۔ میں نے چیف صاحب کے نام ایک درخواست پیش کرنا ہے، اس اپیل کی جلد سماعت کے لیے۔'' غلام محمد نے فائل میں لگی درخواست کھڑکی سے مذکورہ اہلکار کے سامنے رکھ دی۔

''آپ اس اپیل میں پارٹی ہیں؟'' اس شخص نے پوچھا۔

''ظاہر ہے... ہوں گا... کیونکہ الاٹی ہوں۔''

''دیکھیے، ہر الاٹی تو پارٹی نہیں ہوگا۔ پارٹی وہی ہوگا جس کا نام اپیل کرنے والوں کی لسٹ میں شامل ہوگا۔''

غلام محمد چپ رہا۔

''آپ پارٹی ہوں گے تو جلد سماعت کی درخواست کر سکیں گے۔''

''تو پھر؟''

''لابی میں وکلا موجود ہیں۔ ان سے مشورہ کر لیں۔''

''میری یہ درخواست آپ چیف صاحب کے آفس نہیں بھجوا سکتے؟''

''جی نہیں۔'' کورا جواب ملا۔ ''آپ ہٹیے۔ دوسرے لوگ اپنی باری کے منتظر ہیں۔''

غلام محمد فائل اٹھا کر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ سخت مایوسی کے عالم میں سامنے پوسٹ آفس دکھائی دیا۔ کھڑکی پر پہنچا اور اہلکار سے پوچھا، چیف صاحب کو درخواست ارسال ہو جائے گی؟ جواب اثبات میں ملا۔ غلام محمد نے وہیں کھڑے کھڑے لفافہ خریدا اور قاضی القضاۃ کے نام درخواست پوسٹ کر دی۔ خوش خوش گھر جا کر مومنہ کو بتایا کہ آج چیف صاحب کو درخواست داغ آیا ہوں۔ اب ضرور کچھ ہوگا... مگر کچھ نہ ہوا... وہی خاموشی... وہی انتظار... وہی کرب!

☆☆☆

ایک روز غلام محمد نے ایک کتب فروش سے ایک سفید ڈرائنگ شیٹ اور سیاہ روشنائی والا موٹا مارکر خریدا اور دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ڈرائنگ شیٹ پر مارکر سے بڑے بڑے جلی خط میں پہلے اس منصوبے کی سرخی جمائی جس میں اسے پلاٹ کی الاٹمنٹ ہوئی تھی اور اس کے نیچے لکھا۔ ''کیا فیصلہ ہمارے قبروں میں جا سونے کے بعد سنایا جائے گا؟ احتجاج! احتجاج! احتجاج!'' فٹ پاتھ پر آتے جاتے لوگ غلام محمد کو چارٹ بناتے دیکھتے رہے، گزرتے رہے اور زیر لب مسکراتے رہے۔

غلام محمد نے چارٹ لپیٹا، فٹ پاتھ سے اٹھا اور بس میں جا بیٹھا... آخری اسٹاپ پر اترا اور پیدل چلتا ہوا ملک کی سب سے بڑی عدالت کی جانب روانہ ہو گیا۔ چارٹ لپٹا ہوا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ عدالت کی پرشکوہ عمارت کے سامنے دونوں ہاتھوں سے چارٹ پکڑ کر کھڑا ہو جائے گا اور اپنا احتجاج رقم کرائے گا۔ ابھی منزل سے کچھ ہی دور تھا کہ اچانک نہ جانے کہاں سے ایک کار فراٹے بھرتی آئی اور اس کے عقب سے اسے ٹکر مارتی گزر گئی۔

آنکھ کھلی تو وہ اسپتال میں تھا مگر خود وہ سمجھ نہ پایا کہ کہاں تھا۔

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے غنودگی کی کیفیت میں پوچھا۔

''اسپتال میں۔'' مومنہ جو اس کے سرہانے موجود تھی، بولی۔

''کیوں؟''

''ایکسیڈنٹ جو ہو گیا تھا تمہارا۔ کیا ضرورت تھی تمہیں یہ سب کرنے کی؟''

''کیا، کیا میں نے؟''

''بابا! آپ اکیلے ہی احتجاج کرنے چل پڑے۔ دو چار لوگوں کو تو ساتھ ملایا ہوتا... اور کوئی نہیں تو مجھے اور شارق کو ہی ساتھ لے لیتے۔'' طارق جو مومنہ کے ساتھ اس کے سرہانے کھڑا تھا، اس کے سر پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''انتظار کرتے کرتے تھک گیا ہوں بیٹا!'' غلام محمد نقاہت بھرے لہجے میں بولا۔

''دفع کریں انتظار کو... اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہو جاتا تو؟'' مومنہ اپنی چادر کے کنارے سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

غلام محمد نے آنکھیں موند لیں۔ اس کی پسلیاں مضروب ہوئی تھیں اور ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ ٹکر مارنے والی کار کس کی تھی، کہاں سے آئی تھی، کہاں چلی گئی تھی؟ کچھ پتا نہ چل سکا۔ امیروں کی گاڑیاں غریبوں کو ٹکر مار کر اکثر یونہی نکل جاتی ہیں۔ غلام محمد کی جیب میں موبائل نہ ہوتا تو اطلاع دینے والے اس کے گھر والوں کو اس حادثے کی اطلاع بھی نہ دے پاتے اور جائے حادثہ پر وہ چارٹ نہ پڑا ملا ہوتا تو کسی کو یہ بھی پتا نہ چلتا کہ وہ علاقہ شاہاں میں گیا کیوں تھا؟

بڑھاپے کی چوٹ تادیر تکلیف دیتی ہے۔ زخم بھی جلد نہیں بھرتے۔ غلام محمد بیس گریڈ کا ریٹائرڈ پنشنر تھا۔ سرکاری اسپتال والوں کو اسے قواعد کے مطابق آفیسرز وارڈ میں رکھنا پڑا تھا لیکن ایک اور علیل افسر کو کمرا دینے کے لیے اتنی بڑی سفارش آگئی کہ غلام محمد کی حالت تسلی بخش ہونے سے پہلے ہی اسے تیسرے دن اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔

بڑھاپا... کمزوری... شدید سردی کا موسم... اسپتال سے گھر منتقل ہونے کے بعد غلام محمد کی طبیعت سنبھلی نہیں۔ مومنہ اسے جلد صحت یابی اور طاقت کے لیے یخنی بنا کر پلاتی۔ کبھی دیسی ٹوٹکے آزماتی مگر وہ قوت نہ پکڑتا، نڈھال ہوئے جاتا۔ سینے کی جکڑن بڑھتی ہی چلی گئی۔ دوبارہ اسپتال لے جانا پڑا۔ ڈاکٹروں نے نمونیا تشخیص کیا اور داخل کر لیا۔ مومنہ اور طارق اس کی باری باری تیمارداری کو اسپتال میں رکے رہے۔ کبھی مومنہ اس کے پاس ہوتی، کبھی طارق اسے کچھ دیر کو نیچے اسپتال کی لابی میں پڑی کسی بینچ پر کمر سیدھی کرنے کو بھیج دیتا اور خود باپ کے سرہانے ٹھہرتا۔ مومنہ کو نیچے جا کر چین نہ آتا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اوپر آجاتی اور طارق کو نیچے بھیج دیتی۔ مریض کے پاس ایک ہی تیماردار کو ٹھہرنے کی اجازت تھی۔

غلام محمد چھ سات دن اسپتال میں داخل رہا پھر

...... مطمئن تو تھے۔ چکی میں پڑنے سے پہلے ہی اچھے تھے..... خوش تو تھے۔"

"ٹھیک کہتی ہو..... ہم پہلے ہی اچھے تھے۔" غلام محمد نے آنکھیں موند لیں۔ مومنہ کو اس کی بند آنکھوں کے کنارے بھیگتے دکھائی دیے۔

اس رات غلام محمد سویا تو پھر جاگ نہیں سکا۔ رات کو نیند میں نہ جانے کس لمحے اس نے تمام فکروں سے جان چھڑا کر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی تھی۔

غلام محمد اپنی مرحومہ ماں کی خواہش پوری کیے بغیر ہی اپنے اہل و عیال کو بے گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

کاروبار حیات کسی کے جانے سے نہیں رکتا۔ غلام محمد کے مرنے کے بعد بھی ایسا ہی ہوا۔ بچوں والی عورت بیوہ ہوجائے تو اپنے بچوں کی خاطر اسے جینا پڑتا ہے اور غم بھلانے پر مجبور ہوتی ہے۔ مومنہ کو بھی ایسا کرنا پڑا۔ غلام محمد کے چاروں بچے بھی کچھ دن رو پیٹ کر دوبارہ زندگی کے تقاضے پورے کرنے میں لگ گئے۔ پرسہ دینے والوں کی چند دن آمدورفت رہی پھر وہ بھی غلام محمد کے گھر کا رستہ بھول گئے۔ یہی تو کارخانہ حیات ہے۔ مرنے والے کے ساتھ کون مرتا ہے۔ موت برحق ہے اور برو قت آتی ہے۔ غلام محمد کی زندگی بھی اتنی ہی تھی لیکن..... شاید غلام محمد اس دنیا سے اتنا دل گرفتہ اور مایوس نہ گیا ہوتا اگر ذمے دار عہدوں پر بیٹھے منصب داروں نے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں تساہل اور تاخیر سے کام نہ لیا ہوتا۔ تو یوں وہ بھی جن کے صاحبان اختیار عوام کے مسائل پر نظر رکھتے ہیں۔ کتنی چھوٹی خواہشیں تھیں غلام محمد کی۔ بیوی بچوں کے لیے گھر بن جائے تاکہ اس کے مرنے کے بعد وہ بے سائبان نہ ہوں..... بیٹیاں عزت سے اپنے گھر کی ہوجائیں..... بیٹے فارغ التحصیل ہوکر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لائق ہوجائیں۔ مگر یہ بھی ان کا نصیب..... اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں عدم دلچسپی اور تاخیر کرتے اور غلام محمد جیسے بے بال و پر عام آدمی کے مسائل سے چشم پوشی اختیار کرکے اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں اور ضرورتوں کو پامال کرتے بے حس اور بے رحم صاحبان اقتدار و اختیار کو تو خبر بھی نہ ہوئی ہوگی کہ غلام محمد نام کا ایک سادہ اور ایماندار آدمی جس نے زندگی کا بڑا حصہ قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں گزارا تھا، ایک قطعہ زمین لینے کے انتظار میں مرگیا تھا..... ان بے رحموں کو خبر بھی ہو جاتی تو کیا۔ ان کے سینوں میں دل صرف اپنے لیے دھڑکتے ہیں۔ غلام محمد جیسے لوگوں کے لیے جن سے ان کی اپنی کوئی غرض نہ لگی ہو ان کے سینوں میں دل نہیں، پتھر دھرے ہیں۔ جن اداروں کی آپس کی چپقلشوں اور تاخیری حربوں نے ایک غلام محمد اور اس کے بال بچوں ہی نہیں، سیکڑوں ہزاروں گھرانوں کو مسلسل کئی سال بیم و رجا میں مبتلا رکھا، انہوں نے بھی یہ جاننے کی زحمت نہیں کی کہ ان کی چشم پوشی نے جن لوگوں کو موت سے پہلے ہی بیچ کی مار دے رکھا، غلام محمد کا اس فہرست میں کون سا نمبر تھا۔

کاروبار حیات جاری و ساری ہے۔ اب اگر فیصلہ آجائے، انتظار ختم ہو اور پلاٹ مل بھی جائے تو کیا..... غلام محمد تو اس فانی دنیا کی مادی ضرورتوں سے دامن چھڑا کر اپنی تشنہ آرزوؤں سمیت زندگی کو خیرباد کہہ کر اپنے گھروالوں کے لیے ایک دکھتی یاد بن گیا ہے۔ پلاٹ ملے یا نہ ملے، بچوں کے لیے گھر بنے یا نہ بنے، غلام محمد کو اب اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی پنشن، فیملی پنشن میں تبدیل ہوگئی ہے۔ بھلا آدمی تھا۔ مرنے کے بعد بھی بیوہ اور بچوں کے لیے کچھ آسرا تو چھوڑ گیا..... حامد نے باپ کی موت کے بعد جاب پا کر دکھائی ہے..... طارق کو جسے یونیورسٹی کے واجبات ادا نہ کیے جانے کے باعث آخری سمسٹر میں رجسٹریشن نہ ہونے سے پراجیکٹ جمع کرانے سے روک دیا گیا تھا، حامد امید دلاتی ہے کہ اب اس کا عرصہ ملازمت اتنا ہو چکا ہے کہ اسے قرض سے لون مل سکتا ہے۔ اس نے لون کے لیے درخواست جمع کرادی ہے۔ نیا سمسٹر شروع ہونے پر وہ طارق کو اس کی فیس ادا کردینے کی یقین دہانی کراتی ہے۔ مومنہ دکھ میں ہے مگر چپ ہے..... شارق جس نے باپ کی موت پر بڑے بھائی سے زیادہ صبر اور استقامت کا مظاہرہ کیا، بھائی بہن کا دل بہلانے کی کوشش کرتا ہے..... راحمہ پہلے بھی گھر بھر کی لاڈلی تھی، اب بھی ایسا ہی ہے.....

دو تین دن پہلے شارق باپ کی قبر کے سرہانے ایک مرمریں کتبہ لگا آیا ہے..... سنگ مرمر کی دودھیا سل پر زیر زمین قبر میں سوئے غلام محمد کا نام درج ہے، نہ تاریخ وفات، نہ کوئی دعا، نہ ہی کوئی حزنیہ کلام..... اس کتبے پر سیاہ روغنی روشنائی میں Justice Delayed Is Justice Denied کندہ ہے۔

انصاف میں تاخیر انصاف سے انکار!

قبرستان آتے جاتے لوگ غلام محمد کی قبر پر لگے کتبے پر کندہ اس قول کو پڑھ کر کیا جانیں کہ یہ دھواں کہاں سے اٹھا ہے!

⌘⌘⌘